ہند-پاک ڈائری

مولانا وحید الدّین خاں

ہند-پاک ڈائری

Hind-Pak Diary
By Maulana Wahiduddin Khan

First published 2006
This book does not carry a copyright

Goodword Books Pvt. Ltd.
P.O. Box 3244, Nizamuddin P.O., New Delhi-110 013
e-mail: info@goodwordbooks.com

www.goodwordbooks.com

Printed in India

فہرست

دیباچہ	7
ہند-پاک ڈائری	17
انڈیا اور پاکستان	111
تعمیر ہند	147
تاریخ کو انتظار ہے	148
ہندو-مسلم اتحاد	152
تباہ کن ذہنیت	160
سفر بے منزل	164
تعمیر ہند	170
پیغام عمل	180
ایک سیاسی جائزہ	186
ہندتو: حقیقت یا افسانہ	190
مستحکم سماجی نظام	196
کشمیر گائڈ	201
کشمیر گائڈ	202
اسلام کے نام پر غیر اسلام	247

دیباچہ

’’ہند۔پاک ڈائری‘‘ برصغیر ہند کی تقریباً سو سالہ سیاسی تاریخ کا ایک جائزہ ہے۔ اس تاریخ کے بیش تر حصہ کو میں نے براہ راست دیکھا اور اس کے کچھ حصہ کو قریبی واسطہ کے ذریعہ جانا۔ برصغیر ہند کے یہ سو سال جس میں پوری بیسویں صدی شامل ہے، اس جغرافی خطے کے لئے غیر معمولی سرگرمیوں کے سال تھے۔ مگر بیسویں صدی کے خاتمہ پر نتیجہ کے اعتبار سے اس کا جائزہ لیا جائے تو تقریباً پوری صدی بے نتیجہ ہنگاموں کی نذر ہوگئی۔ ان سرگرمیوں کے دوران بڑی بڑی شخصیتیں تو بنیں مگر قوم اور ملّت کی مثبت معنوں میں کوئی بڑی تعمیر نہ ہوسکی۔

بیسویں صدی کے آغاز میں برصغیر ہند میں دھواں دھار خلافت تحریک اٹھی۔ اس کے پیچھے بڑے بڑے مسلم لیڈروں کے نام ہیں۔ مثلاً محمد علی، شوکت علی، ابوالکلام آزاد، وغیرہ۔ پہلی عالمی جنگ اور دوسری عالمی جنگ کے درمیان ایک زمانہ ایسا گزرا ہے جب کہ یہ معلوم ہوتا تھا گویا تحریک خلافت نے پورے برصغیر ہند کو ہلا دیا ہے۔ مگر نتیجہ بالکل صفر رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ پوری تحریک صرف جذباتیت کے زور پر کھڑی کی گئی۔ حتیٰ کہ ان پرجوش لیڈروں کو یہ خبر بھی نہ تھی کہ جس خلافت تحریک کو وہ آتشیں تحریروں اور شعلہ بار تقریروں کے ذریعہ ہندستان میں چلا رہے ہیں وہ خود اپنے مرکز ترکی میں دس سال پہلے ختم ہوچکی ہے۔ ایک طرف ترک لیڈروں کا سیکولرزم اور دوسری طرف عربوں میں پھیلتا ہوا نیشنل ازم، عثمانی خلافت کا آخری حد تک خاتمہ کرچکا ہے۔ ایسی حالت میں یہ تحریک ایک مردہ جسم کو زندہ کرنے کے ہم معنیٰ تھی، جس کا ناکام ہونا اہل بصیرت کے لئے پیشگی طور پر ایک معلوم واقعہ تھا۔

یہ بات بذات خود حیرت انگیز حد تک ناقابل فہم ہے کہ جس عثمانی خلافت کا مرکز ترکی تھا اور جو عرب سرزمین کی بنیاد پر قائم تھی، اس کے لئے برصغیر ہند میں تحریک کیوں چلائی گئی۔ جس کا کوئی بھی تعلق اس خلافت سے نہ سیاسی اعتبار سے تھا اور نہ جغرافی اعتبار سے۔ تاہم یہ ناقابل فہم واقعہ پیش آیا

اور قوم نے اس تحریک کے اوپر جان و مال کی اتنی زیادہ قربانیاں دیں کہ اگر ان قربانیوں کو ہندستانی مسلمانوں کی تعمیر و ترقی کے لئے استعمال کیا جاتا تو یقینی ہے کہ اس علاقہ میں مسلمانوں کا ایک نیا قومی تاج محل اور ایک نیا ملی قطب مینار کھڑا ہو جاتا۔

اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ ان انتہائی مشہور لیڈروں کو بظاہر اس حقیقت کی مطلق خبر نہ تھی کہ ''خلافت عثمانی'' جیسا ایک بین اقوامی سیاسی ادارہ تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ قائم نہیں ہوا کرتا۔ ایسے کسی ادارہ کا قیام ہمیشہ تاریخی اسباب سے ہوتا ہے۔ تاریخ کی مثال گویا ایک بینک کی ہے۔ اس بینک میں جس قوم کا سرمایہ ہو وہی اس پوزیشن میں ہوتی ہے کہ وہ اس سے اپنی مرضی کے موافق سرمایہ کیش کر سکے۔ بصورت دیگر، اس کو اس بینک سے کچھ بھی نہیں ملے گا۔

ترکی کی خلافت کا قیام کوئی اچانک واقعہ نہ تھا۔ یہ دراصل اس سے پہلے کی صدیوں کی تاریخ میں جمع شدہ سیاسی سرمایہ تھا۔ اسی جمع شدہ تاریخی سرمایہ کو ترک لیڈروں نے کیش کرایا۔ یہ سرمایہ اتنا بڑا تھا کہ وہ کئی سو سال تک ان کے کام آتا رہا۔ ۱۹ ویں صدی کے خاتمہ پر تاریخ کے بینک میں جمع شدہ یہ سیاسی سرمایہ ختم ہو گیا، اس لئے بالکل فطری طور پر خلافت کا یہ قلعہ بھی ڈھہ پڑا۔

سید جمال الدین افغانی (وفات ۱۸۹۷) سے لے کر ابوالکلام آزاد (وفات ۱۹۵۸) تک درجنوں بڑی بڑی مسلم شخصیتیں ہیں جو مسلم ملّت کی جان اور مال کو بے دردی کے ساتھ تحفظ خلافت کے نام پر قربان کرا رہی تھیں۔ ان کو جاننا چاہئے تھا کہ یہ کسی سیاسی روایت کے تحفظ کا معاملہ نہیں ہے بلکہ وہ از سرنو ایک نئی تاریخ کو ظہور میں لانے کا معاملہ ہے۔ خلافت عثمانی جیسا ادارہ صرف اس وقت قائم ہو سکتا تھا یا قائم ہو سکتا ہے جب کہ لمبے عمل کے نتیجہ میں دوبارہ تاریخ کے بینک میں مسلم ملت کا اتنا بڑا سرمایہ اکھٹا ہو جو دور جدید میں ایک بین اقوامی سیاسی ادارہ قائم کرنے کے لئے کافی ہو۔ اس کے بغیر عثمانی خلافت جیسا ایک بین اقوامی سیاسی ادراہ قائم کرنے کی تحریک چلانا ایسا ہی ہے جیسے ایک سوکھے ویران باغ کے بارے میں یہ امید رکھنا کہ ٹونے ٹوٹکے جیسی تدبیروں کے ذریعہ وہ دوبارہ ایک ہرا بھرا باغ بن کر کھڑا ہو جائے گا۔

اسی زمانے میں برصغیر ہند میں وہ تحریک اٹھی جس کو عام طور پر آزادی کی تحریک کہا جاتا ہے۔ یعنی اس خطے کو انگریزوں کی سیاسی ماتحتی سے نجات دلانا اور اس کو قومی آزادی کے دور میں پہنچانا۔ اس تحریک میں ہندو اور مسلم لیڈر دونوں یکساں طور پر شریک تھے۔ اس مقصد کے لئے جو ہنگامہ خیز سرگرمیاں جاری ہوئیں اور جان و مال کی جو قربانیاں دی گئیں وہ مقدار کے اعتبار سے اس علاقہ کی کسی بھی دوسری تحریک سے بہت زیادہ تھیں۔ اس تحریک نے ۱۹۴۷ میں اپنے نشانہ کو پورا کر لیا۔ مگر مثبت نتیجہ کے اعتبار سے جائزہ لیا جائے تو آزادی کی پرشور تحریک بھی تقریباً مکمل طور پر بے نتیجہ دکھائی دے گی۔

اس تحریک کے اگلے مرحلہ میں مہاتما گاندھی تمام فرقوں کے مشترک لیڈر کے طور پر ابھرے۔ ان کو اتنی زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ وہ پورے ملک کی سیاسی امنگوں کی علامت بن گئے۔ انھوں نے اپنی سیاسی آزادی کی تحریک کا مقصد ان الفاظ میں بتایا تھا ـــــ ''میرا مشن ہر آنکھ کے آنسو پوچھنا ہے''۔ مگر سیاسی آزادی کے نتائج اتنے زیادہ منفی شکل میں ظاہر ہوئے کہ مہاتما گاندھی اور دوسرے تمام سیاسی لیڈروں کا حال یہ ہوا کہ انگریزی ہندستان میں انھوں نے ہمالیائی امنگوں کے ساتھ سیاسی آزادی کی تحریک چلائی تھی مگر جب وہ اپنا آزاد ملک بنانے میں کامیاب ہو گئے تو انھیں معلوم ہوا کہ ایک مایوسانہ بے بسی کے سوا ان کے پاس کوئی اور سرمایہ نہیں۔

برصغیر ہند کی سب سے بڑی تحریک کیوں اس طرح سراسر بے نتیجہ رہی، اس کا سبب سادہ طور پر یہ تھا کہ ہمارے سیاسی لیڈروں نے نہایت معصومانہ طور پر یہ سمجھ لیا کہ سیاسی غلامی تمام برائیوں کی اصل جڑ ہے اور سیاسی آزادی تمام بھلائیوں کا اصل سرچشمہ۔ مگر بدقسمتی سے ان کے یہ دونوں اندازے مکمل طور پر خلاف واقعہ تھے۔ انھوں نے ایک چیز کے بارے میں فرضی طور پر ایسی امید قائم کر لی جو سرے سے اس کے ذریعہ پوری ہونے والی تھی ہی نہیں۔

۱۹۴۷ سے پہلے برصغیر ہند کا اصل مسئلہ یہ نہیں تھا کہ یہاں انگریزوں کی سیاسی حکمرانی قائم ہے۔ اصل حقیقت کے اعتبار سے یہ ایک ضمنی مسئلہ تھا نہ کہ اساسی مسئلہ۔ یہاں کا اصل مسئلہ یہ تھا کہ

اس علاقہ میں بسنے والی غیرتعلیم یافتہ قوم کوتعلیم یافتہ بنایا جائے۔ان کو بے شعوری کے اندھیرے سے نکال کرشعور کے اجالے میں لایا جائے۔توہماتی روایات میں جینے والے لوگوں کو سائنسی حقائق میں جینے والا بنایا جائے۔ ناپائدار اخلاقی نظام کی جگہ پائدار اخلاقی نظام قائم کیا جائے۔سماجی انتشار کی حالت کوسماجی اتحاد میں تبدیل کیا جائے۔دولت کی پوجا کرنے والے لوگوں کو بلندتر آئیڈیل کے اوپر کھڑا کیا جائے، وغیرہ۔

ان تمام مقاصد کا کوئی بھی تعلق سیاسی آزادی سے نہ تھا۔ یہ مقاصد صرف تعمیراوراصلاح کی لمبی جدوجہد کے ذریعہ حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ سیاسی ہنگامہ آرائی یا سیاسی عہدے داروں کی تبدیلی کے ذریعہ ان مقاصد کا حصول ممکن نہیں۔ بلکہ سیاسی ہنگامہ آرائی کا طریقہ برعکس طور پر قومی اور سماجی فضا کو اتنا زیادہ بگاڑ دیتا ہے کہ مذکورہ قسم کے تعمیری مقاصد کا حصول سرے سے ممکن ہی نہیں رہتا۔

نام نہاد سیاسی آزادی کا یہ برعکس نتیجہ ہرآدمی آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔تعمیری قدروں کا تھوڑا بہت سرمایہ جوفطرت کے زور پر پہلے سے موجود تھا، ۱۹۴۷ کے بعد آنے والا سیاسی طوفان اس کوبھی بہالے گیا۔آج پوری قوم کا یہ حال ہے کہ وہ سیاسی اعتبار سے انارکی اور اخلاقی اعتبار سے دیوالیہ پن کی دوطرفہ چکی میں پس رہی ہے،اور بظاہر کوئی اس کواس تباہی سے بچانے والا نہیں۔

آزادی کی تحریک کے دوران کئی اورتحریکیں اٹھیں۔ان میں سے دوتحریکیں یہاں قابل ذکر ہیں۔ایک، ہندواحیاء کی تحریک اور دوسری وہ تحریک جس کو مسلم احیاء کی تحریک کہا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں تحریکیں بھی اپنے دھواں دھار قائدین کی سطح پر نہایت عظیم دکھائی دیتی ہیں۔مگر نتیجہ کے اعتبار سے وہ بھی صرف الٹا نتیجہ ظاہر کرنے والی ثابت ہوئیں۔اس کی ایک نمایاں مثال یہ ہے کہ مسلم احیاء کی تحریک اپنے آخری مرحلہ میں مسٹر محمد علی جناح کی قیادت میں بظاہر اپنے اس مطلوب نتیجہ تک پہنچی کہ اس نے ۱۹۴۷ میں مسلمانوں کا ایک علیٰحدہ ملک بنالیا۔مگر یہ کامیابی ہراعتبار سے بے حقیقت تھی۔ مسلم اکثریت کی جس آبادی میں یہ پاکستان بنایا گیا وہ پہلے ہی سے عملاً پاکستان بنا ہوا تھا۔اس تحریک کے لیڈروں کا کارنامہ صرف یہ ہے کہ پہلے جس علاقہ کو مسلم اکثریت کا علاقہ کہا جاتا تھا، اس کو انھوں

نے پاکستان کا نیا نام دے دیا، جب کہ مسٹر محمد علی جناح کے الفاظ میں یہ کٹا پھٹا پاکستان (Truncated Pakistan) بھی ۱۹۷۱ میں مزید ٹکڑے ہوکر صرف ایک کمزور مسلم ریاست کی صورت میں باقی رہا۔

دوسری طرف ہندو احیاء پرستی کی پشت پر بہت سے بڑے بڑے ہندو لیڈروں کے نام ہیں۔ مثلاً مونجے، ساورکر، ہیڈگواڑ، گول والکر، وغیرہ۔ اس تحریک کی بنیاد پر بڑی بڑی تنظیمیں ظہور میں آئیں۔ مثال کے طور پر آر ایس ایس کی تنظیم جو ۱۹۲۵ میں قائم ہوئی۔ اس تحریک کو ہندو قوم کا کافی تعاون ملا۔ ابتداءً ملک کی کئی ریاستوں میں ان کی حکومتیں بھارتیہ جنتا پارٹی کی قیادت کے تحت قائم ہوئیں۔ بیسویں صدی کے آخر میں انھوں نے ملک کی مرکزی قیادت پر بھی سیاسی قبضہ کرلیا۔ مگر خود ہندو مبصرین کے مطابق، وہ ملک کو کسی بھی درجہ میں تعمیر وترقی کی طرف نہ لے جاسکے۔

ہندو احیاء پرستی کی نمائندہ بھارتیہ جنتا پارٹی کا سیاسی ریکارڈ کسی بھی اعتبار سے روشن نہیں۔ یہی عناصر ہیں جنھوں نے ۱۹۴۸ میں مہاتما گاندھی کو قتل کرکے ملک میں تشدد کی روایت قائم کی۔ انھوں نے ۱۹۹۲ میں بابری مسجد کی تاریخی عمارت کو ڈھا کر ملک کو تخریب کاری کے راستہ پر ڈالا۔ انھوں نے محض اپنی پارٹی کے سیاسی مفاد کی خاطر رتھ کی سیاست چلائی اور اس کے ذریعہ ملک میں نفرت کا جنگل اگا دیا۔

ملک کے لئے شاید ان کا سب سے بڑا تحفہ یہ ہے کہ نفرت کی سیاست کو آخری حد تک لے جانے کے باوجود جب الیکشن میں انھیں مطلق اکثریت حاصل نہ ہوسکی تو انھوں نے ملکی سیاست میں سازش اور گٹھ جوڑ اور مال اور عہدہ کی لامحدود رشوتوں کا ایسا بازار گرم کیا جس کی کوئی مثال نہ ہندستان کی تاریخ میں ہے اور نہ شاید دنیا کے کسی اور ملک کی تاریخ میں۔ ہر قیمت پر اقتدار حاصل کرنے کی جو پالیسی انھوں نے چلائی اس نے ملک کی تمام انسانی اور اخلاقی روایات کو آخری حد تک تباہ کردیا۔

بر صغیر ہند کے ہندو-مسلم مسئلہ کا یہ حل کہ اس کو مذہب کی بنیاد پر تقسیم کیا جائے، کسی بھی اعتبار سے کوئی حل نہ تھا۔ مذہب اور غیر مذہب دونوں اعتبار سے یہ ایک تباہ کن سیاست تھی جو کسی سوچے سمجھے

منصوبہ کے بغیر چلائی گئی۔ یہ تحریک پوری طرح اس عربی شعر کے مصداق تھی:

إذا كان الغراب رئيس قوم سيهديهم الیٰ دار البوار

ملکی تقسیم کے معاملے کو خالص مذہبی یا اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھئے تو اس کے حق میں کوئی بھی سبب جواز نہیں ملے گا۔ اسلام مسلمہ طور پر ایک آفاقی مذہب ہے۔ وہ ساری انسانیت کو خطاب کرتا ہے۔ وہ صرف ایک فلسفہ نہیں بلکہ وہ ایک دعوتی اور انقلابی مذہب ہے۔ اسلام کی اس نوعیت کا یہ تقاضہ ہے کہ وہ مسلسل اپنی اشاعت کا طالب ہو۔ وہ سمٹاؤ کے بجائے توسیع کی بنیاد پر اپنا منصوبہ بنائے۔ اسلام تمام قوموں کو اپنے دائرے میں سمیٹنا چاہتا ہے نہ کہ دوقومی نظریہ ایجاد کر کے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ناقابل عبور دیوار کھڑی کر دینا۔

ان واضح حقائق کے باوجود برصغیر ہند میں تقسیم کی تحریک اٹھی اور مسلمانوں کی بیش تر تعداد اس کی حمایت پر کھڑی ہوگئی۔ اس تحریک کے حامیوں نے جو جذباتی نعرہ اختیار کیا وہ یہ تھا— پاکستان کا مطلب کیا، لاالہ الا اللہ۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ پاکستانی تحریک سراسر ایک قومی تحریک تھی، لاالہ الا اللہ سے اس کا کوئی بھی تعلق نہ تھا، نہ براہ راست اور نہ بالواسطہ۔

یہ تقسیم ہندو-مسلم مسئلہ کو حل کرنے کے نام پر کی گئی تھی مگر عین اپنے فطری نتیجہ کے طور پر اس نے اس علاقہ کے ہندو-مسلم مسئلہ کو پہلے سے بھی زیادہ بڑھا دیا۔ تقسیم سے پہلے یہ مسئلہ صرف دو فرقوں کے درمیان تھا، تقسیم کے بعد یہ مسئلہ دو باقاعدہ اسٹیٹ کے درمیان ہو گیا۔ اس کے نتیجہ میں دونوں فرقوں کے درمیان جو نزاعات پیدا ہوئے وہ اتنے تباہ کن تھے کہ تقسیم سے پہلے ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اس تقسیم نے برصغیر ہند کے دو خطوں کے درمیان مصنوعی حد بندی کر کے دونوں میں اس مفید باہمی تجارت کو تقریباً ختم کر دیا جو سیکڑوں سال سے چلی آرہی تھی۔ دونوں کے وسائل ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور بے زور کرنے میں لگ گئے۔ بین اقوامی مجلسوں میں دونوں کی پالیسی کا سب سے اہم نکتہ یہ بن گیا کہ وہ ایک دوسرے کی کاٹ کریں اور ایک دوسرے کے بین اقوامی مفادات پر مسلسل

ضرب لگائیں۔ دونوں میں تخریبی مقابلہ کا یہ سلسلہ ۱۹۹۹ میں اس انتہائی نوبت تک پہنچا کہ دونوں کے درمیان ایٹمی ہتھیاروں کی ایک ایسی دوڑ شروع ہوگئی جو دونوں کے لئے اقتصادی خودکشی کے ہم معنیٰ تھی۔

مزید یہ کہ ایٹمی ہتھیاروں کی اس انتہائی مہنگی دوڑ کی قیمت ادا کرنے کی طاقت نہ ہندستان میں تھی اور نہ پاکستان میں۔ چنانچہ عملاً یہ ہوا کہ وہ آپس میں تو ایک دوسرے کو برابری کا درجہ دینے کے لئے بھی تیار نہ تھے مگر وہ روس اور چین کو بالاتری کا درجہ دینے پر راضی ہوگئے۔ اس تخریبی دوڑ کو جاری رکھنے کے لئے ہندستان نے اپنے آپ کو روسی ریچھ کے ساتھ بریکٹ کرلیا اور پاکستان نے اپنے آپ کو گویا چینی دیو کے حوالے کردیا۔

لمبے سفر کے بعد برصغیر ہند کا یہ سیاسی قافلہ اب اکیسویں صدی میں داخل ہونے والا ہے۔ مگر ظاہری حالات کے اعتبار سے پورا خطہ غیر یقینی صورت حال سے دوچار ہے۔ برصغیر ہند کے کسی بھی سیاسی خطہ میں کوئی تعمیری روشنی دکھائی نہیں دیتی۔ میں ذاتی طور پر آخری حد تک ایک رجائیت پسند آدمی ہوں۔ مگر حالات بظاہر اتنے زیادہ خراب ہیں کہ اب میری رجائیت معلوم واقعات پر مبنی نہیں، اب وہ صرف اس امکان پر مبنی ہے کہ اس دنیا کا قانون یہ ہے کہ رات خواہ کتنی ہی زیادہ لمبی ہو جائے بہرحال صبح طلوع ہو کر رہتی ہے:

و مهما استطال الليل فالصبح واصل

جرمنی کا ایک ادارہ ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل (The Transparency International) نے ۱۹۹۹ میں ایک عالمی سروے کیا ہے۔ اس سروے کا مقصد یہ تھا کہ کرپشن کے اعتبار سے مختلف ملکوں کی درجہ بندی (ranking) کی جائے۔ اس سروے میں ۸۵ ملکوں کا جائزہ لیا گیا۔ اس فہرست کے مطابق، انڈیا، نواں انتہائی کرپٹ ملک (9th most corrupt country) ہے۔ کرپشن کے معاملہ میں یہی حالت پاکستان اور بنگلہ دیش کی بھی ہے۔

انڈیا کا سب سے بڑا مسئلہ بلاشبہ یہی ہے۔ کرپشن کی موجودگی میں ملکی تعمیر کا کوئی بھی کام نہیں کیا

جا سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ کرپشن سے مکمل طور پر خالی سماج موجودہ دنیا میں ایک غیر عملی خواب ہے۔ تاہم ترقی یافتہ ملکوں کے تجربہ کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ عین ممکن ہے کہ کرپشن کو ایک حد پر روک دیا جائے تاکہ عام شہری زندگی میں خلل واقع نہ ہو۔

میں نے ترقی یافتہ ملکوں کا بار بار سفر کیا ہے۔ میں نے پایا ہے کہ ان ملکوں میں کچھ چیزوں کا خاص اسٹینڈرڈ بن گیا ہے۔ یہ اسٹینڈرڈ اتنا ''مقدس'' ہے کہ کوئی کرپٹ آدمی بھی اس کو چھونے کی کوشش نہیں کرتا۔ مثلاً انفرا اسٹرکچر (infrastructure) یعنی بنیادی اقتصادی سہولتیں، جیسے سڑک، بجلی، ٹیلی فون، ٹرانسپورٹ، وغیرہ۔ ان ملکوں میں آپ سفر کریں تو ہر جگہ یہ چیزیں اعلیٰ معیاری حالت میں نظر آئیں گی۔ پولیس کا محکمہ آپ کے ساتھ ہمدرد اور معاون جیسا معاملہ کرے گا۔ سرکاری دفتروں میں رشوت کے بغیر سب کام ہوگا۔ بیوروکریسی کی وہ لعنت ان ملکوں میں نظر نہیں آئے گی جو ہندستان اور پاکستان میں تکلیف دہ حد تک شہریوں کے اوپر مسلط ہے۔

ہندستان میں ہم کو یہ شعور جگانا ہے کہ اس قسم کی کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کو کرپشن سے آزاد رکھنا خود کرپٹ لوگوں کے لئے بھی مفید اور ضروری ہے۔ مثلاً موٹر کار، خواہ کسی قسم کے پیسے سے خریدی جائے، اس کو دوڑانے کے لئے اچھی سڑک ضروری ہے۔ ٹیلی فون کرنے والا خواہ ایک آدمی ہو یا دوسرا آدمی، دونوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ معیاری طور پر کام کرتا ہو، وغیرہ۔

ہندستان کی قدیم کہانیوں میں بتایا گیا ہے کہ یدھشٹر کی سچائی کی وجہ سے ان کا رتھ زمین کے اوپر چلتا تھا۔ ایک بار وہ جنگ کے موقع پر جھوٹ بولے تو ان کا رتھ زمین پر آ گیا پھر وہ دوبارہ نہیں اٹھا۔ ۱۸۹۶ میں سوامی وویکانند امریکا گئے تو وہاں انھوں نے کیریکٹر کو ہندستان کی پہچان بتایا۔ آج ضرورت ہے کہ ان قدیم روایتوں کو نئے حالات میں دوبارہ زندہ کیا جائے جو آج بھی جدید ترقی یافتہ ملکوں میں موجود ہیں۔ یعنی کچھ مشترک اہمیت رکھنے والی چیزوں کو کرپشن سے مکمل طور پر آزاد رکھنا۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ شعور یا یہ قومی کردار کوئی ناممکن چیز نہیں۔ جب وہ آج بھی دنیا کے بہت سے ملکوں میں موجود ہے تو وہ ہمارے یہاں بھی کیوں نہیں حاصل ہو سکتا۔

بیسویں صدی کے خاتمہ تک میری عمر ہجری کیلینڈر کے لحاظ سے تقریباً اسّی سال ہو جائے گی۔ اب مجھے یہ امید نہیں کہ میں برصغیر ہند کا کوئی نیا مستقبل دیکھنے کے لئے زندہ رہوں گا۔ تاہم کلمۂ باقیہ (الزخرف ۲۸) کے طور پر چند باتیں یہاں درج کرنا چاہتا ہوں جو میرے نزدیک اس خطہ میں کسی صالح اور تعمیری آغاز کے لئے ضروری ہیں۔

ا۔ میرے نزدیک کسی حقیقی تعمیر کا پہلا قدم یہ ہے کہ ہندستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کا ایک مشترک وفاق بنایا جائے۔ اس وفاق میں تینوں کی خودمختار حیثیت پوری طرح برقرار رہے گی البتہ باہمی تعلقات میں نرمی کا وہ طریقہ اختیار کیا جائے گا جو آج بھی دنیا کے مختلف ملکوں میں رائج ہے۔ مثلاً تینوں ملکوں کے درمیان ویزا کے بغیر کھلی آمد و رفت، جو کہ آج بھی عرب ملکوں میں یا یورپ کے ملکوں میں عملاً موجود ہے۔ اسی طرح تینوں ملکوں میں مسابقت کے اصول پر آزادانہ تجارت، تعلیمی اور ثقافتی سفروں کی عام اجازت، وغیرہ۔

۲۔ تینوں ملکوں کے درمیان بعض اختلافی مسائل ہیں جو تقریباً پچاس سال سے چلے آرہے ہیں، یہ صورت حال ہر ایک کے لئے ہلاکت خیز ہے۔ اس صورت حال کو مکمل طور پر اور آخری طور پر ختم کر دینا چاہئے۔ ان نزاعات کے خاتمہ کا ایک عمومی طریقہ یہ ہوگا کہ ان کو صورت موجودہ کی برقراری (statusquoism) کے اصول پر ختم کر دیا جائے۔ ان نزاعات کا خاتمہ اب آخری طور پر ضروری ہو گیا ہے، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کے خاتمہ کے لئے عملی طور پر اس کے سوا کوئی اور ممکن صورت نہیں۔

۳۔ اپنی موجودہ پالیسی کے نتیجہ میں تینوں ملک اس مشترک نقصان سے دوچار ہوئے ہیں کہ ان کے اقتصادی ذرائع کا بڑا حصہ دفاع کے نام پر جنگی تیاریوں میں ضائع ہو رہا ہے۔ اس کے نتیجہ میں یہ پورا خطہ تباہ کن حد تک تعلیمی اور اقتصادی پچھڑے پن کا شکار ہے۔ اس صورت حال کا خاتمہ فوری طور پر ضروری ہے۔ اب آخری طور پر وہ وقت آ گیا ہے کہ اس خطہ میں تخریبی دوڑ کی جگہ تعمیری دوڑ شروع کی جائے۔ حتٰی کہ اگر ضرورت ہو تو یہ کام یک طرفہ رسک لے کر انجام دینا چاہئے۔

۴۔ آزادی کے بعد تینوں ملکوں کی مشترک تباہی کا ایک سبب مذہبی سیاست بھی ہے۔ موجودہ زمانہ میں جس چیز کو مذہبی سیاست کہا جاتا ہے وہ مذہب کے نام پر صرف سطحی لیڈری ہے۔ سیاست کے بارے میں کسی نے نہایت درست طور پر کہا ہے کہ سیاست ممکنات کا کھیل ہے:

Politics is the art of the possible.

موجودہ حالات میں پورے برصغیر ہند کے لئے واحد قابل عمل سیاست وہ ہے جس کو سیکولر سیاست کہا جاتا ہے۔ یعنی ریاست یا سیاسی سرگرمیوں کا موضوع صرف ان امور کو بنایا جائے جو مشترک دنیوی امور ہیں، مثلاً قوم کو تعلیم یافتہ بنانا، اقتصادیات کو ترقی دینا، ملک کے قدرتی وسائل کے بہتر استعمال کی منصوبہ بندی کرنا، ملک میں امن کا ماحول قائم کرنا، ملک میں معیاری قسم کا انفراسٹرکچر تعمیر کرنا، وغیرہ۔

اس کے بعد جو مذہبی امور ہیں ان کے معاملہ میں ہر مذہبی گروہ کو آزادی دینا کہ وہ آزادانہ طور پر اپنے مذہب کی تعلیمات پر عمل کرے، صرف اس ایک شرط کے ساتھ کہ اس کی مذہبی سرگرمیاں دوسرے کے لئے کوئی مسئلہ پیدا کرنے والی نہ ہوں۔ انفرادی دائرے میں پرامن رہنے کی شرط پر ہر ایک کو مذہبی آزادی حاصل رہے۔

جہاں تک مذہب کے اجتماعی یا سیاسی احکام کا تعلق ہے، موجودہ حالات میں وہ علمی اور فکری بحث کا موضوع تو ضرور بن سکتے ہیں مگر موجودہ حالات میں عملی طور پر ان کو نفاذ کا موضوع نہیں بنایا جا سکتا۔ ریاست کا قیام ہمیشہ تہذیب کے تابع ہوتا ہے۔ اس کا اصول یہ ہے کہ ـــــ جیسی تہذیب ویسی ریاست ۔ مذہبی ریاست کو وجود میں لانے سے پہلے مذہبی تہذیب کو وجود میں لانا ہوگا، جو بر وقت موجود نہیں۔ اس کے بغیر ریاست کا قیام سرے سے قابل عمل ہی نہیں۔

نئی دہلی، ۲۲ مئی ۱۹۹۹ء   وحیدالدین

ہند-پاک ڈائری

01

میں ایک غیر سیاسی آدمی ہوں۔ میری بیشتر زندگی تنہائی میں گزری ہے۔ تاہم تاریخی اعتبار سے میرا تعلق اس نسل سے ہے جس کو تقسیم (۱۹۴۷) سے پہلے کے ہندستان کو سن شعور میں دیکھنے کا موقع ملا، جس نے مولانا حسین احمد مدنی، پنڈت جواہر لال نہرو، سبھاش چندر بوس جیسے قومی رہنماؤں کی تقریریں اس وقت سنیں جب کہ ہندستان کی آزادی ابھی بہت دور دکھائی دے رہی تھی، جس نے ۱۹۳۶ کے پہلے الیکشن کو براہ راست دیکھا، جس نے ۱۹۴۷ سے پہلے بابری مسجد (ایودھیا) میں داخل ہوکر وہاں نماز پڑھی، جس نے اس ہندستان کو دیکھا جب کہ ریلوے اسٹیشنوں پر ہندو پانی اور مسلم پانی کے الگ الگ بورڈ ہوا کرتے تھے، اور اس ہندستان کو بھی جہاں اس قسم کے بورڈ ختم کر دیئے گئے ہیں۔ اس وقت کو بھی دیکھا جب کہ میرے وطن اعظم گڑھ میں صرف ایک موٹر کار تھی اور آج کو بھی جب کہ اعظم گڑھ میں (اور اسی طرح ہر مقام پر) کثیر تعداد میں کاریں رات دن سڑکوں پر دوڑ رہی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جس نے ''غلامی'' کے زمانہ کو بھی دیکھا اور ''آزادی'' کے زمانہ کو بھی۔

براہ راست اور بالواسطہ مشاہدہ کی یہ مدت تقریباً سوسال کے دائرہ میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس طویل مدت میں میں نے جو کچھ دیکھا اور جو پڑھا اور جانا وہ ایک لمبی کہانی ہے جو انشاء اللہ میری سوانح عمری میں جگہ پا سکے گی۔ یہاں اس کے بعض اجزاء درج کئے جاتے ہیں جو موجودہ حالات کو سمجھنے میں شاید رہنما بن سکیں۔

اس کا نام میں نے ''ہند-پاک ڈائری'' رکھا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ تحریریں کسی تاریخی ترتیب پر مشتمل ہیں۔ یہ حقیقۃً مختلف تاثرات اور مشاہدات ہیں جو تاریخی ترتیب سے زیادہ ذوقی ترتیب پر مشتمل ہیں۔ ان تحریروں کو میں نے حوالوں سے بوجھل کرنا پسند نہیں کیا ہے بلکہ زیادہ تر تاثراتی انداز کو اختیار کیا ہے، اور میرا خیال ہے کہ دونوں ہی انداز کی اپنی الگ الگ افادیت ہے۔

اس مجموعہ کا مقصد یہ جاننے کی کوشش کرنا ہے کہ پچھلے سوسال کی ہنگامہ خیز جدوجہد کے باوجود کیا وجہ ہے کہ ہماری تباہی کا خاتمہ نہ ہو سکا۔ اس معاملہ میں راقم الحروف کا جو نقطۂ نظر ہے اس

کو واضح کرنے کے لئے یہاں ایک مثال درج کی جاتی ہے۔

۱۹۴۷ کے بعد پیش آنے والے واقعات میں شاید سب سے زیادہ ہنگامہ خیز واقعہ وہ ہے جو بابری مسجد (اجودھیا) سے تعلق رکھتا ہے۔ اس مسئلہ میں ہندو اور مسلمان دونوں گہرے طور پر شامل ہوئے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ مسئلہ اپنی ذات میں بہت زیادہ اہم ہے۔ اس کا اصل سبب یہ تھا کہ اس مسئلہ کو انتہائی غیر متناسب طور پر ابھارا گیا۔ اور اس ابھارنے میں ہندو اور مسلمان دونوں یکساں طور پر شریک تھے۔

ایک طرف ہندو رہنماؤں اور دانشوروں نے، ہندوؤں کو گری لال جین (وفات ۱۹۹۳) کی زبان میں یہ کہہ کر ابھارا کہ یہ تمہارے لئے دوسری شکست (second defeat) کا مسئلہ ہے۔ ۱۹۴۷ میں بٹوارہ کے سوال پر تم کو مسلمانوں کے مقابلہ میں شکست ہوئی، اب اجودھیا کے سوال پر ہمیں دوسری بار شکست کو قبول نہیں کرنا ہے۔

دوسری طرف مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والوں نے، خواہ وہ بے ریش ہوں یا باریش، بیک زبان مسلمانوں سے یہ کہنا شروع کیا کہ یہ صرف ایک مسجد کا سوال نہیں ہے بلکہ وہ ملت مسلمہ کی بقا کا سوال ہے۔ بابری مسجد اس ملک میں ملت کی بقا کی علامت ہے۔ بابری مسجد اگر ڈھائی گئی تو اس ملک میں مسلمانوں کا پورا ملی وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔

یہ دونوں ہی باتیں سراسر بے بنیاد تھیں۔ بابری مسجد کا مسئلہ نہ تو ہندوؤں کے لئے دوسری شکست کا مسئلہ تھا، اور نہ مسلمانوں کے لئے ملت کی بقا کا مسئلہ۔ مگر اس قسم کی سنسنی خیز باتیں کہہ کر دونوں فرقوں کو اس طرح ابھارا گیا کہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہو گئے۔ یہ صف آرائی اتنی بڑھی کہ اجودھیا کا سوال دونوں فرقوں کے لئے وقار کا سوال بن گیا۔ جب کسی مسئلہ کو وقار کا مسئلہ بنا دیا جائے تو مسئلہ کے حل کے امکانات بڑھتے نہیں بلکہ خطرناک حد تک کم ہو جاتے ہیں۔ یہی مسجد۔مندر کے جھگڑے میں ہوا۔ جیسا کہ معلوم ہے، ہندستان میں تقسیم کے وقت سرحدی علاقوں میں ہزاروں مسجدیں ڈھائی گئیں۔ خود مسلم دنیا میں بھی تقریباً ہر مسلم ملک میں کثرت سے مسجدیں ڈھائی گئی ہیں۔

مگران مسجدوں میں سے کسی مسجد کا ڈھایا جانا کسی خطرناک صورت حال کا سبب نہیں بنا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ان مسجدوں کے نام پر مسجد والوں اور ڈھانے والوں کے درمیان ایسی تحریکیں نہیں چلائی گئیں جو اس معاملہ کو دونوں فریق کے لئے وقار کا مسئلہ بنا دیں۔

بابری مسجد کو جس چیز نے ایک خطرناک مسئلہ بنایا وہ خود بابری مسجد کی انفرادی نوعیت نہیں تھی، بلکہ بابری مسجد کے نام پر چلائی جانے والی تحریک کی انفرادی نوعیت تھی۔اس انداز کی جذباتی تحریک جس مسجد یا غیر مسجد کے لئے بھی چلائی جائے، وہ یقیناً اسی قسم کا منفی نتیجہ پیدا کرے گی۔

۱۹۱۳ میں اس وقت کی انگریز حکومت نے کانپور کی ایک مسجد کے صرف غسل خانہ کو سڑک کی توسیع کے لئے ڈھایا تھا۔اس کے نام پر اس زمانہ کے لیڈروں نے زبردست تحریک اٹھادی۔اس کے پیچھے مسجد کی حمایت سے زیادہ انگریز کی مخالفت کا جذبہ تھا۔اس زمانہ کے مسلم لیڈروں کی جذباتی تقریروں نے مسلمانوں کو اس قدر بھڑکایا کہ وہ انگریز انتظامیہ سے لڑ گئے۔اس کے بعد انگریزی پولیس نے گولی چلائی جس میں بہت سے مسلمان ہلاک ہوگئے۔مولانا شبلی نعمانی نے اس واقعہ پر ایک جذباتی نظم لکھی جو اس زمانہ میں بہت مقبول ہوئی۔اس نظم میں لاشوں کے منظر کی تصویر کشی کرتے ہوئے آخر میں یہ کہا گیا تھا کہ:

پوچھا جو میں نے کون ہو تم، آئی یہ صدا ہم کشتگانِ معرکۂ کان پور ہیں

یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ اکثر عرب ملکوں میں سڑک کی توسیع کے لئے نہ صرف غسل خانہ بلکہ پوری کی پوری مسجدیں ڈھادی گئیں۔مگر وہاں مسلمانوں کی لاشوں کا یہ دردناک منظر کبھی دکھائی نہیں دیا۔اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ وہاں اس قسم کے جذباتی لیڈر موجود نہ تھے جو مسلمانوں کو اشتعال دلا کر ان کو انتظامیہ سے ٹکرائیں۔اس کے نتیجہ میں پولیس گولی چلائے اور مسلمانوں کی خونی لاشیں زمین پر دکھائی دینے لگیں۔

02

آج برصغیر ہند میں ہر سوچنے والے انسان کے سامنے ایک ہی سوال ہے۔وہ یہ کہ پچھلے تقریباً سو

سال کے درمیان یہاں بہت سی بڑی بڑی تحریکیں چلائی گئیں اور بے شمار قربانیاں دی گئیں مگر نتیجہ صفر رہا۔
ہماری تمام کوششیں اور قربانیاں عملاً رائیگاں ہو کر رہ گئیں۔ کچھ نئی چیزوں کا حوالہ دے کر کہا جاتا ہے کہ آزادی کے بعد انڈیا نے یہ اور یہ ترقیاں کی ہیں۔ مگر یہ حوالے درست نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ تمام جدید چیزیں زمانہ کی پیداوار ہیں۔ وہ صنعتی انفجار (industrial explosion) کا نتیجہ ہیں۔ وہ سیاسی آزادی یا ملکی حکومت کی دین نہیں۔ ہندستان میں اگر انگریزوں کی حکومت باقی رہتی تب بھی یہ نئی ترقیاں ہمیں اسی طرح حاصل ہوتیں جیسے کہ وہ آج حاصل ہیں۔ اس کی ایک مثال ملک میں جدید کمیونی کیشن (مثلاً ریلوے) کا نظام ہے جو زیادہ تر انگریزوں ہی کے زمانے میں قائم ہوا۔

اس المیہ کا سبب اصلاً صرف ایک ہے۔ پختگی کی عمر کو پہنچنے کے بعد میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ برصغیر ہند میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو لیڈر اٹھے وہ تقریباً سب کے سب ایک ہی غلطی کا شکار ہوئے۔ اس غلطی نے ان کی ہمالیائی کوششوں کو بے نتیجہ بنا دیا۔ یہ ترجیحات (priorities) کا غلط تعین ہے۔

۱۹۴۷ سے پہلے کے ہندستان میں مہاتما گاندھی نے سیاسی آزادی کو اپنی پہلی ترجیح بنایا۔ حالانکہ زیادہ صحیح یہ تھا کہ وہ تعلیم کو اپنی پہلی ترجیح بنائیں۔ آزادی کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو نے سوسلشٹ اکانومی (زیادہ صحیح لفظوں میں سرکاری اکانومی) قائم کرنے کو اپنی پہلی ترجیح بنایا۔ حالانکہ ان کے لئے صحیح یہ تھا کہ وہ ملک میں انفراسٹرکچر (infrastructure) وجود میں لانے کو اپنی پہلی ترجیح بنائیں۔ اٹل بہاری باجپئی نے ایٹم بم بنانے کو اپنی پہلی ترجیح قرار دیا۔ حالانکہ ان کے لئے صحیح یہ تھا کہ وہ سرکاری بھرشٹاچار ختم کرنے کو اپنی پہلی ترجیح بنائیں۔

یہی معاملہ سرحد کے دوسری طرف پاکستان میں ہوا۔ مسٹر محمد علی جناح نے دوقومی دنیا وجود میں لانے کو اپنی اولین ترجیح بنایا۔ حالانکہ ان کے لئے صحیح یہ تھا کہ وہ ایک قومی دنیا وجود میں لانے کو اپنی اولین ترجیح بنائیں۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اسلامائزیشن آف اسٹیٹ کو اپنی پہلی ترجیح بنایا۔ حالانکہ ان کے لئے صحیح یہ تھا کہ وہ اسلامائزیشن آف مین کو اپنی پہلی ترجیح بنائیں۔ نواز شریف کو چاہئے تھا کہ وہ

اقتصادی خود کفالتی کو پاکستان کی پہلی ترجیح بنائیں جو کہ تقریباً پچاس بلین ڈالر کا مقروض ہو چکا ہے۔ مگر انھوں نے شاہین بم اور غوری میزائل بنانے کو اپنی پہلی ترجیح قرار دیا، وغیرہ۔

صحیح ترجیح اختیار کرنے والی قوم وقت پر اپنی منزل پر پہنچتی ہے۔ اور غلط ترجیح اختیار کرنے والی قوم کہیں بھی نہیں پہنچتی۔ خواہ بظاہر وہ کتنی ہی زیادہ لمبی مدت تک سرگرمی دکھاتی رہے۔ بدقسمتی سے یہی دوسری صورت انڈیا اور پاکستان کے حصہ میں آئی ہے۔

03

آزادی سے پہلے غالباً ۱۹۴۴ میں میں لاہور گیا تھا۔ اس وقت شاہ گنج (جون پور) سے لاہور تک براہ راست ٹرین جاتی تھی۔ چنانچہ میں اپنے قریبی اسٹیشن شاہ گنج میں ٹرین پر بیٹھا اور سفر کر کے لاہور اسٹیشن پر اتر گیا۔ اس وقت وہاں میرا کوئی جاننے والا نہ تھا۔ پہلی رات میں نے ریلوے اسٹیشن سے قریب ایک مسجد میں گذاری۔ اس کے بعد دن کو میں شہر دیکھنے کے لئے نکلا۔

میں بغیر کسی منصوبہ کے لاہور کی سڑکوں پر چل رہا تھا۔ اتفاقی طور پر ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کا پورا نام مجھے یاد نہیں۔ البتہ یہ یاد ہے کہ لوگ انھیں قریشی صاحب کہا کرتے تھے۔ وہ مجھ پر مہربان ہو گئے اور مجھے اپنے گھر لے گئے جو صرف ایک کمرہ پر مشتمل تھا۔ میں تقریباً دو ہفتہ ان کے ساتھ رہا۔ انھوں نے مجھ کو جن لوگوں سے ملایا ان میں سے ایک لاہور کے ہندو تاجر تھے۔ لاہور کے مال روڈ پر ان کی ایک بڑی دوکان تھی جس کے اوپر جلی حرفوں میں انگریزی میں لکھا ہوا تھا: بی لیلا رام اینڈ سنز۔ قریشی صاحب کے اس ہندو تاجر سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ وہ کئی بار مجھ کو وہاں لے گئے۔ اس ہندو تاجر نے میرے ساتھ نہایت عزت اور محبت کا معاملہ کیا۔ اس وقت لاہور میں بہت سے ہندو رہتے تھے۔ ان ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اس وقت نہایت خوشگوار تعلقات تھے۔ یہی حال اس پورے خطہ کا تھا جس کو اب پاکستان کہا جاتا ہے۔

یہ آزادی سے پہلے کی بات ہے۔ اب آزادی کے بعد اس خطۂ ارضی میں کیا حالات ہیں۔ اس کا ایک نمونہ یہ ہے کہ یکم جون ۱۹۹۸ کو میں نے ریڈیو پاکستان پر پاکستانی وزیر اعظم مسٹر محمد نواز شریف

کی تقریر سنی۔ وہ پاکستانی عوام کو خطاب کرتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ جس دن (۲۸ مئی ۱۹۹۸) ہم اپنا ایٹمی دھماکہ کرنے والے تھے، اس سے پہلے کی رات کو میں بالکل نہیں سویا۔ اس لئے کہ ہر وقت یہ اندیشہ تھا کہ دشمن کہیں ہمارے اوپر حملہ نہ کردے۔

آزادی سے پہلے جب میں نے مذکورہ سفر کیا تو اترپردیش سے لے کر پنجاب تک ہر جگہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان برادرانہ ماحول کا منظر تھا۔ اس وقت دونوں میں سے کوئی بھی ''دشمن'' کا لفظ نہیں بولتا تھا۔ مگر آج سرحد کے دونوں طرف اس لفظ کا استعمال عام ہو چکا ہے۔ اس فرق کا سبب کیا ہے۔ اس فرق کا اصل سبب میرے علم کے مطابق، زرد صحافت اور زرد قیادت ہے۔ جس نے مصنوعی طور پر دوستی کو دشمنی میں بدل دیا ہے۔

زرد صحافت اور زرد قیادت کا طریقہ کیا ہے۔ یہ طریقہ ایک لفظ میں منتخب رپورٹنگ (selective reporting) ہے یعنی ایک ہزار میں سے ۹۹۹ اچھی باتوں کو چھوڑ دینا، اور صرف ایک بری بات کو مزید اضافہ کے ساتھ کثرت سے بیان کرنا۔ یہی پچھلے برسوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ پیش آیا ہے۔ دونوں طرف کے کچھ لکھنے اور بولنے والے اسی اسلوب کو اختیار کرکے دونوں گروہوں کو غیر فطری طور پر بھڑکاتے رہے۔ یہاں تک کہ دونوں کے درمیان فطرت کا قائم کردہ معتدل تعلق ٹوٹ گیا اور دونوں کے درمیان غیر معتدل تعلق قائم ہو گیا۔ زرد صحافت اور زرد قیادت کے معاملہ کو سمجھنے کے لئے دونوں طرف کی ایک ایک مثال یہاں درج کی جاتی ہے۔

میرے علم کے مطابق، پچھلے تقریباً ۶۰ سال سے ایک بات مسلمانوں کے درمیان بار بار دہرائی جاتی رہی ہے۔ وہ یہ کہ ہندوؤں کا یہ منصوبہ ہے کہ آزادی کے بعد جب اکثریتی فرقہ ہونے کی حیثیت سے انھیں ملک میں اقتدار حاصل ہو تو وہ ہندستان کو دوسرا اسپین بنانے کی کوشش کریں۔ یعنی اس ملک سے مسلمانوں کا خاتمہ کردیں۔ یہ بات جمعیۃ علماء ہند کے مولانا محمد میاں (وفات ۱۹۷۵) سے لے کر ندوۃ العلماء کے مولانا علی میاں (وفات ۱۹۹۹) تک، لمبے عرصہ سے بار بار دہراتے رہے ہیں۔ مگر ان حضرات میں سے کسی نے کبھی اس کا کوئی ماخذ نہیں بتایا۔ یہ صرف ایک سنی سنائی بات ہے

جس کو ہمارے علماء اور غیر علماء بلاتحقیق برابر دہراتے رہتے ہیں۔ اس نے مسلمانوں کے اندر برادران وطن کی طرف سے ایک غیر ضروری قسم کا خوف پیدا کر دیا۔ ان کے اندر وہ معتدل مزاج باقی نہ رہا جو کسی ملک میں مستحکم ترقی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے۔

''دوسرے اسپین'' کا افسانہ ہر اعتبار سے بے بنیاد ہے۔ نہ اس کا کوئی واقعی ثبوت موجود ہے کہ ہندوؤں کی کوئی تنظیم اس مقصد کے لئے کام کر رہی ہے۔ اور اگر بالفرض ایسے کچھ سر پھرے ہندو ماضی میں رہے ہوں یا آج کہیں موجود ہوں تب بھی اس قسم کا تخریبی منصوبہ بلا شبہ خدا کی اس دنیا میں نا قابل عمل ہے۔ ایسی حالت میں ہمارا کام اس کو نظر انداز کرنا ہے نہ کہ اس کو ایک خطرہ بتا کر مسلمانوں کو اس سے ڈرانا۔ (اس کی تفصیل راقم الحروف کی کتاب ہندستانی مسلمان کے باب ''بے بنیاد خوف'' میں دیکھی جا سکتی ہے۔)

زرد صحافت اور زرد قیادت کا یہی معاملہ خود ہندوؤں کے درمیان بھی پیش آیا۔ لکھنے اور بولنے والے ہندوؤں کے ایک طبقہ نے عجیب وغریب طور پر ہندوؤں میں یہ افواہ پھیلائی کہ مسلمانوں کے لئے اپنے مذہب کے رو سے چار شادیاں کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ ہر مسلمان چار شادیاں کرتا ہے، جب کہ ہندو صرف ایک شادی کرتا ہے۔ اس طرح ایک مسلمان ایک ہندو کے مقابلہ میں چوگنا زیادہ بچے پیدا کر رہا ہے۔ گویا کہ ہندوؤں کی آبادی ۱۔ ۲۔ ۳۔ ۴ کی رفتار سے بڑھ رہی ہے۔ جب کہ مسلمانوں کی آبادی ۱۔ ۴۔ ۸۔ ۱۶ کی رفتار سے بڑھ رہی ہے۔ اس طرح مسلمان بہت جلد تعداد میں ہندوؤں سے زیادہ ہو جائیں گے۔

ایسی حالت میں ضروری ہے کہ مسلمانوں کے اضافۂ آبادی کو روکنے کے لئے سخت تدبیر اختیار کی جائے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی جیسی انتہا پسند جماعت کو سیاسی اقتدار تک پہنچانے میں اس قسم کے فرضی خطرہ کا بہت بڑا دخل ہے۔ ہندوؤں کو محسوس ہوا کہ کانگریس جیسی ''نرم'' پارٹی مسلم نسل کی حد بندی نہیں کر سکتی۔ اس لئے ضروری ہے کہ ایک ''سخت'' پارٹی کو مرکزی اقتدار دیا جائے، ورنہ ہندو پچاس برس بعد خود اپنے ہی ملک میں اقلیت بن کر رہ جائیں گے۔

اس بے بنیاد افواہ کی مدلّل تردید میں نے اپنے مضامین میں کی ہے۔ اس کے علاوہ خود ہندوؤں کے جلسہ میں بھی ایک سے زیادہ بار اس کی تردید کر چکا ہوں۔ (ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب یکساں سول کوڈ)۔ ۲۳ فروری ۱۹۹۷ کو نئی دہلی کے کانسٹی ٹیوشن کلب میں ایک جلسہ تھا۔ اس میں دہلی کے آر ایس ایس گروپ کے لوگ بڑی تعداد میں شریک تھے۔ یہاں مجھے تقریر کرنے کا موقع ملا۔ میں نے جو باتیں کہیں ان میں چار شادی کا یہ افسانہ بھی تھا۔

میں نے کہا کہ قرآن وحدیث میں کہیں بھی یہ حکم نہیں ہے کہ ہر مسلمان چار شادی کرے۔ تاہم اس سے قطع نظر عقل عام ہی یہ سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ ایسا ہونا عملی طور پر ممکن نہیں۔ یہ بات اتنی زیادہ بے بنیاد ہے کہ وہ بظاہر ہی قابل رد ہے:

Prima facie it stands rejected.

میں نے کہا کہ بالفرض اگر ہر مسلمان چار شادیاں کرے تو یہ صرف اس وقت ممکن ہوگا جب کہ مسلم سماج میں عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلہ میں چار گنا زیادہ ہو۔ یعنی اگر ایک کرور مرد ہوں تو چار کرور عورتیں۔ مگر واقعات بتاتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ نیچر ہمیشہ عورت اور مرد کی تعداد کے درمیان ایک توازن (equilibrium) برقرار رکھتی ہے۔ چنانچہ ہر سماج میں عورت اور مرد کی تعداد ہمیشہ تقریباً یکساں رہتی ہے۔ حتیٰ کہ اگر جنگ یا کسی بڑے حادثہ کی وجہ سے وقتی طور پر یہ توازن ٹوٹ جائے تو نیچر بہت جلد اس کے مطابق افراد پیدا کر کے اس توازن کو دوبارہ قائم کر دیتی ہے۔

یہی تمام انسانی معاشروں کا حال ہے۔ اور یہی مسلم معاشرے کا حال بھی۔ ایسی حالت میں یہ بات سرے سے ممکن ہی نہیں کہ ہر مسلمان چار عورتوں سے شادیاں کرے۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ مسلمانوں کے پاس کوئی عورت ساز فیکٹری ہو جس میں وہ اپنی مطلوب تعداد کے مطابق، عورتیں بنا لیا کرتے ہوں۔ مگر اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ مسلمانوں کے پاس ایسی کوئی عورت ساز فیکٹری موجود ہے۔ پھر ہر مسلمان اگر چار شادی کرے گا تو کس طرح کرے گا۔ یہ فاضل عورتیں آخر کہاں سے لائی جائیں گی۔

اس قسم کی افواہی باتیں جو ہندو اور مسلمان دونوں کے درمیان پھیلائی گئیں۔ انھوں نے اس فطری تعلق کو توڑ دیا جو دونوں کے درمیان سیکڑوں سال سے قائم تھا۔ اس کا ایک نتیجہ ملک کے بٹوارہ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ تاہم بٹوارہ کے بعد اگر افواہوں کا یہ کارخانہ بند ہو جاتا تب بھی اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔ ایک عارضی وقفہ کے بعد دوبارہ فطرت اپنے آپ مطلوب اعتدال کو دونوں کے درمیان قائم کر دیتی۔ مگر بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا بلکہ افواہوں کا یہ کارخانہ مزید اضافہ کے ساتھ جاری رہا۔ یہاں تک کہ اب سرحد کے دونوں طرف اس بات پر فخر کیا جا رہا ہے کہ ہم اب ایٹمی طاقت بن چکے ہیں۔ اب ہم دشمن کو اس طرح مٹا سکتے ہیں کہ اس کا کوئی وجود ہی زمین پر باقی نہ رہے۔

04

یوپی کے ضلع اعظم گڑھ میں میرے گاؤں سے تقریباً ۳ کیلومیٹر کے فاصلہ پر بسین پور تھا۔ یہاں ایک وسیع زرعی فارم کے اندر یورپی طرز کی ایک لال عمارت تھی جس کو ''صاحب کا بنگلہ'' کہا جاتا تھا۔ یہاں ایک انگریز مسٹر لاری رہا کرتا تھا جو غالباً پہلی عالمی جنگ کے بعد یہاں آکر آباد ہوا تھا۔ ۱۹۴۷ کے انقلاب کے بعد وہ اپنے وطن انگلینڈ واپس چلا گیا۔ انگریزی حکومت نے یہاں اس کو ایک بڑی زمین دی تھی۔ وہ یہاں رہتا تھا اور زمین پر کاشت کرتا تھا۔ وہاں سے گزرتے ہوئے میں نے کئی بار اس بنگلہ کو دیکھا تھا۔ اب نئے مالکوں نے اس کو توڑ کر وہاں کھیت بنا دیا ہے۔

اس وقت یہاں سڑک نہیں تھی۔ مسٹر لاری گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے بنگلہ سے ریلوے اسٹیشن پھریہا جایا کرتا تھا۔ یہ ریلوے لائن اس علاقہ میں ۱۹۰۱ میں بچھائی گئی۔ اس کا یہ راستہ ہمارے گھر کے سامنے سے گزرتا تھا۔ ہمارے گھر والے اس وقت علاقہ کے بڑے زمیندار تھے اور اسی کے ساتھ آزادی کی تحریک سے متاثر تھے۔ چنانچہ یہ بات ان کو اپنے وقار کے خلاف معلوم ہوئی کہ ایک انگریز گھوڑے پر سوار ہو کر ان کے گھر کے سامنے سے گزرے۔ ہمارے گھر والوں نے اس کو منع کیا۔ جب وہ نہیں مانا تو ایک روز اس کے گھوڑے کو روک کر اس کی پٹائی کی۔ تاہم اس نے کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی۔ اس نے صرف یہ کیا کہ آئندہ کے لئے اس نے اپنا اسٹیشن کا راستہ بدل دیا۔ اب وہ نظام آباد

کے راستہ سے ریلوے اسٹیشن جانے لگا۔ اگرچہ یہ اس کے لئے ایک لمبا راستہ تھا۔

نوجوانی کی عمر میں میں اس پر فخر کرتا تھا کہ میرے خاندان والوں نے مسٹر لاری کو گھوڑے سے اتار کر مارا۔ مگر اب میں سوچتا ہوں کہ یہ بات نہ صرف غیر انسانی تھی بلکہ غیر دانش مندانہ بھی تھی۔

مسٹر لاری ایک ترقی یافتہ قوم کا فرد تھا۔ اس کے مکان کا طرز تعمیر، اس کی زراعت کا اصول، اس کے رہن سہن کا انداز، حتیٰ کہ اس کے ردعمل کا طریقہ، ہر چیز میں لوگوں کے لئے نئی باتیں تھیں جس سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس پورے علاقہ میں اس وقت غالباً وہ واحد شخص تھا جو انگریزی داں تھا۔ ہمارے خاندان کے لوگوں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ اس انگریز سے انگریزی زبان سیکھی جائے جو زمانہ کے لحاظ سے گویا ترقیاتی دور میں داخلہ کا دروازہ تھا۔

اس کا سبب کیا تھا۔ اس کا سبب انگریزوں کے خلاف وہ نفرت تھی جو اس زمانہ کے ہندو اور مسلم دونوں لیڈروں نے پورے ملک میں پھیلا رکھی تھی۔ اس زمانہ کے ہندو اور مسلمان دونوں کے لئے انگریز کا لفظ صرف نفرت کی ایک علامت بنا ہوا تھا۔ اس نفرت کے جذبہ کو تیز کرنے کے لئے اس زمانہ کے لیڈر نئی نئی تحریکیں چلاتے رہتے تھے۔ مثال کے طور پر انگلینڈ کے کپڑوں کو جلانا۔ چنانچہ اس زمانہ میں انگلینڈ کے کپڑے خود ہمارے گاؤں میں بھی گھروں سے لے کر جلائے گئے۔ بدقسمتی سے برصغیر ہند میں پچھلے سو سال کے اندر جتنی بڑی بڑی تحریکیں چلائی گئیں وہ تقریباً سب کی سب مبنی بر نفرت تحریکیں تھیں۔ شاید ان میں سے کوئی بھی تحریک مبنی بر محبت تحریک نہ تھی۔ نفرت انسان کا سب سے زیادہ طاقتور جذبہ ہے۔ نفرت کے جذبات کو بھڑکا کر بہت تھوڑی مدت میں بہت بڑی بڑی تحریکیں چلائی جا سکتی ہیں۔ مگر اس قسم کی تحریکیں انسانیت کو تباہی کے سوا اور کچھ نہیں دیتیں۔ نفرت کی بنیاد پر اٹھائی ہوئی تحریک میں لوگ انگریز سے بھی نفرت کرنے لگتے ہیں اور انگریزی سے بھی۔

اس کے برعکس اگر محبت کی بنیاد پر تحریک اٹھائی جائے تو لوگ ایک کو دوسرے سے الگ کر کے دیکھیں گے۔ وہ انگریز کو سیاسی اعتبار سے غیر مطلوب سمجھتے ہوئے بھی ان سے انگریزی زبان سیکھیں

گے اور انگریزی علوم کو حاصل کریں گے۔ مگر بدقسمتی سے برصغیر ہند میں محبت پر مبنی کوئی بڑی تحریک اٹھائی نہیں جاسکی۔ یہی وجہ ہے کہ ہنگامہ خیز تحریکوں کے باوجود ہمارے ملک میں کوئی حقیقی تعمیری کام نہ ہوسکا۔

05

میں ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوا جس کو آج کل کی اصطلاح میں فریڈم فائٹر کہا جاتا ہے۔ میرے گھر میں رات دن آزادی کا چرچا رہتا تھا۔ ہمارے خاندان کے سرپرست مولانا اقبال احمد سہیل (وفات ۱۹۵۵ء) کٹر کانگریسی تھے۔ ۱۹۴۲ میں میری شادی ہوئی تو انھوں نے سر سے پاؤں تک مجھے کھدر کے کپڑے پہنائے تھے۔ گاندھی اور نہرو نیز حب الوطنی کے بارے میں ان کے تین شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

آنند بھون سے کیا غرض اب ہر دل ہے نشیمنِ جواہر
غلط ہے یہ کہ فقط ہندوؤں کا لیڈر تھا کہ تھا تمام جہاں بھر کا رہنما گاندھی
محبت ہے وطن کی گل زمیں سے ہمیں اب کیا غرض خلد بریں سے

اس زمانہ کے دوسرے بہت سے نوجوانوں کی طرح میں بھی آزادی کے سنہرے خواب دیکھا کرتا تھا۔ لوگوں کی باتیں سن کر آزاد ہندستان کا عجیب وغریب طلسماتی تصور میرے ذہن میں بسا ہوا تھا۔ ۱۵/اگست ۱۹۴۷ کو جب ہندستان آزاد ہوا، اس وقت میں یوپی کے شہر اعظم گڈھ میں تھا۔ رات کو میں اپنے گھر سے نکل کر شہر کے چوک کی طرف روانہ ہوا۔ چاروں طرف ایک عجیب رومانی ماحول تھا۔ ۱۵ اگست کی اس رات کو جب میں اعظم گڈھ کی سڑک پر چل رہا تھا تو مجھے وہ انوکھا تجربہ ہوا جس کو اب تک میں نے صرف افسانوں میں پڑھا تھا — خوشی سے میرے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔

اس رات کو میں نے دیکھا کہ پورا شہر (اور اسی طرح پورا ملک) چراغوں کی روشنی سے جگمگا رہا ہے۔ مگر جب صبح ہوئی تو یہ تمام چراغ بجھ چکے تھے اور اس کے بعد وہ پھر کبھی نہیں جلائے گئے۔ اب ۱۵/اگست صرف ایک سرکاری تہوار ہے، نہ کہ حقیقی معنوں میں کوئی قومی تہوار۔ کیوں کہ قوم

نے سیاسی آزادی سے جو امیدیں وابستہ کی تھیں وہ پوری نہ ہوسکیں۔

یہ احساس صرف میرا احساس نہیں، بلکہ یہی ملک کے تمام لوگوں کا احساس ہے۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہ تھوڑے سے لوگ ہو سکتے ہیں جنھیں اتفاق سے یہ موقع ملا کہ وہ ملک کی دولت کو لوٹ کر اپنے گھروں اور بینکوں میں بھرلیں۔ جن کا مسئلہ بقول ایک شخص، انکم نہیں ہے بلکہ انکم ٹیکس ہے۔

نوجوانی کی عمر میں میں آزادی کے مسرت بھرے انتظار میں جی رہا تھا۔ اب جب کہ میری عمر ہجری کلینڈر کے اعتبار سے ۸۰ سال کے قریب پہنچ رہی ہے، میں اس انتظار میں اپنی زندگی کے آخری لمحات گذار رہا ہوں کہ اپنی موت سے پہلے وہ دن دیکھ لوں جب کہ میرا ملک ترقی کی اس منزل میں اپنا قدم رکھ چکا ہو جس کا خواب ۱۹۴۷ سے پہلے ہمارے رہنماؤں نے دیکھا تھا۔

06

مجھے باہر کے کئی ملکوں میں نہایت قیمتی مواقع ملے جہاں جا کر میں ایک مطمئن زندگی گذار سکتا تھا۔ مگر میرے دل میں کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ میں اپنے وطن کو چھوڑ کر کسی اور ملک میں چلا جاؤں اور وہاں آسائش کی زندگی گذاروں۔ اپنا مادر وطن مجھے اسی طرح عزیز ہے جس طرح مجھے اپنی ماں عزیز ہے۔

اپریل ۱۹۸۳ میں جب پہلی بار میں امریکا گیا تو کسی غلط اطلاع کی بنا پر مجھے نیویارک ائیر پورٹ پر ہی پولیس کی حراست میں لے لیا گیا۔ ایک پولیس افسر جس نے اپنا نام مسٹر لوئی (Louis) بتایا تھا، وہ مجھ کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر ائیر پورٹ سے پولیس اسٹیشن لے گیا۔ اور جب واپسی کے جہاز کا وقت ہوا تو دوبارہ مجھے ائیر پورٹ پر لا کر جہاز کے اندر بٹھا دیا۔ اس نے میرا پاسپورٹ اور میرا ٹکٹ بھی مجھ کو نہیں دیا، صرف یہ کہا کہ دوران پرواز وہ مجھ کو پائلٹ کے ذریعہ مل جائے گا۔ مسٹر لوئی جس وقت مجھ کو نیویارک ائیر پورٹ سے پولیس آفس کی طرف لے جا رہے تھے، میں نے ان سے کہا کہ مسٹر لوئی، آپ کو شاید یہ اندیشہ ہے کہ میں امریکا میں رہ جاؤں گا۔ مگر میں ایک اور ڈھنگ کا آدمی ہوں، اگر آپ مجھے امریکا کا صدر بنا دیں تب بھی میں یہاں رہنے والا نہیں ہوں۔ مجھے اپنے وطن جانا ہے۔ اور

وہاں اپنے اس تعمیری مشن کو پورا کرنا ہے جس کے لئے میں نے اپنی ساری زندگی وقف کر رکھی ہے۔

۱۹۷۱ کے نصف اول میں میں نے بذریعہ ٹرین پاکستان کا سفر کیا۔ جب میں بارڈر کے دوسری طرف پہنچا تو میرے قلی نے کہا کہ آپ کو وہ میجر صاحب بلا رہے ہیں۔ اس کے بعد قلی نے مجھے ایک فوجی خیمے کے اندر پہنچا دیا۔ وہاں ایک پاکستانی فوجی افسر بیٹھا ہوا تھا۔ اس خیمے میں صرف ہم دو آدمی تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ بنگلہ دیش کی جنگ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ باوردی فوجی افسر نے مجھ سے کہا کہ انڈیا کے کچھ فوجی راز بتائیے۔ یہ سنتے ہی مجھے غصہ آ گیا۔

میں نے کہا میجر صاحب، آپ مجھ سے یہ سمجھ کر بات کیجئے کہ میں انڈیا کا ایک وفادار شہری ہوں۔ (یہ بات میں نے پاکستان کی سرزمین پر ایک فوجی خیمے میں اس وقت کہی جب کہ اگر وہ فوجی افسر مجھے گولی مار دیتا تو شاید میری موت اس طرح واقع ہو جاتی کہ اس کی کوئی خبر بھی نہ بنتی)۔

پھر میں نے کہا کہ اگر انڈیا کے ساتھ آپ کی لڑائی کا انحصار ہمارے جیسے لوگوں سے فوجی راز حاصل کرنے پر ہے تو آپ اپنی لڑائی جیت چکے۔ کیوں کہ موجودہ زمانہ میں جنگی راز اتنا ٹاپ سیکریٹ ہوتا ہے کہ بعض اوقات وزیر دفاع کو بھی اس کی خبر نہیں ہوتی۔ تقریباً آدھ گھنٹہ تک میں اس قسم کی باتیں کرتا رہا۔ اس کے بعد سلام کئے بغیر خیمے کے باہر نکل آیا۔ مذکورہ میجر مکمل خاموشی کے ساتھ میری باتوں کو سنتا رہا۔ جب میں باہر نکلا تو وہ بھی میرے پیچھے پیچھے باہر آ گیا۔ اس نے کہا: مولانا صاحب، ہم کو آپ ہی جیسے لوگوں کی ضرورت ہے۔

میری زندگی کے سیکڑوں واقعات میں سے یہ صرف چند واقعات ہیں جو بتاتے ہیں کہ مجھے اپنے وطن سے کتنا زیادہ لگاؤ ہے۔ جو ہندو مجھے قریب سے جانتے ہیں، مثلاً سوامی اوم پورن سوتنترا (نئی دہلی) یا سوامی چیدانند (رشی کیش)، وغیرہ، وہ کہتے ہیں کہ آپ کے اندر جو دیش بھکتی ہے اس کی مثال ہم نے مہاتما گاندھی کے بعد کسی اور کے اندر نہیں دیکھی۔ میرے دل کی یہی تڑپ ہے جو مجھ کو مذکورہ قسم کی باتیں کہنے پر مجبور کرتی ہے۔

۲۰ جنوری ۱۹۹۷ کو نئی دہلی میں پانیر ہاؤس میں ایک میٹنگ ہوئی۔ اس میں شہر کے اعلیٰ

تعلیم یافتہ لوگ شریک تھے۔ اس میٹنگ کا موضوع تھا—— کیا گاندھی آج کے ہندستان میں کامیاب ہوتے۔ میں نے اس موقع پر ایک لمبی تقریر کی۔ اس سلسلہ میں میں نے کہا کہ گاندھی پچھلے انڈیا میں بھی کامیاب نہیں ہوئے یہاں تک کہ ۱۹۴۷ میں انھیں خود یہ کہنا پڑا کہ: اب میری کون سنے گا۔ پھر گاندھی جب پچھلے انڈیا میں کامیاب نہیں ہوئے تو آج کے انڈیا میں وہ کس طرح کامیاب ہوتے۔ ایک ہندو پروفیسر نے میری بات سن کر کسی قدر برہمی کے ساتھ کہا کہ آپ مہاتما گاندھی پر تنقید کر رہے ہیں۔ یہ سن کر میرا دل تڑپ اٹھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے درد بھرے لہجے میں کہا:

I love Gandhi but I love India more than Gandhi

میری یہ بات سن کر پروفیسر صاحب خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد کسی نے بھی میری تنقیدی تقریر کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ میری یہ تقریر مکمل طور پر انگریزی اخبار پانیر (نئی دہلی) کے شمارہ ۲۶ جنوری ۱۹۹۷ میں چھپ چکی ہے۔

انگریزی میگزین سنڈے کے شمارہ ۱۹-۲۵ نومبر ۱۹۹۵ میں مسٹر ارُن شوری کا ایک تفصیلی انٹرویو چھپا۔ اس کے انٹرویور منی شنکر ایّر تھے۔ اس انٹرویو میں مسٹر ارُن شوری نے جو باتیں کہیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ ایک اچھے مسلمان (Good Muslim) کا ایک اچھا انڈین (Good Indian) ہونا بہت مشکل ہے۔ میں نے اس انٹرویو کو پڑھنے کے بعد مسٹر ارُن شوری کو ٹیلی فون کیا۔ میں نے کہا: یہ بتائیے کہ میں گڈ مسلم ہوں یا نہیں۔ انھوں نے کہا کہ کون کہہ سکتا ہے کہ آپ گڈ مسلم نہیں ہیں۔ میں نے کہا کہ پھر سن لیجئے کہ میں ایک گڈ مسلم بھی ہوں اور گڈ انڈین بھی ہوں۔ یہ کہتے ہوئے میری زبان سے نکلا—— اگر میں گڈ انڈین نہیں ہوں تو مہاتما گاندھی بھی گڈ انڈین نہیں تھے۔

اس واقعہ کے چند روز بعد ڈاکٹر مہیش چندر شرما (ممبر پارلیمنٹ) میرے دفتر میں ملاقات کے لئے آئے۔ میں نے ان سے مذکورہ گفتگو نقل کی۔ انھوں نے اس کو سن کر کہا: مولانا صاحب، آپ کے گڈ انڈین ہونے کے لئے کسی ارُن شوری کے سرٹیفکٹ کی ضرورت نہیں۔ آپ ایسے کسی سرٹیفکٹ کے بغیر ہی گڈ انڈین ہیں۔

میری بعض تنقیدوں کو سن کر ایک تعلیم یافتہ ہندو نے کہا کہ آپ ہمارے قومی لیڈروں کی اتنی سخت آلوچنا کرتے ہیں۔ آخر کس نے آپ کو اس کا ادھیکار دیا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ میری دیش بھکتی (حب الوطنی) سے مجھ کو یہ ادھیکار پراپت ہوا ہے۔ یہ سن کر وہ چپ ہوگئے۔

۱۹۴۷ سے پہلے کسی ہندستانی کی دیش بھکتی کا ثبوت یہ ہوتا تھا کہ وہ انگریزوں کے خلاف بولتا ہو، یہ بہت سستا معیار تھا۔ کیوں کہ اس زمانہ کے حالات میں کسی آدمی کو انگریز کے خلاف بولنے کا یہ شاندار انعام ملتا تھا کہ وہ اچانک ملک کے اندر ہیرو بن جائے۔ مگر ۱۹۴۷ کے بعد قومی تعمیر کا مسئلہ تھا۔ اور قومی تعمیر میں آدمی کو خود اپنی قوم کے خلاف بولنا پڑتا ہے۔ اس دوسرے معیار پر صرف مہاتما گاندھی پورے اترتے ہیں۔ تقسیم کے بعد پاکستان کو ۵۵ کروڑ روپیہ دینے کا سوال ایک انتہائی نازک اور حساس سوال تھا۔ اس حسّاس سوال پر مہاتما گاندھی واحد شخص تھے جو نازک قومی جذبات کے خلاف بولے۔ مہاتما گاندھی کے سوانح نگار لوئی فشر کے مطابق، مہاتما گاندھی کو جو گولی ماری گئی وہ اس معاملہ میں ان کے موقف کی قیمت تھی۔

میں سمجھتا ہوں کہ پچھلے پچاس سال کے دوران دیش کے لئے اس قسم کی نازک قربانی کی دوسری مثال صرف وہ ہے جس کی توفیق مجھے اللہ کی خصوصی مدد سے حاصل ہوئی۔ بابری مسجد کا سوال تمام مسلمانوں کے لئے وقار کا سوال بن گیا تھا۔ ٦ دسمبر 1992 کو جب مشتعل ہندوؤں کی ایک بھیڑ نے بابری مسجد کو ڈھادیا تو تمام مسلمانوں کے اندر غصہ کی آگ بھڑک اٹھی۔ جذبات سے بے قابو ہوکر وہ کچھ بھی کرنے کے لئے تیار ہوگئے۔ یہ ایک انتہائی نازک صورت حال تھی۔ لوگوں کے جذبات اتنے زیادہ بھڑکے ہوئے تھے کہ ملک کے دونوں بڑے فرقوں کے درمیان خونی ٹکراؤ کی حالت پیدا ہوگئی۔ اس وقت اپنی زندگی کا مشکل ترین رسک (risk) لے کر میں لوگوں کے سامنے آیا اور دونوں فرقوں کے سامنے یہ دو نکاتی فارمولا پیش کیا کہ ـــــ مسلمان ایک مسجد کے سوال پر چپ ہو جائیں، اور ہندو بقیہ مسجدوں کے سوال پر چپ ہو جائیں۔

یہ بات اس وقت کے ماحول میں آگ پر پٹرول ڈالنے کے ہم معنٰی تھی۔ وقتی طور پر لوگ میری

جان کے دشمن ہو گئے۔قوم کی طرف سے مجھے سخت غضبنا کی کا شکار ہونا پڑا مگر دھیرے دھیرے حالات بدلے اور لوگوں نے جان لیا کہ یہی واحد فارمولا تھا جس سے ملک کو ایک عظیم تباہی سے بچانا ممکن ہو سکا۔

07

میرے وطن اعظم گڑھ میں سب سے پہلی موٹر کار راجہ ہرکھ چند نے منگوائی تھی ۔ یہ تقریباً ستّر سال پہلے کی بات ہے۔اس کے بعد شہر کی دوسری کار وہ تھی جو ہمارے خاندان نے خریدی۔ یہ فورڈ کا پرانا ماڈل تھا۔جس کے اوپر موجودہ تھری ویلر کے مانند کپڑا ہوا کرتا تھا۔ میں اس زمانہ میں اس موٹر کار کو دیکھتا تھا اور اس پر بیٹھتا تھا۔اس کار کی حیثیت گویا ایک سائنسی واقعہ کی تھی۔مگر اس نے میرے اندر کسی بھی درجہ میں کوئی سائنٹفک تھنکنگ پیدا نہیں کی۔

یہ کار کیا تھی ، وہ امریکا کے ہنری فورڈ (وفات ۱۹۴۷) کی سرتاپا سائنسی زندگی کا ایک صنعتی نمونہ تھی۔وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ ایک سائنسی انسان کی یاد دلاتی تھی۔اسی کے ساتھ وہ فورڈ سے پہلے کے ان انسانوں کی یاد دلاتی تھی جنھوں نے اپنی زندگیاں سائنسی میدان میں وقف کردیں۔ یہاں تک کہ وہ اس قابل ہوئے کہ فطرت کے اس راز کو وہ دریافت کرسکیں کہ جامد مادہ کو کس طرح متحرک مشین میں تبدیل کیا جاسکتا ہے ۔ مذکورہ کار گویا ان باتوں کا ایک خاموش اعلان تھی۔مگر میرے ذہن میں کبھی اس قسم کے سوالات نہیں ابھرے اور نہ میں نے کبھی ان کے بارے میں جاننے کی کوئی کوشش کی۔آج میں سوچتا ہوں کہ مجھ میں اور ہنری فورڈ میں یہ فرق کیوں تھا۔ ہنری فورڈ نے اپنی پوری زندگی سائنس اور ٹکنالوجی کے مطالعہ میں صرف کردی۔اس نے اپنے رات دن کے تمام لمحات کو انھیں تجربات میں گذار دیا یہاں تک کہ وہ پہلی سب سے بڑی موٹر کمپنی بنانے میں کامیاب ہوا۔ جب کہ میرا یہ حال تھا کہ جزئی طور پر فورڈ کا ہم عصر ہوتے ہوئے میں اس قسم کے شعور تک سے بالکل خالی تھا۔اس فرق کا سبب دونوں کے ماحول کا فرق ہے۔

ہنری فورڈ ۱۸۶۳ء میں امریکا کے ایک شہر میں پیدا ہوا۔ اس وقت امریکا میں ہر طرف سائنسی اور طبیعاتی علوم کا چرچا تھا۔اس ماحول میں پرورش پانے والا ہر نوجوان کسی ارادے کے بغیر خود

بخود سائنسی باتوں سے مانوس ہو جاتا تھا۔ اس کے اندر اپنے آپ ہی سائنسی واقفیت حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو جاتا تھا۔ یہی ماحول ہے جس نے انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول کے زمانہ نے امریکا میں ہزاروں سائنس داں پیدا کئے۔ مگر میں اپنے وطن اعظم گڈھ میں اس قسم کے ماحول سے مکمل طور پر محروم تھا۔ اس محرومی کی ذمہ داری اس زمانہ کے ان رہنماؤں پر ہے جو اپنی بے شعوری کی بنا پر اس قسم کا ماحول نہ بنا سکے۔

اس زمانہ کے رہنماؤں نے ہمارے معاشرہ کا جو ماحول بنایا وہ کیا تھا — سطحی سیاست، آزادی کے کھوکھلے نعرے، ادب اور شاعری، داستان امیر حمزہ اور الف لیلیٰ جیسی کتابوں کو پڑھنا، فرضی قصے کہانیاں سننا اور سنانا، وغیرہ۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، تقریباً پورا مسلم معاشرہ ہمارے رہنماؤں کے پیدا کردہ اسی قسم کے ماحول میں جی رہا تھا۔ میرے علم کے مطابق، برصغیر ہند کا کوئی بھی گوشہ ایسا نہیں جو اس زمانہ میں اس عام صورت حال سے مستثنیٰ قرار دیا جا سکتا ہو۔

گھر کے ماحول سے نکل کر جب میں عربی اور دینی تعلیم کے لئے مدرسہ میں پہنچا تو وہاں بھی عین یہی ماحول تھا۔ حتیٰ کہ اس زمانہ میں مسلم رہنماؤں نے جدید تعلیم کے نام سے جو ادارے بنائے وہاں بھی حقیقی معنوں میں سائنسی ماحول کا کوئی وجود نہ تھا۔ پہلی بار جب میں مسلم یونیورسٹی (علیگڑھ) گیا اور وہاں ''سرسید روم'' کو دیکھا تو مجھے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ سرسید (وفات ۱۸۹۸) انیسویں صدی کے نصف آخر میں جب لندن گئے تو وہاں کی سب سے زیادہ قیمتی چیز جو انھوں نے ہندستان لانے کے قابل سمجھی وہ قدیم وضع کا ایک صوفہ سٹ تھا۔ وہاں سے وہ نہ کوئی مشین لائے اور نہ کوئی سائنسی کتاب۔

میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ زمانے میں برصغیر ہند کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے۔ اس زمانہ میں یورپ اور امریکا کے لوگ سائنسی انقلاب لانے میں مصروف تھے۔ مگر جیسا کہ عرض کیا گیا، عین اسی زمانہ میں برصغیر ہند میں اس سے بالکل مختلف چیزیں لوگوں کے ذہنوں پر چھائی ہوئی تھیں۔ آزادی کے کھوکھلے نعرے، نثر اور نظم میں خیالی مضمون بندیاں، مذہب کے نام پر سطحی بحثیں، ماضی پر فخر اور حال سے بے خبری، انسانوں سے محبت کرنے کے بجائے ان کو اپنا دشمن بتا کر ان سے نفرت کرنا،

حقائق فطرت میں جینے کے بجائے مفروضات اورتوہمات میں جینا۔یہی وہ چیزیں تھیں جو اس زمانہ میں برصغیر ہند میں عمومی طور پر چھائی ہوئی تھیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ زمانے میں مسلمانوں (نیز ہندوؤں) کے تمام مسائل کی جڑ ان کی یہی مشترک فکری پس ماندگی ہے۔اسی بات کو جواہر لال نہرو نے اپنے آخری زمانہ میں اس طرح کہا تھا کہ ہمارے دیش میں سب سے زیادہ جس چیز کی کمی ہے وہ سائنٹفک ٹمپر ہے۔ ماضی میں اگر ہمارے یہاں ایسے صاحب بصیرت لیڈر ابھرتے جو لوگوں کے اندر صحیح سوچ پیدا کرتے تو آج ہم اس کا مثبت نتیجہ پارہے ہوتے۔ اب بھی اگر کوئی امید کا پہلو ہے تو وہ یہی ہے کہ ہمارے درمیان آج ایسے رہنما ابھریں جو دوررس نظر رکھتے ہوں اور سماج کو ایسی بنیاد پر کھڑا کریں جو مستقبل کے اعتبار سے نتیجہ خیز ہو۔اس کے بغیر نہ پہلے کوئی امید کی جاسکتی تھی اور نہ آئندہ کی جاسکتی ہے۔

08

۱۹۴۶ میں یہ بات واضح ہوگئی کہ اب انڈیا کو انگریزوں سے آزاد ہونا ہے۔لوئی فشر کے بیان کے مطابق، ۵ دسمبر ۱۹۴۶ کو مہاتما گاندھی نے لکھا کہ ـــــــ اس ملک کے ہندو اور مسلمان دونوں کو امن اور میل ملاپ کے ساتھ رہنا ہے ورنہ اس کوشش میں میں اپنی جان دے دوں گا:

Hindus and Musalmans should learn to live together in peace and amity otherwise I should die in the attempt. (p.449)

یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ برصغیر ہند کی تقسیم نفرت کی بنیاد پر ہوئی۔نفرت کی یہ لہر ۱۵/اگست ۱۹۴۷ کو اچانک ختم نہیں ہوسکتی تھی۔ فطری طور پر ایسا ہوا کہ یہ نفرت اس کے بعد بھی سرحد کے دونوں طرف جاری رہی۔ بلکہ مختلف اسباب کے تحت اس میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہ بلا شبہ ملک کے مستقبل کی تعمیر کے لئے سب سے بڑا خطرہ تھا۔دو پڑوسیوں میں اگر نفرت اور عداوت کی فضا ہو تو دونوں میں سے کوئی ایک بھی ترقی نہیں کرسکتا۔مگر میرے علم کے مطابق، پورے برصغیر میں صرف ایک شخص تھا، یعنی مہاتما گاندھی جو اس حقیقت کو شعوری طور پر جانتا تھا۔اس نے اس راہ میں اپنی آخری کوشش بھی صرف کردی۔مگر مشن

کی تکمیل سے پہلے آزادی کے جلد ہی بعد ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ کو گولی مار کر گاندھی کو ہلاک کردیا گیا۔ اگلی صبح کو تمام اخباروں نے اس کو اپنی پہلی خبر بنایا۔ امرت بازار پترکا کی سرخی ان الفاظ میں تھی:

Gandhi sacrificed by fanaticism

ہندو-مسلم اتحاد، اور اسی طرح انڈیا اور پاکستان کے درمیان پرامن تعلقات بلاشبہ اس برصغیر کی سب سے بڑی ضرورت ہیں۔ اس فضا کو پیدا کئے بغیر برصغیر میں کوئی ترقی ممکن نہیں ہوسکتی، نہ ایک کے لئے اور نہ دوسرے کے لئے۔

مگر اس رخ پر ابھی تک کوئی مؤثر کوشش نہ کی جاسکی۔ مہاتما گاندھی نے اس کو اپنا آخری مشن بنا کر اپنی پوری زندگی اس کے لئے وقف کرنے کا فیصلہ کیا تھا مگر مشن کے آغاز ہی میں ان کو گولی مار کر ہلاک کردیا گیا۔ ان کے بعد میرے خیال کے مطابق، کوئی بھی قابل ذکر شخص اس خاص مقصد کے لئے نہ اٹھا، نہ ہندوؤں میں اور نہ مسلمانوں میں۔

ہندوؤں میں پنڈت جواہر لال نہرو اور مسلمانوں میں مولانا ابوالکلام آزاد اس قابل تھے کہ وہ گاندھی کے اس ناتمام مشن کو پورا کرسکیں۔ مگر ان لوگوں نے اس رخ پر کوئی سنجیدہ کوشش نہ کی۔

اگر پنڈت نہرو پرائم منسٹر نہ بنتے، اس کے بجائے وہ گاندھی کے مذکورہ مشن کی تکمیل کے لئے ایک انگریزی میگزین نکالتے۔ اسی طرح مولانا آزاد وزیر تعلیم نہ بنتے، اس کے بجائے وہ ہندو-مسلم اتحاد کے مقصد کے تحت ایک اردو میگزین جاری کرتے تو یہی دو افراد دس سال کے اندر پورے ملک میں ایک نیا فکری انقلاب لانے کے لئے کافی تھے۔

09

انسان کے لئے سب سے زیادہ تباہ کن نفسیات انتقام کی نفسیات ہے۔ انتقام کی سب سے بڑی برائی یہ ہے کہ اس کا کوئی خاتمہ نہیں۔ ہر انتقام کا دوبارہ انتقام لیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ تباہ کن سلسلہ اس وقت تک ختم نہیں ہوتا جب تک کہ خود انتقام لینے والوں کا خاتمہ نہ ہوجائے۔

۱۵ / اگست ۱۹۴۷ کو ہندستان کا بٹوارہ ہوا۔ اس بٹوارہ کے ذمہ دار بلاشبہ ہندستانی مسلمان

تھے۔ ہندستانی مسلمانوں نے مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے اتحاد پسند قائدین کو رد کردیا اور مسٹر محمد علی جناح کی قیادت میں ملک کے بٹوارے کا طوفانی مطالبہ کیا۔ ہندو قیادت نے تحریک کے آخری مرحلہ میں اس کو ناگزیر برائی (necessary evil) کے طور پر مان لیا۔

یہ ہندو ذہن کے لئے نہایت سخت صدمہ تھا۔ تاہم یہ عین ممکن تھا کہ فطرت کا خاموش عمل اس کو فراموشی کے خانہ میں ڈال دے۔ مگر پاکستان کی مسلسل حریفانہ پالیسی نے یہ نوبت نہ آنے دی کہ ہندو ذہن بٹوارے کے صدمہ کو بھلا دے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو قیادت نے بلا اعلان بٹوارہ کا انتقام لینے کا فیصلہ کیا۔ سابق مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) میں شیخ مجیب الرحمٰن کی علیٰحدگی پسند تحریک نے ہندو قیادت کو موقع دیا۔ چنانچہ اس نے شیخ مجیب الرحمٰن کا ساتھ دے کر ۱۹۷۱ میں پاکستان کے دو ٹکڑے کر دیئے۔

ہندو قائدین اگر دانش مند ہوتے تو وہ پیشگی طور پر اس حقیقت کو جان لیتے کہ مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ وہ خود بنگالیوں کے ہاتھوں بنے۔ مگر اس وقت کے ہندو قائدین کی منفی ذہنیت ان کے لئے اس حقیقت کو سمجھنے میں رکاوٹ بن گئی۔ وہ یہ جاننے سے قاصر رہے کہ بنگلہ دیش کی تحریک میں ان کی شمولیت ان کے لئے ایک بوم رینگ کھیل ثابت ہوگا۔ اور دوبارہ انتقام کا انتقام لیا جائے گا۔ مگر وہ اس حقیقت کو نہ سمجھ سکے یہاں تک کہ انتقام در انتقام کا ایک لامتناہی سلسلہ برصغیر ہند میں جاری ہو گیا۔

10

میرے بچپن کے زمانہ میں میرے وطن کے قریب مدرسۃ الاصلاح کے میدان میں ایک عمومی جلسہ ہوا۔ اطراف کے مسلمان ہزاروں کی تعداد میں امنڈ آئے۔ اس جلسہ کے خصوصی مقرر مولانا محمد علی جوہر (وفات ۱۹۳۱) تھے۔ انھوں نے اپنے مخصوص جوشیلے انداز میں تقریر کی۔ اس وقت لاوڈ اسپیکر نہیں ہوتا تھا۔ مگر مولانا محمد علی اتنے گرج دار انداز میں بولتے تھے کہ لاوڈ اسپیکر کے بغیر ہی ہزاروں آدمی ان کی بات سن سکتے تھے۔ مولانا محمد علی کی تقریر ختم ہوئی تو ایک بوڑھا مسلمان اٹھا، بھیڑ

کو چیرتا ہوا وہ اسٹیج کے پاس پہنچا۔ اس نے مولانا محمد علی کی پیٹھ پر اپنا ہاتھ مارتے ہوئے اپنی دیہاتی زبان میں کہا کہ: محمد علی، جون تیں کیہے، کیہو نہ کیہس (محمد علی، جو تو نے کیا کسی نے نہیں کیا)۔

خلافت تحریک کے زمانہ میں محمد علی اور شوکت علی کی تقریروں نے پورے ملک میں غلغلہ پیدا کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ مولانا شوکت علی نے ایک موقع پر کہا کہ: گاندھی میری جیب میں ہے۔ اس زمانہ میں مولانا محمد علی کے دبدبہ کا یہ عالم تھا کہ کانپور کے محلّہ مچھلی بازار کی مسجد کے ساتھ ۱۹۱۳ میں ایک واقعہ پیش آیا۔ اس وقت کی انگریز حکومت نے مسجد کا غسل خانہ سڑک کی توسیع کے لئے توڑ دیا۔ اس پر لیڈروں کی تقریروں نے مسلمانوں کے اندر اتنا جوش پیدا کیا کہ لوگ بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ پولس نے گولی چلائی جس میں بہت سے مسلمان مارے گئے۔

جب یہ ہنگامہ جاری تھا، مولانا محمد علی ٹرین سے سفر کر کے کانپور پہنچے۔ ریلوے اسٹیشن پر مسلمانوں کی بھیڑ ان کے استقبال کے لئے موجود تھی۔ کہا جاتا ہے کہ یوپی کا انگریز گورنر اس وقت کانپور میں تھا اور کھانے کے میز پر کھانا کھا رہا تھا۔ عین اس وقت اس کو خبر دی گئی کہ مولانا محمد علی کانپور پہنچ گئے ہیں۔ انگریز گورنر نے یہ خبر سنی تو چمچہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ مگر سوال یہ ہے کہ مولانا محمد علی کی زلزلہ خیز قیادت نے ہندستانی مسلمانوں کو کیا دیا۔ قیادت مستقبل کی تعمیر کے لئے ہوتی ہے، نہ کہ وقتی دھوم کے لئے۔ مگر میرے علم کے مطابق، مولانا محمد علی نے اپنے بعد کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی جو مثبت معنوں میں بعد کے مسلمانوں کے لئے مفید ہو۔ البتہ اپنی پر جوش طبیعت کی بنا پر انھوں نے ایسی باتیں کہیں جو مسلمانوں کے لئے آج تک مسئلہ بنی ہوئی ہیں۔

خلافت تحریک کے زمانہ میں مہاتما گاندھی بھی ان کے ساتھ ہو گئے تھے۔ اس زمانہ میں ایک بار ایسا ہوا کہ مولانا محمد علی نے دلّی کی جامع مسجد میں مسلمانوں کا ایک جلسہ کیا۔ وہ مہاتما گاندھی کو بھی اس جلسہ میں لے گئے۔ مہاتما گاندھی نے وہاں ممبر پر بیٹھ کر تقریر کی۔ یہ واقعہ مسلمانوں کی برہمی کا سبب بن گیا۔ کچھ لوگوں نے اس واقعہ کو لے کر مولانا محمد علی کو بدنام کرنا شروع کر دیا۔ یہ ایک نازک صورتِ حال تھی۔ مولانا محمد علی نے اس موقع پر اپنا دفاع اس طرح کیا کہ انھوں نے کہا: جہاں تک سیاست کا

تعلق ہے، میں مہاتما گاندھی کو اپنا لیڈر سمجھتا ہوں۔ مگر جہاں تک مذہب کا تعلق ہے تو میرے نزدیک ایک فاسق وفاجر مسلمان بھی مہاتما گاندھی سے اچھا ہے۔

ایک عام آدمی اگر اس طرح کی بات کہے تو وہ نیوز (خبر) نہیں بنتی۔ مگر جب ایک مشہور لیڈر اس قسم کی بات کہے تو وہ نیوز بن کر فوراً ہر طرف پھیل جاتی ہے۔ چنانچہ مولانا محمد علی کی اس بات پر ہندوؤں میں بہت زیادہ چہ می گوئیاں ہوئیں۔ میرے نزدیک مولانا محمد علی کا جواب درست نہ تھا۔ انھوں نے غیر ضروری طور پر بات کو اتنا پیچیدہ بنادیا۔ وہ کہہ سکتے تھے کہ اگر میں مہاتما گاندھی کو مسجد میں لایا ہوں تو میں نے کوئی غیر اسلامی کام نہیں کیا۔ خود رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں غیر مسلم مسجد کے اندر آتے تھے اور ایسے بھی واقعات موجود ہیں کہ انھوں نے مسجد کے اندر تقریر کی۔ اور اس کو کسی نے برا نہیں مانا۔

اس کے مقابلہ میں مہاتما گاندھی کا انداز دیکھئے۔ اس واقعہ کے بعد غالباً کلکتہ میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا۔ وہاں مہاتما گاندھی اور مولانا محمد علی دونوں موجود تھے۔ جب اجلاس شروع ہونے والا تھا تو اچانک ایک سنسنی خیز واقعہ ہوا۔ مہادیو ڈیسائی اچانک اسٹیج پر آئے۔ انھوں نے بلند آواز سے کہا کہ میں اجلاس کی کارروائی ہونے نہیں دوں گا۔ مولانا محمد علی نے مہاتما گاندھی کی توہین کی ہے۔ سب سے پہلے وہ یہاں آکر معافی مانگیں۔ اس کے بعد ہی جلسہ شروع ہوگا۔

مہادیو ڈیسائی کے اس پر جوش اعلان کے بعد جلسہ گاہ میں ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ لوگوں کی نظریں مولانا محمد علی پر پڑنے لگیں۔ مگر مولانا محمد علی اس کے لئے تیار نہیں ہوئے کہ وہ کھڑے ہو کر برسرِ عام معافی مانگیں۔ غالباً انھیں ڈر تھا کہ اگر انھوں نے ایسا کیا تو جلسہ گاہ سے نکلنے کے بعد مسلمان ان کا دامن پکڑیں گے اور ان کو مطمئن کرنا ان کے لئے سخت مشکل ہوگا۔

کچھ دیر یہ حالت طاری رہی۔ اس کے بعد ایک انوکھا واقعہ ہوا۔ مہاتما گاندھی جو اسٹیج پر دوسری طرف موجود تھے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور چلتے ہوئے مولانا محمد علی کے پاس پہنچے۔ انھوں نے مولانا محمد علی کے گلے میں اپنی باہیں ڈال دیں اور کہا: میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔ یہ سن کر لوگ ہنس پڑے اور جو بات بے حد سنگین نظر آتی تھی وہ ایک لمحہ میں ختم ہوگئی اور اپنے معمول کے مطابق جلسہ شروع ہوگیا۔

11

کشمیر کی متشدانہ تحریک ۱۹۷۹ کے آخر میں شروع ہوئی ۔ چند سال بعد میری ملاقات کچھ پاکستانی دانشوروں سے ہوئی ۔ میں نے کہا کہ آپ لوگ کیوں کشمیر میں خونی تحریک چلا رہے ہیں، جب کہ آپ یقینی طور پر جانتے ہوں گے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ۔ کشمیر میں جو کچھ ہوا وہ تاریخ کا ایک فیصلہ تھا، اور تاریخ کے فیصلہ کو اس قسم کے گن کلچر کے ذریعہ بدلنا ممکن نہیں ۔ انھوں نے کہا کہ ہم بھی اس حقیقت کو جانتے ہیں مگر ہم بنگلہ دیش کو بھلا نہیں سکتے ۔ ہمیں انڈیا سے ۱۹۷۱ کا انتقام لینا ہے ۔

میں نے کہا کہ آپ لوگ مسلم دانشور سمجھے جاتے ہیں مگر آپ کے اس جواب کا دانشوری سے کوئی تعلق نہیں ۔ یہ ایک جھوٹی دانشوری ہے ۔ سچی دانشوری کیا ہے ۔ اس کی ایک مثال میں آپ کو بتاتا ہوں ۔

آپ جانتے ہیں کہ امریکا نے ۱۹۴۵ میں جاپان کے اوپر پہلی بار ایٹم بم گرایا ۔ جاپان کا سب سے بڑا صنعتی شہر ہیروشیما بالکل تباہ ہو گیا ۔ یہ جاپانیوں کے لئے ایک ناقابل برداشت صدمہ تھا ۔ وہاں کے لوگوں میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی ۔ وہ ہیرا کری (خودکش بمباری) کی حد تک جا کر امریکا سے انتقام لینے کے لئے تیار ہو گئے ۔ اس وقت کچھ جاپانی دانشور اٹھے ۔ انھوں نے تقریر و تحریر کے ذریعہ اپنی قوم کی انتقامی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی ۔ انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ۱۹۴۵ میں اگر امریکا نے ہمارے ہیروشیما کو تباہ کیا ہے تو ہم بھی اس سے پہلے ۱۹۴۱ میں امریکا کے پرل ہاربر کو تباہ کر چکے تھے اس لئے معاملہ برابر ہو گیا ۔ آؤ اب ماضی کو بھلا کر ملک کا نیا مستقبل تعمیر کرنے کی کوشش کریں ۔ یہی وہ مثبت رہنمائی تھی جس کا یہ شاندار نتیجہ نکلا کہ دوسری عالمی جنگ میں تباہ ہونے والا جاپان صرف چالیس سال کے اندر ایک عالمی اقتصادی طاقت بن گیا ۔

یہ واقعہ بتا کر میں نے پاکستانی دانشوروں سے کہا کہ اگر آپ لوگوں کے اندر حقیقی دانشوری ہوتی تو جاپانی دانشوروں کی طرح آپ بھی اپنی قوم سے یہ کہتے کہ ـــــ انڈیا نے اگر ۱۹۷۱ میں ہمارے ملک کو توڑا تو ہم بھی اس سے پہلے ۱۹۴۷ میں ان کے ملک کو توڑ چکے تھے ۔ اس طرح معاملہ برابر ہو گیا ۔ آؤ اب ماضی کی باتوں کو بھلا دیں اور مثبت ذہن کے تحت ملک کے مستقبل کی تعمیر کریں ۔

پاکستان کے دانشور اگر منفی سوچ سے بلند ہوتے تو وہ وہی کرتے جو جاپانی دانشوروں نے کیا۔ وہ اپنی قوم کو انتقام کے دلدل سے نکالتے اور لوگوں کے اندر مثبت اور تعمیری ذہن پیدا کرتے۔ اگر ایسا ہوتا تو آج پاکستان بلاشبہ ایشیا کا ایک انتہائی ترقی یافتہ ملک ہوتا، نہ کہ ایک تباہ شدہ ملک جیسا کہ آج وہ دکھائی دیتا ہے۔

12

برصغیر ہند میں بہت پہلے سے ہندو-مسلم مسئلہ موجود تھا۔ ۱۹۴۷ سے پہلے مختلف نزاعات کی صورت میں اس کی مثالیں سامنے آتی رہتی تھیں۔ ہمارے رہنما برابر اس مسئلہ پر غور کرتے تھے۔ آخر کار اس معاملہ میں دو نظریئے زیادہ ابھرے۔ ایک، مہاتما گاندھی کا نظریہ۔ دوسرا، مسٹر محمد علی جناح کا نظریہ۔ مہاتما گاندھی کا حل فکری نوعیت کا تھا اور مسٹر محمد علی کا حل عملی نوعیت کا۔

مہاتما گاندھی کا کہنا تھا کہ یہ نزاعات زیادہ تر مذہبی نوعیت کے ہیں۔ مذہبی اختلافات بڑھ کر جھگڑے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کا حل ان کی سمجھ میں یہ آیا کہ لوگوں کو یقین دلایا جائے کہ مذاہب میں کوئی اختلاف نہیں۔ اسلام بھی ایک سچا مذہب ہے اور اسی طرح ہندوازم بھی ایک سچا مذہب۔ اپنے اس نظریہ کو انھوں نے ایک جملے میں اس طرح بیان کیا کہ —— رام رحیم ایک ہے۔

یہ کوئی نیا نظریہ نہیں۔ چار سو سال پہلے شہنشاہ اکبر نے سیاسی طاقت کے ذریعہ اس کو رائج کرنا چاہا۔ ڈاکٹر بھگوان داس نے مذاہب کے بارے میں اپنے انسائیکلو پیڈیائی علم کے ذریعہ اس کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔ مہاتما گاندھی نے اپنی قائدانہ مقبولیت کے ذریعہ اس کو عام کرنا چاہا۔ ونوبا بھاوے جیسی روحانی شخصیت نے اس کے لئے اپنی عمر صرف کر دی۔ مگر واقعات بتاتے ہیں کہ جہاں تک اصل مقصد کا تعلق ہے وہ ایک فیصد بھی حاصل نہیں ہوا۔

''تمام مذاہب سچے ہیں'' کا نظریہ خود مذہب کی نفی ہے۔ مذہب کا مقصد انسان کو یقین کی نعمت دینا ہے۔ یقین اپنی ذات میں توحّد چاہتا ہے، نہ کہ تعدّد۔ یقین کسی ایک ہی چیز کو حق ماننے سے پیدا ہوسکتا ہے۔ ہر چیز کو یکساں طور پر حق ماننا کبھی آدمی کے اندر یقین کی کیفیت پیدا نہیں کر سکتا۔

اس معاملہ کی ایک مثال خود مہاتما گاندھی کی زندگی میں موجود ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے عقیدے کو ''رام رحیم ایک ہے'' کے الفاظ میں بیان کرتے تھے۔ مگر ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ کو جب انھیں گولی ماری گئی تو موت سے پہلے جو آخری لفظ ان کی زبان سے نکلا وہ ''ہے رام، ہے رحیم'' نہیں تھا بلکہ صرف ''ہے رام'' تھا۔ کئی سچائی کی بات آپ ڈپلومیسی کے طور پر کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ کو سچائی پر یقین ہے تو وہ لازماً صرف ایک سچائی ہوگی نہ کہ کئی سچائیاں۔

''تمام مذاہب ایک ہیں'' کا نظریہ ایک غیر حقیقی نظریہ ہے۔ اس لئے وہ سرے سے قابل عمل ہی نہیں۔ اس قسم کے لوگ ظاہری نوعیت کی کچھ مشترک باتوں کو لے کر یہ کہنے لگتے ہیں کہ تمام مذاہب ایک ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کے درمیان انتہائی اساسی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر اسلام اور ہندوازم کو لیجئے۔ رام اور رحیم یا نوح اور منو جیسے ناموں کی لفظی مشابہت سے یکسانیت ثابت کرنا کوئی علمی استدلال نہیں۔ علمی استدلال کا طریقہ یہ ہے کہ دونوں کی اساسی تعلیمات کا موازنہ کیا جائے۔ مذکورہ استدلال ایسا ہی ہے جیسے کہا جائے کہ ہندستان اور کیوبا دونوں ایک ہیں کیونکہ یہاں بھی درخت ہیں اور وہاں بھی درخت، یہاں بھی سمندری ساحل ہے اور وہاں بھی سمندری ساحل۔

میں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میرے دل میں ہر انسان کے لئے یکساں احترام ہے، خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان۔ مگر میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ تمام مذاہب ایک ہیں، یعنی ایک مذہب کی کتاب میں جو تعلیم ہے وہی تعلیم دوسرے مذہب کی کتاب میں بھی ہے۔ اس قسم کا نظریہ یقینی طور پر ایک غیر علمی اور غیر واقعی نظریہ ہے۔

مثال کے طور پر ہندوازم میں خدا کی بابت وحدتِ وجود (monism) کا تصور ہے اور اسلام میں اس کے برعکس توحید (monotheism) کا تصور۔ توحید کے مطابق، خدا مخلوقات سے الگ ہے۔ وہ ایک مستقل ہستی کی حیثیت رکھتا ہے، جب کہ وحدت وجود میں خالق اور مخلوق کی علیٰحدگی کا کوئی تصور نہیں۔ اس کے مطابق، ہر چیز ایک ہی غیر مشخص حقیقت کا مختلف اور متنوع اظہار ہے۔ چنانچہ آپ کو

ایسے ہندو ملیں گے جو اپنا یہ عقیدہ بیان کرتے ہوئے نعوذ باللہ یہ کہیں گے کہ ”سو دیراز نو ڈفرینس بٹوین جی او ڈی اینڈ ڈی او جی“۔

اسی طرح اسلام میں پیغمبر خدا کا تصور ہے اور ہندوازم میں تجسیم خدا کا تصور۔ اسلام میں موت کے بعد جنت اور جہنم کا تصور ہے اور ہندوازم میں آواگمن کا تصور، وغیرہ۔ مزید یہ کہ ”تمام مذاہب ایک ہیں“ کا نظریہ اہل مذاہب کے درمیان ہم آہنگی کے مقصد کے لئے کسی بھی درجہ میں کارآمد نہیں۔ اس کا ایک تجرباتی ثبوت یہ ہے کہ کسی ایک مذہب کے ماننے والوں کے درمیان عملاً آج بھی یہ اعتقادی یکسانیت موجود ہے، اس کے باوجود ان کے درمیان برابر داخلی لڑائیاں جاری رہتی ہیں۔

مہابھارت کی لڑائی میں کورو اور پانڈو دونوں ہندو دھرم کو مانتے تھے۔ اس کے باوجود ان کے درمیان خونیں لڑائی ہوئی۔ پہلی اور دوسری عالمی جنگ کے دونوں فریق زیادہ تر عیسائی تھے، اس کے باوجود ان کے درمیان تاریخ کی سب سے زیادہ ہولناک جنگ ہوئی۔ افغانستان اور دوسرے مسلم ملکوں میں آج جو داخلی لڑائیاں جاری ہیں، اس کے دونوں فریق اسلام کو اپنا مذہب بتاتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ دشمنوں کی طرح ایک دوسرے کے خلاف لڑ رہے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ اس مسئلہ کا حل مذہبی یکسانیت نہیں بلکہ مذہبی رواداری ہے۔ اہل مذاہب کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کا راز باہمی اعتراف (mutual recognition) میں نہیں ہے بلکہ باہمی احترام (mutual respect) میں ہے۔ اس مسئلہ کا حل یہ ہے کہ لوگوں میں ٹالرنس کی اسپرٹ پیدا کی جائے، نہ کہ بے فائدہ طور پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جائے کہ تمام مذاہب ایک ہیں۔

اس معاملہ میں مہاتما گاندھی کا نظریہ اگر بے فائدہ تھا تو مسٹر محمد علی جناح کا پیش کردہ حل صرف الٹا نتیجہ پیدا کرنے والا تھا۔ ۱۹۴۷ سے پہلے یہ مسئلہ دو بے اقتدار کمیونٹی کے درمیان تھا، کیونکہ اس وقت سیاسی اقتدار انگریزوں کو حاصل تھا جو اپنے سیاسی مصالح کے تحت ہندوؤں اور مسلمانوں میں موازنہ قائم کرنے کا رول ادا کر رہے تھے۔ مگر مسٹر محمد علی جناح کے فارمولے کے تحت جب ہندو انڈیا

(بھارت) اور مسلم انڈیا (پاکستان) بنا تو دوکمیونٹی کا مسئلہ مزید اضافہ کے ساتھ دو اسٹیٹ کا مسئلہ بن گیا۔ پہلے جس اختلاف کا اظہار جلسوں اور مظاہروں کی سطح پر ہوتا تھا وہ اب مسلح مقابلہ کی سطح پر ہونے لگا۔ یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے وہ ''ہندو بم'' اور ''اسلامی بم'' تک جا پہنچا۔

حقیقت یہ ہے کہ جغرافی تقسیم کسی بھی درجہ میں ہندو-مسلم مسئلہ کا حل نہیں۔ اس کا حل پہلے بھی یہ تھا کہ دونوں فرقے اختلافات کو نظر انداز کرتے ہوئے باہم مل جل کر رہیں اور آج بھی اس کا حل یقینی طور پر یہی ہے۔ مزید یہ کہ اس تقسیم نے اس مساوات کو توڑ دیا جو انگریزوں نے قائم کر رکھا تھا۔ موجودہ پاکستان کے مقابلہ میں ہندستان پانچ گنا زیادہ بڑے ملک کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایسی حالت میں محاذ آرائی کی پالیسی کسی بھی درجہ میں پاکستان کے لئے مفید نہیں۔ پاکستان کے لئے زندگی کی واحد ضمانت یہ ہے کہ وہ نزاعی طریقہ کو مکمل طور پر چھوڑ دے۔ وہ یک طرفہ ایڈجسٹمنٹ کا طریقہ اختیار کرے۔ مگر بدقسمتی سے پاکستان میں کوئی بھی بے ریش یا باریش قائد نہیں جو اہل پاکستان کو اس قسم کا حقیقت پسندانہ مشورہ دے رہا ہو۔

13

ملک کی تقسیم (۱۹۴۷) کے بعد ہندستان اور پاکستان کے درمیان سیاسی جھگڑا ختم ہو جانا چاہئے تھا۔ مگر اس کے بعد بھی وہ مزید شدت کے ساتھ جاری رہا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی اصل وجہ کشمیر کا مسئلہ ہے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ خود کشمیر کا مسئلہ کس نے پیدا کیا۔ تاریخی ریکارڈ بتاتا ہے کہ اس مسئلہ کو پیدا کرنے کی سب سے بڑی ذمہ داری پاکستان کے غیر دانشمند لیڈروں پر ہے۔ اس معاملہ کا غیر جانب دارانہ جائزہ جس نتیجہ تک پہنچاتا ہے وہ یہی ہے۔

آزادی کے بعد جب یہ مسئلہ پیدا ہوا، اس وقت مسٹر مہر چند مہاجن ریاست جموں و کشمیر کے وزیر اعظم تھے۔ وہ اس سے پہلے ہندستان کے چیف جسٹس رہ چکے تھے۔ انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری لوکنگ بیک (Looking Back) میں تفصیل کے ساتھ کشمیر کا قصہ بیان کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۶۳ میں ایشیا پبلیشنگ ہاؤس (بمبئی) سے شائع ہوئی ہے۔

مسٹر مہر چند مہاجن لکھتے ہیں کہ ۱۵/اگست ۱۹۴۷ کو مہاراجہ کشمیر نے انھیں ریاست کا وزیراعظم مقرر کیا۔کشمیر کے لئے روانگی سے پہلے وہ نئی دہلی میں مرکزی حکومت کے ذمہ داروں سے ملے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس وقت ہندستانی حکمراں ہندستان سے کشمیر کے الحاق کے بارے میں زیادہ سنجیدہ نہیں تھے (صفحہ ۲۶۹)۔جسٹس مہر چند کے اس بیان کا جو مطلب ہے اس کو سمجھنا کوئی مشکل کام نہیں۔

اس سلسلہ میں دوسری شہادت جو پیش کرنا چاہتا ہوں وہ پاکستان کے سابق وزیراعظم چودھری محمد علی کی ہے۔ان کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے ظہور پاکستان (Emergence of Pakistan)۔ اس کتاب میں انھوں نے کشمیر کے مسئلہ پر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ۱۹۴۸ میں جب انڈیا نے ریاست جونا گڑھ میں اپنی فوجیں داخل کردیں اور اس کو انڈیا کے ساتھ ملالیا تو پاکستانی حکومت کی درخواست پر نئی دہلی میں ایک خصوصی میٹنگ ہوئی۔اس میں ہندستان کی طرف سے پنڈت جواہر لال نہرو اور سردار پٹیل شریک تھے۔پاکستان کی طرف سے نواب زادہ لیاقت علی خاں اور مصنف کتاب چودھری محمد علی نے شرکت کی۔

چودھری محمد علی بتاتے ہیں کہ میٹنگ شروع ہوئی تو لیاقت علی خان (وزیراعظم پاکستان) نے اس پر تقریر شروع کی کہ انڈیا نے ریاست جونا گڈھ میں اپنی فوجیں کیوں داخل کیں جب کہ اس نے پاکستان سے الحاق کرلیا تھا۔ان کی لمبی تقریر پر سردار پٹیل صبر نہ کرسکے اور درمیان میں بول اٹھے۔ چودھری محمد علی کے بیان کے مطابق ، سردار پٹیل اگر چہ متعصب تھے مگر وہ حقیقت پسند (realistic) تھے۔چنانچہ اس موقع پر انھوں نے کہا کہ جونا گڈھ کی بات چھوڑو، کشمیر اور حیدرآباد کی بات کرو۔اور ہم بہ آسانی دونوں کے بارے میں ایک ایگریمنٹ تک پہنچ سکتے ہیں:

> Why do you compare Junagarh with Kashmir? Talk of Hyderabad and Kashmir, and we could reach an agreement (p. 300)

مگر چودھری محمد علی کے بیان کے مطابق، وزیراعظم پاکستان نے سردار پٹیل کی اس پیشکش پر کوئی دھیان نہیں دیا اور گفتگو بے نتیجہ طور پر ختم ہوگئی۔

اس تاریخی شہادت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کشمیر کا مسئلہ ابتداءً اتنا سادہ تھا کہ وہ بات چیت کی میز پر حل ہورہا تھا۔ اس کے باوجود پاکستانی لیڈر کیوں اس کو حل کرنے میں ناکام رہے۔ اس کی وجہ پاکستان کے قائدین کی سیاسی حرص تھی۔ وہ عجیب وغریب طور پر اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ وہ حیدرآباد اور کشمیر دونوں کو پاکستان میں شامل کرلیں گے۔ حیدرآباد کو اس منطق سے کہ اس کا صدر ریاست مسلمان ہے۔ اور کشمیر کو اس منطق سے کہ اس کی آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ یہ ڈبل منطق یقینی طور پر ناقابل عمل تھی۔ چنانچہ اس معاملہ میں پاکستانی قائدین کا انجام وہی ہوا جس کو ایک جاپانی مثل میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ــــــ جو آدمی بیک وقت دو خرگوشوں کے پیچھے دوڑے وہ ایک کو بھی پکڑ نہیں سکتا۔

14

میرے والد فریدالدین خاں مرحوم اپنے علاقے کے بڑے زمین دار تھے۔ ان کا انتقال ۱۹۲۹ میں ہوا۔ وہ نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ ہندوؤں میں بھی اتنا زیادہ مقبول تھے کہ لوگ اپنے جھگڑوں کو طے کرنے کے لئے ان کے پاس آیا کرتے تھے۔ معاملہ کو سننے کے بعد وہ جو فیصلہ دے دیتے اس کو دونوں فریق بلا بحث مان لیتے۔ اس علاقہ میں ہندوؤں کی اکثریت تھی مگر میرے والد کی نسبت سے کبھی کوئی فرقہ وارانہ مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔

والد صاحب ایک مثالی قسم کے نیک نفس اور فیاض آدمی تھے۔ علاقہ کے ہر شخص کی خاموش مدد کرتے رہتے تھے۔ مثلاً کسی شخص کا گھر بن رہا ہے اور اس کو لکڑی کی ضرورت ہے تو کہتے کہ جاؤ فلاں درخت سے اپنی ضرورت کے مطابق لکڑی کاٹ لو۔ اسی طرح اگر کسی شخص کی شادی ہے اور اس کو غلہ کی ضرورت ہے تو اس سے کہہ دیتے کہ تم کو جتنے چاول اور دال کی ضرورت ہے ہمارے یہاں سے لے جاؤ۔ ایک مرتبہ ہمارے دروازہ سے ہندوؤں کی ایک بارات گذری اس وقت رات ہوگئی تھی اور اندھیرا چھا گیا تھا۔ والد صاحب نے کہا کہ اندھیرے میں آپ لوگ کہاں جائیں گے۔ رات کو ہمارے یہاں ٹھہریئے اور صبح کو چلے جایئے۔ اس کے بعد پوری بارات کو ٹھہرا کر سب کے لئے کھانے پینے اور سونے کا انتظام کیا۔

جھگڑوں کو طے کرنے کے لئے ان کا طریقہ بڑا عجیب تھا۔ ہمارے گاؤں کے ایک طرف ہریجنوں کا محلّہ تھا۔ ایک دن دو ہریجن خاندان آپس میں لڑ گئے۔ جھگڑا ہوتا رہا یہاں تک کہ شام ہوگئی۔ شام کو وہ لوگ اپنا جھگڑا طے کرنے کے لئے والد صاحب کے پاس آئے۔ والد صاحب نے کہا کہ جب دن بھر تم جھگڑتے رہے تو تم نے کچھ کھایا پیا بھی نہیں ہوگا۔ پہلے کھاؤ پیو اس کے بعد جھگڑا طے کیا جائے گا۔ یہ کہہ کر ان کو راشن اور لکڑی دی اور کہا کہ تم لوگ اپنا کھانا پکاؤ اور سیر ہو کر کھاؤ۔ جب وہ لوگ کھا پی کر فارغ ہوئے تو جھگڑا اپنے آپ ختم ہو چکا تھا۔ اس کے بعد وہ لوگ خوش ہو کر اپنے گھر واپس چلے گئے۔

یہ وہ ماحول ہے جو ہمارے ملک میں ۱۹ ویں صدی کے آخر اور ۲۰ ویں صدی کے آغاز میں پایا جاتا تھا۔ اس وقت نہ صرف میرے والد صاحب بلکہ عام طور پر بستیوں کے بڑے لوگ اسی مزاج کے ہوا کرتے تھے۔ یہ ماحول مسلسل باقی رہا۔ حتیٰ کہ ۱۹۴۷ کا انقلاب بھی اس ماحول کو برہم نہ کر سکا۔ ۱۹۴۷ کے بعد کے واقعات میں سے ایک واقعہ یہاں بطور مثال نقل کیا جاتا ہے۔

میرے گاؤں میں ایک مسلمان زمیں دار تھے۔ وہ عمر میں مجھ سے چھوٹے تھے۔ ۱۹۹۴ میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کی بہادری نے ان کو غیر مصالحت پسند بنا دیا تھا۔ ان کے پاس لائسنس یافتہ بندوق بھی تھی جس کو وہ اکثر اپنے ساتھ رکھتے تھے۔

ہمارے گاؤں سے ملا ہوا ایک اور گاؤں ہے جس کو بکیہ کہا جاتا ہے۔ یہاں ایک راجپوت چھتر دھاری سنگھ رہتے تھے۔ مذکورہ مسلمان زمیں دار اور چھتر دھاری سنگھ کے درمیان مال یا جائداد کا کوئی جھگڑا نہ تھا۔ مگر غالباً دونوں میں انا کا ٹکراؤ ہوا اور باہم دشمنی قائم ہوگئی۔ غالباً ۱۹۶۶ کا واقعہ ہے۔ دونوں بذریعہ ٹرین شہر اعظم گڈھ جا رہے تھے۔ دونوں کی ملاقات ریلوے اسٹیشن (سنجر پور) پر ہوئی۔ یہاں کسی بات پر دونوں کے درمیان تکرار ہوگئی۔ مسلمان زمیں دار حسب معمول اپنی بندوق اپنے ساتھ لئے ہوئے تھے۔ انھوں نے جوش میں آکر بندوق اٹھائی اور بے تکلف چھتر دھاری سنگھ پر گولی چلا دی۔ وہ فوراً ہی ہلاک ہو گئے۔

یہ خبر اچانک پورے علاقہ میں پھیل گئی۔ ہندو بہت بڑی تعداد میں چھتر دھاری سنگھ کے مکان

کے پاس جمع ہو گئے۔ یہ ہندو غصہ میں بپھرے ہوئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ فوراً ہمارے گاؤں میں پہنچیں اور نہ صرف مذکورہ مسلمان سے بلکہ پورے گاؤں سے اس کا انتقام لیں۔

ہندوؤں کی یہ مشتعل بھیڑ اگر اس وقت ہمارے گاؤں میں داخل ہوتی جو کہ بکیہ سے بمشکل ایک کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے تو یقیناً وہ لوگ پورے گاؤں کو آگ لگا دیتے۔ مگر عین اسی وقت ایک غیر معمولی واقعہ ہوا۔ مقتول چھتر دھاری سنگھ کا بھائی چتری سنگھ چٹان کی طرح ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا کہ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ ہم بدلہ ضرور لیں گے مگر سارے مسلمانوں سے نہیں بلکہ صرف اس قاتل مسلمان سے جس نے میرے بھائی کو قتل کیا ہے۔ ہمارا بدلہ بھی یہ نہیں ہوگا کہ ہم اس کے جواب میں قاتل مسلمان کو قتل کریں۔ ہم صرف یہ کریں گے کہ اس معاملہ کو عدالت میں لے جائیں گے اور وہاں قاتل مسلمان کو قانونی سزا دلوائیں گے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ مذکورہ مسلمان پر قتل کا مقدمہ چلا۔ ان کو عدالت سے لمبی قید کی سزا دی گئی۔

یہ حال صرف ہمارے علاقہ کا نہیں تھا بلکہ پورے برصغیر ہند میں ہندو اور مسلمان اسی طرح مل جل کر پرامن طور پر رہتے تھے۔ یہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس کو میری جیسی عمر کے لاکھوں لوگوں نے اس ملک میں اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس کا تجربہ کیا ہے۔ پھر سوال یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان وہ تفریقی سیاست کیسے ابھری جس کا نتیجہ ملک کا بٹوارہ (۱۹۴۷) تھا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ملک کا بٹوارہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے نہیں کروایا۔ بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے کچھ لیڈروں نے کروایا۔ یہ دو فرقوں کے عوام کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ وہ کچھ لیڈروں کا مسئلہ تھا جنھوں نے عوام کے نام پر اپنی لیڈری کو فروغ دیا۔ ہندو اور مسلمان ابتداءً اپنی فطرت پر تھے۔ فطرت کی رہنمائی عین وہی ہوتی ہے جس کی ایک جھلک مذکورہ واقعات میں نظر آتی ہے۔ اس کے بعد اخبارات کا دور آیا اور اخبارات کے ساتھ قیادتیں ابھرنے لگیں۔ اب فطرت لوگوں کی رہنما نہ رہی بلکہ لیڈران کا رہنما بن گیا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے ہماری تمام سیاسی مصیبتوں کا آغاز ہوتا ہے۔

لیڈر یا قائد کون بنتا ہے، یہ وہ افراد ہیں جن کے اندر عام لوگوں سے زیادہ ذہانت پائی جاتی

ہو۔ اور یہ تجربہ ہے کہ جو آدمی زیادہ باصلاحیت اور زیادہ ذہین ہو وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر انانیت پسند (egoist) بن جاتا ہے۔ چنانچہ ہر بڑا لیڈر لازمی طور پر انانیت پسند ہوتا ہے۔ برصغیر ہند کے لیڈروں میں اس اعتبار سے غالباً صرف ایک قابل ذکر استثنا نظر آتا ہے اور وہ مہاتما گاندھی کا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اکثر قومی المیے صرف ایک سبب سے پیدا ہوئے۔ اور وہ دو لیڈروں کے درمیان انا کا ٹکراؤ (ego clash) ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۷۱ میں مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کا ٹوٹ کر دو ٹکڑے ہو جانا زیادہ تر ذوالفقار علی بھٹو اور شیخ مجیب الرحمٰن کے درمیان اسی انا کے ٹکراؤ کا نتیجہ تھا۔ اسی طرح کشمیر کا مسئلہ بروقت طے نہ ہونے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ شیخ محمد عبداللہ اور مسٹر محمد علی جناح کے درمیان انا کا ٹکراؤ پیش آ گیا، وغیرہ۔

اس حیثیت سے برصغیر ہند کی سیاست کا مطالعہ نہایت عبرت انگیز ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ملک کا بٹوارہ ہندو۔مسلم عوام نے نہیں کیا بلکہ ہندو۔مسلم عوام کے نام پر ہندو۔مسلم لیڈروں نے کیا۔ یہ لیڈر اپنی انا کے خول سے باہر نہ آ سکے یہاں تک کہ ان کی انانیت پسندی کی قیمت ملک کو نہایت مہنگی صورت میں دینی پڑی۔

جب بھی کچھ آدمی مل جل کر رہیں گے تو ان کے درمیان لازمی طور پر کچھ ناخوشگوار واقعات پیش آئیں گے، ایک فرقہ اور دوسرے فرقہ میں بھی اور خود ایک فرقہ کے اندر بھی۔ اس قسم کی ناخوشگوار صورت حال سے بچنا سرے سے ممکن ہی نہیں۔ ایسی حالت میں سماج کے اندر اتحاد قائم رکھنے کا راز کیا ہے۔ وہ صرف ایک ہے، اور وہ اعراض (avoidance) اور ٹالرنس ہے۔ ناخوشگوار صورت حال پیدا ہونے پر اگر اعراض کا انداز اختیار کیا جائے تو اتحاد باقی رہے گا اور اگر اعراض نہ کیا جائے تو لوگوں کی انانیت بھڑکے گی اور پورا سماج اختلاف اور انتشار کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔

اس سلسلہ کی ایک علامتی مثال یہ ہے کہ مسٹر محمد علی جناح انگلینڈ جانے سے پہلے تک کانگریس میں شامل تھے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ کانگریس کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ مہاتما گاندھی اور

دوسرے لیڈروں کے ساتھ مسٹر محمد علی جناح بھی اسٹیج پر موجود تھے۔ اپنی باری پر وہ تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے تو عام مزاج کے مطابق، انھوں نے اپنی تقریر کا آغاز اسٹیج پر بیٹھی ہوئی ممتاز شخصیتوں کے نام سے کرنا چاہا۔ چنانچہ انھوں نے کہا: مسٹر گاندھی۔

یہ سن کر بعض کانگریسی بگڑ گئے۔ انھوں نے کہا کہ مہاتما گاندھی کہو، ہم مسٹر گاندھی نہیں سن سکتے۔ جناح صاحب ایک لمحہ کے لئے رکے۔ اس کے بعد انھوں نے دوبارہ تقریر شروع کی تو پھر یہی کہا کہ مسٹر گاندھی۔ اب مذکورہ کانگریسی دوبارہ اپنی مانگ لے کر کھڑے ہو گئے۔ اور انھوں نے کہا کہ مہاتما گاندھی کہو۔ اس کے بعد جناح صاحب نے اپنی تقریر روک دی۔ وہ خاموشی کے ساتھ اسٹیج سے اترے اور اپنے گھر واپس آ گئے۔

یہ بحران نہایت آسانی کے ساتھ ٹل سکتا تھا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ مہاتما گاندھی کھڑے ہو کر کہتے کہ جناح صاحب مجھ سے سینئر ہیں۔ ان کو حق ہے کہ وہ مجھ کو مسٹر گاندھی کے لفظ سے خطاب کریں۔ اگر مہاتما گاندھی بروقت ایسا کرتے تو یہ تعطل فوراً ختم ہو جاتا اور اجلاس کی کارروائی معمول کے مطابق جاری ہو جاتی۔

مگر ایسا نہیں ہوا۔ مسٹر محمد علی جناح اس واقعہ کے جلد ہی بعد لندن چلے گئے۔ کچھ عرصہ بعد وہ واپس آئے۔ اب انھوں نے کانگریس کو چھوڑ کر مسلم لیگ میں شرکت کر لی۔ جلد ہی وہ مسلم لیگ کے سب سے بڑے قائد بن گئے۔

یہ بلاشبہہ ایگو کا مسئلہ تھا۔ جناح صاحب اگر رعایت کا انداز اختیار کرتے تو وہ دوسری بار مہاتما گاندھی کہہ سکتے تھے۔ مگر جب آدمی کی انا بھڑک اٹھے تو اس کے بعد اس کے اندر سے رعایت کا ذہن ختم ہو جاتا ہے۔ وہ معاملہ کو اپنے وقار کا معاملہ بنا لیتا ہے۔ اور جہاں وقار کی نفسیات بھڑک اٹھے وہاں وہی ہوتا ہے جو عملاً ہماری تاریخ میں پیش آیا۔ (اس سلسلہ میں مہاتما گاندھی کا رویہ قابل تعریف ہے۔ چنانچہ انھوں نے جناح صاحب کو خط لکھا تو لوگوں کے اختلاف کے باوجود انھوں نے جناح صاحب کو قائد اعظم کے لفظ سے خطاب کیا)۔

اسی انانیت کی ایک مثال وہ ہے جو پنڈت جواہر لال نہرو کے یہاں پائی جاتی ہے۔ اس مثال کو مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب آزادیٔ ہند (India Wins Freedom) میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ۱۹۳۶ کے الیکشن میں ایک معاہدہ کے تحت مسلم لیگ نے کانگریس کی حمایت کی تھی۔ اس معاہدہ کا ایک جزء یہ تھا کہ یوپی کیبنٹ میں جو مسلمان وزیر بنایا جائے گا وہ مسلم لیگ کا آدمی ہوگا۔ الیکشن میں کانگریس کو بھاری جیت ہوئی۔ اس وقت جواہر لال نہرو کانگریس کے صدر تھے۔ انھوں نے فتح کے جوش میں یہ اعلان کر دیا کہ یوپی میں ہم خود اپنی پسند کی وزارت بنائیں گے۔ مسلم لیگ کا کوئی آدمی ہم اس میں شامل نہیں کریں گے۔ اس اعلان کے بعد سنجیدہ لوگوں نے جواہر لال نہرو کو سمجھانے کی کوشش کی مگر مذکورہ اعلان کے بعد وہ ان کے لئے وقار کا مسئلہ بن گیا۔ چنانچہ وہ اپنے اعلان سے پھرنے پر راضی نہ ہوئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم لیگ کے نمائندہ عبدالرب نشتر کے بجائے کانگریس کے نمائندہ حافظ محمد ابراہیم کو یوپی وزارت میں مسلمان کی سیٹ دی گئی۔

جیسا کہ معلوم ہے، ۱۹۳۶ میں کانگریس اور مسلم لیگ ایک دوسرے کے قریب آ چکے تھے اور بظاہر بٹوارہ کا معاملہ ٹل گیا تھا۔ مگر جواہر لال نہرو کی خودرائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم لیگی رہنما بھڑک اٹھے۔ وہ دوبارہ کانگریس سے دور ہو گئے یہاں تک کہ ملک دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔

حدیث میں آیا ہے کہ ہر پیدا ہونے والا فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی اور مجوسی اور نصرانی بنا دیتے ہیں (صحیح البخاری، کتاب الجنائز) اس بات کو توسیع دیتے ہوئے میں کہوں گا کہ عام انسان ہمیشہ صحیح فطرت پر ہوتے ہیں۔ پھر ان کے لیڈر ان کو بہکا کر غیر فطری راستوں پر ڈال دیتے ہیں۔

برصغیر ہند کے مسلمانوں اور ہندوؤں میں اگر وہ لیڈر نہ ابھرتے جن کا نام بدقسمتی سے ملک کی تاریخ میں ہیرو کے طور پر لکھا ہوا ہے تو یقینی طور پر ملک کا نقشہ آج سے بہت زیادہ بہتر ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر مسٹر لیڈر مسٹر ایگو ہوتا ہے، اور ہر مسٹر ایگو یہ کرتا ہے کہ اپنی ذات کی خاطر وہ پوری قوم

کو داؤ پر چڑھا دیتا ہے۔ جس سماج میں اس قسم کے لیڈر موجود نہ ہوں وہاں خدا کی پیدا کی ہوئی فطرت لوگوں کی رہنما ہوگی، اور فطرت بلا شبہ صحیح ترین رہنما ہے۔ وہ رہنمائی میں کبھی غلطی نہیں کرتی۔

15

انڈیا میں ہندو اور مسلمان کے درمیان جو مسئلہ ہے اس کا بڑا سبب سیاسی تاریخ ہے۔ یہ زیادہ تر مسلم حکمرانوں کی وراثت ہے جس کو بعد کی مسلم نسلیں بھگت رہی ہیں۔ اس کا ایک واضح ثبوت یہ ہے کہ فرقہ وارانہ کشیدگی کی یہ صورتِ حال زیادہ تر شمالی ہند میں ہے، جنوبی ہند کا علاقہ اس برائی سے اب تک پاک رہا ہے۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ مسلم حکمرانوں اور ہندو راجاؤں کے درمیان لڑائیاں زیادہ تر شمالی ہند میں ہوئیں۔ جنوبی ہند کا علاقہ بڑی حد تک اس قسم کی خونیں داستانوں سے محفوظ رہا۔

ہندوؤں کی باتیں سننے یا ان کی کتابیں پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں انھیں سب سے زیادہ شکایت مسلم حکمرانوں سے ہے، خاص طور پر اورنگ زیب سے۔ مثلاً ان حکمرانوں کا یہ فعل کہ انھوں نے اپنے دور حکومت میں کئی مندروں کو توڑا اور اس کی جگہ مسجدیں بنائیں۔ جہاں تک اس الزام کی تاریخی حیثیت کا تعلق ہے تو اس سے انکار کرنا مشکل ہے۔ یہاں میں اس سلسلہ میں صرف ایک حوالہ دیتا ہوں۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی (وفات ۱۹۹۹) کے والد مولانا حکیم عبدالحیؒ (وفات ۱۹۲۳) کی ایک کتاب ہے۔ یہ کتاب مجلس تحقیقات ونشریات اسلام (ندوہ، لکھنؤ) سے ۱۹۷۳ میں شائع کی گئی ہے۔ اس کتاب کا نام ہے ''ہندوستان اسلامی عہد میں''۔ اس کتاب کے ساتھ مولانا ابوالحسن علی ندوی کا ۲۴ صفحات پر مشتمل ایک مبسوط مقدمہ شامل ہے۔ مولانا نے اپنے اس مقدمہ میں مذکورہ کتاب کو مسلم عہد کے ہندستان کی صحیح تصویر اور مکمل دستاویز قرار دیا ہے۔ (صفحہ ۱۷)

اس کتاب میں، بابری مسجد سمیت کئی مسجدوں کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ مندروں کو توڑ کر عین اسی جگہ بنائی گئیں۔ مثلاً بابری مسجد کی بابت اس کتاب میں یہ الفاظ درج ہیں: کہا جاتا ہے کہ سیتا کا یہاں ایک مندر تھا، جہاں وہ رہتیں، اور اپنے شوہر کے لئے کھانا پکاتی تھیں، اسی جگہ بابر نے ۹۲۳ھ میں یہ مسجد تعمیر کی۔ (صفحہ ۱۴۱)

اس کتاب میں اس طرح کی متعدد مسجدوں کا تذکرہ ہے جو ہندو عبادت گاہوں کی جگہ بنائی گئیں۔ مثلاً ''عالمگیری مسجدیں'' کے زیرعنوان بتایا گیا ہے: کہا جاتا ہے کہ بنارس کی مسجد عالمگیر نے بنارس کے بشیشور مندر کی جگہ بنائی تھی۔ وہ مندر بہت بلند اور ہندوؤں میں مقدس تھا، اس نے اس کی جگہ انھیں پتھروں سے بلند مسجد تعمیر کی اور اس کے قدیم پتھر کو دیواروں میں معکوس کرکے نصب کردیئے۔ (صفحہ ۱۴۶)

اس قسم کے واقعات جو مغل عہد میں پیش آئے ان کے بارے میں ہندو مصنفین اور مسلم مصنفین دونوں عام طور پر غیر منصفانہ انداز اختیار کرتے ہیں۔ ہندو مصنفین عام طور پر ان واقعات میں اضافہ کرکے ان کو مزید سنسنی خیز انداز میں پیش کرتے ہیں۔ دوسری طرف مسلم مصنفین یا تو ان کو گھٹا کر پیش کرتے ہیں یا سرے سے ان کی واقعیت کا انکار کردیتے ہیں۔ مگر یہ دونوں ہی طریقے اس معاملہ میں غیر مفید ہیں۔

اس معاملہ کے تصفیہ کے لئے کوئی سنجیدہ کوشش نہ ۱۹۴۷ سے پہلے کی گئی اور نہ ۱۹۴۷ کے بعد۔ ضرورت تھی کہ اس مسئلہ پر ایک مستقل کمیشن بنایا جاتا جو ہندو مورخین اور مسلم مورخین پر مشتمل ہوتا۔ وہ اس قسم کی نزاعی عبادت گاہوں کا جائزہ لے کر باضابطہ رپورٹ پیش کرتا اور قانون اور شریعت کی روشنی میں اس کا حل بتاتا۔ اس کے بعد ہندو اور مسلمان دونوں طرف کے ذمہ داروں کے دستخط سے ایک معاہدہ کیا جاتا اور آربٹریشن ایکٹ کے تحت اس پر عدالتی تصدیق حاصل کرلی جاتی۔ اس طرح یہ مسئلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوسکتا تھا۔ مگر بدقسمتی سے اس نوعیت کی کوئی مؤثر کوشش اس معاملہ میں نہ کی جاسکی۔

16

۱۹۴۷ میں جب ہندستان ایک آزاد ملک بنا، اس وقت ملک کے باشندوں کی تعداد ۳۶ کرور تھی۔ اس وقت وزیراعظم پنڈت جواہرلال نہرو نے کہا کہ ہندستان کا ہر آدمی ایک مسئلہ ہے، اس طرح ہندستان ۳۶ کرور مسائل سے دوچار ہے۔ پنڈت نہرو نے یہاں کے باشندوں کو مسائل کے روپ

میں دیکھا۔ اس لئے ان کے بارے میں وہ صحیح منصوبہ بندی نہ کرسکے۔ اگر وہ ان باشندوں کو اثاثہ (asset) کے روپ میں دیکھتے تو ان کی منصوبہ بندی بالکل مختلف ہوتی۔

ہندستانی باشندوں کو اثاثہ کے روپ میں دیکھنے کے بعد ان کے اندر یہ سوچ ابھرتی کہ ملک میں ایسے اسباب پیدا کئے جائیں کہ یہ لوگ اس میں اپنا استعمال پاسکیں۔ ہر انسان پیدائشی طور پر ایک ہیرو ہوتا ہے لیکن اس کو اپنے ہیروانا کردار کو ادا کرنے کے لئے موافق خارجی اسباب کی ضرورت پڑتی ہے۔ اگر اس قسم کے خارجی اسباب حاصل ہوں تو ہر آدمی اس کے اندر عمل کرکے ہیرو بن جائے گا۔ اور اگر موافق اسباب نہ ملیں تو یہی انسان زیرو کے روپ میں دکھائی دینے لگے گا۔

اس معاملہ کی ایک عملی مثال خود ہندستانی باشندوں کی صورت میں موجود ہے۔ یہ لوگ جب اپنے ملک میں ہوتے ہیں تو عام طور پر وہ کوئی بڑا کام نہیں کر پاتے۔ لیکن جب یہی لوگ امریکا اور یورپ کے ترقی یافتہ ملکوں میں جاتے ہیں تو اچانک وہاں وہ ہیرو کی طرح کام کرنے لگتے ہیں۔

مثال کے طور پر ہرگوند کھورانا جب ہندستان میں تھے تو یہاں وہ کوئی کارنامہ انجام نہ دے سکے۔ انھوں نے دلی یونیورسٹی میں لیکچرشپ کے لئے درخواست دی مگر وہ یونیورسٹی میں اس عہدہ کے لئے نااہل سمجھے گئے۔ اس کے بعد مسٹر کھورانا امریکا چلے گئے۔ وہاں انھیں ہر قسم کے علمی اور سائنسی مواقع ملے جس میں وہ اپنی صلاحیتوں کا استعمال پاسکیں۔ اب انھوں نے محنت شروع کردی۔ اس کے بعد یہی ہرگوند کھورانا ممتاز سائنسی پروفیسر بن گئے۔ اور آخر کار اپنی غیر معمولی تحقیقات کے نتیجہ میں انھیں نوبل انعام سے سرفراز کیا گیا۔

میں نے اپنے بیرونی سفروں کے درمیان کئی ہندستانیوں سے پوچھا کہ آپ لوگ باہر آ کر جس محنت اور لگن کے ساتھ کام کرتے ہیں، اسی محنت اور لگن کے ساتھ انڈیا میں کام کریں تو وہاں بھی آپ بڑی بڑی ترقیاں حاصل کرسکتے ہیں۔ ان ہندستانیوں میں سے تقریباً ہر ایک نے میری رائے سے اتفاق کیا۔ مگر انھوں نے کہا کہ انڈیا میں اور ان ترقی یافتہ ملکوں میں ایک بہت بڑا فرق ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ یہاں جب ہم کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہر طرف ہمارے لئے

راستے کھلے ہوئے ہیں۔ ایک طرف یہ کہ جب ہم اپنا کوئی منصوبہ لے کر اٹھتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی تکمیل کے تمام ضروری اسباب بہترین طور پر یہاں موجود ہیں۔ دوسری طرف یہ کہ یہاں جب ہم محنت کرتے ہیں اور اپنی صلاحیتوں کو لگاتے ہیں تو ہم کو یقین ہوتا ہے کہ ہمیں اس کی پوری قیمت ملے گی۔ جب کہ انڈیا میں ان دونوں میں سے کوئی بھی چیز موجود نہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اپنے وطن میں اگر یہ دونوں چیزیں ہمیں مل جائیں تو شاید ہم میں سے کوئی بھی شخص بدیش میں رہنا پسند نہ کرے۔

پانی کے بہاؤ کے لئے پانی کو دھکیلنا نہیں پڑتا۔ پانی اپنے آپ بہتا ہے۔ اگر آپ پانی کو جاری کرنا چاہیں تو صرف یہ کیجئے کہ اس کے لئے راستہ بنا دیجئے۔ اس کے بعد پانی اپنے آپ بہنے لگے گا۔ یہی معاملہ انسان کا بھی ہے۔ انسان خود اپنی فطرت کے مطابق، ترقی کی طرف دوڑنا چاہتا ہے۔ اگر اس کو نظر آئے کہ یہاں میرے لئے مواقع موجود ہیں تو وہ اپنے آپ ترقی کی منزل کی طرف رواں دواں ہو جائے گا۔

آزادی کے بعد ہمارے سیاسی لیڈروں کو صرف یہ کرنا تھا کہ وہ ملک میں ترقیاتی سرگرمیوں کے لئے وہ اسباب مہیا کریں جن کو موجودہ زمانہ میں انفراسٹرکچر کہا جاتا ہے ــــ ملک میں وقت کے معیار کے مطابق، اچھی سڑکیں بنائیں، بجلی اور ٹیلی فون کا عمدہ نظام قائم کریں، ہر بستی میں ٹرانسپورٹ کی قابل اعتماد سہولتیں مہیا کریں۔ ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک کے لئے اچھے ادارے بنائیں۔ ہر جگہ معیاری لائبریریاں قائم کریں۔ دیہاتوں میں بھی کام کی وہی سہولتیں مہیا کریں جو شہروں میں پائی جاتی ہیں، وغیرہ۔

اسی کے ساتھ ان کو یہ کرنا تھا کہ وہ ملک میں ایسی انتظامیہ (ایڈمنسٹریشن) قائم کریں جہاں رشوت اور بدعنوانی کے بغیر ہر کام ہو سکے۔ ہر شہری کو یہ یقین ہو کہ وہ ایک ایسے نظام کے تحت جی رہا ہے جہاں اس کا جائز حق اس کو ملے گا، اس کا حق کبھی مارا نہیں جائے گا۔ ہر ایک کو پیشگی طور پر یہ اطمینان حاصل ہو کہ اگر اس نے اہلیت اور قابلیت کا ثبوت دیا تو ضرور وہ اس کی قیمت پائے گا۔ ہر ایک کو یہ

اعتماد ہو کہ اگر اس کے ساتھ کوئی بے انصافی ہوئی تو وہ عدالت میں جا کر وہاں سے بھر پور انصاف حاصل کر سکتا ہے۔ ہر ایک پیشگی طور پر یہ یقین رکھتا ہو کہ میں ایک ایسے نظام کے تحت جی رہا ہوں جس میں ہر ایک برابر کی حیثیت رکھتا ہے، عزت کے اعتبار سے بھی اور حقوق کے اعتبار سے بھی۔ بمبئی کے ایک تاجر مہیش بھائی شاہ نے بجا طور پر کہا: سرکار کا کام دھندا کرنا نہیں ہے، سرکار کا کام دھندا کرنے والوں کو اوسر مہیا کرنا ہے۔

اس قسم کا نظام کوئی یوٹوپیا نہیں، وہ عملاً آج بھی ان ملکوں میں قائم ہے جن کو ترقی یافتہ ملک کہا جاتا ہے۔ یہی وہ اصل کشش ہے جو لاکھوں ہندستانیوں کو مجبور کر رہی ہے کہ وہ اپنا وطن چھوڑ کر ان بدیشی ملکوں میں چلے جائیں۔ آزادی کے بعد ہمارے حکمرانوں کا اصل کام یہی تھا کہ وہ انڈیا کو اسی قسم کے مواقع اور انفراسٹرکچر والا ملک بنائیں۔

اس کے بعد ہمارے حکمراں دیکھتے کہ وہ کروڑوں ہندستانی جن کو انھوں نے بطور خود مسئلہ فرض کر رکھا ہے وہ ملک کے لئے قیمتی اثاثہ اور سرمایہ ہیں۔ مگر ملک کی آزادی کے بعد ہمارے حکمرانوں نے قیمتی پچاس سال بے فائدہ سرگرمیوں میں کھودیئے۔ مثلاً نان الائنڈ مومنٹ کھڑی کرنا، پبلک سیکٹر بنانا، مالیاتی اداروں کو نیشنلائز کرنا، قوانین میں اضافہ کرنا، وغیرہ۔ وہ اسی قسم کی بے فائدہ سرگرمیوں میں مشغول رہے اور آخر کار ہمارے حصہ میں ایک برباد ملک کے سوا اور کچھ نہ آیا۔

۱۸ ستمبر ۱۹۹۸ کو ایک صاحب سے گفتگو ہوئی۔ وہ دہلی کے ایک بزنس گروپ میں بڑے افسر ہیں۔ انھوں نے گفتگو کے دوران کہا کہ ہندستان پچھلے پچاس سال میں بہت زیادہ ترقی کر چکا ہوتا مگر ایک چیز نے اس کی ترقی کو روک دیا اور وہ سرکاری قانون قاعدے کی بھرمار ہے۔ ہم لوگ جو بزنس کرتے ہیں، ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ ہم کوئی بھی چھوٹا یا بڑا کام سرکاری منظوری کے بغیر نہیں کر سکتے، حتیٰ کہ لبرلائزیشن کے بعد بھی نہیں۔

انھوں نے کہا کہ نہرو کے زمانہ میں جو سوشلسٹ اسکیم چلائی گئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر کام میں سرکاری افسروں اور سرکاری اداروں کا دخل ہو گیا۔ جو لوگ ان دفتروں میں قلم لئے ہوئے بیٹھے تھے

انھوں نے محسوس کیا کہ ان کے دستخط کے بغیر کوئی بڑے سے بڑا آدمی بھی کچھ نہیں کرسکتا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی منظوری کی قیمت وصول کرنا شروع کردیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارا سماج رشوت کا جنگل بن گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں ملک ترقی نہیں کرسکتا۔

میں نے کہا کہ ہمارے ملک میں گاندھی اور نہرو کو سب سے اونچا درجہ حاصل ہے۔ مگر میرے نزدیک یہی دونوں شخصیتیں ہیں جنھوں نے ملک کی آزادی کو بربادی میں تبدیل کردیا ہے۔ گاندھی کا عدم تشدد کا ہتھیار عملاً ملک میں لاقانونیت کو فروغ دینے کا سبب بنا، اور نہرو کے سرکاری کنٹرول نے سارے ملک کو رشوت اور بدعنوانی کی جال میں اس طرح پھنسا دیا کہ اب بظاہر اس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔

17

تقسیم (۱۹۴۷) کے بعد سرحد کے دونوں طرف ملک کی تعمیر نو کے نام پر دو مختلف تحریکیں چلائی گئیں۔ ہندستان میں اس تحریک کا عنوان تھا: سوشلسٹک پیٹرن آف سوسائٹی۔ اور پاکستان میں اس تحریک کا عنوان تھا: اسلامک پیٹرن آف سوسائٹی۔ نام کے اعتبار سے دونوں تحریکیں بظاہر ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے دونوں کا انجام ایک ہوا۔ اور وہ یہ کہ دونوں ہی تحریکیں کسی تعمیری انجام تک نہ پہنچ سکیں۔

جنوری ۱۹۵۵ میں آوڈی (مدراس) میں کانگریس کا ڈائمنڈ جوبلی سشن ہوا۔ اس سشن میں اس وقت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی قیادت میں متفقہ طور پر یہ رزولیوشن پاس ہوا کہ ہندستان میں سوشلسٹ طرز کا سماج بنایا جائے گا۔

میں اول دن سے اس نظریہ کا مخالف تھا۔ میں نے اس کے بعد ہی اس موضوع پر ایک کتاب کی تیاری شروع کردی۔ سوشلزم اور مارکسزم کو سمجھنے کے لئے میں نے دس ہزار سے زیادہ صفحات پڑھے۔ اس کے بعد میں نے وہ کتاب لکھی جو پہلی بار اپریل ۱۹۵۹ میں چھپی۔ اس کتاب کا نام تھا۔ مارکسزم تاریخ جس کو رد کرچکی ہے:

Marxism— a rejected ideology.

پنڈت جواہر لال نہرو اس وقت پورے ملک کے واحد سب سے بڑے لیڈر تھے۔ انھوں نے اپنی پوری طاقت اس تجویز کو زیر عمل لانے میں لگادی۔ پانچ سالہ منصوبے وضع کیے گئے۔ پبلک سکٹر (صحیح تر لفظ میں گورنمنٹ سکٹر) کے نام سے دیو پیکر صنعتی ادارے قائم ہوئے۔ ہزاروں کی تعداد میں ایکٹ اور ضابطے بنائے گئے۔ یوجنا بھون اور وکاس بھون جیسے ناموں سے بہت سی ہمالیائی عمارتیں کھڑی کی گئیں۔ ملک کی پوری اقتصادیات کو براہ راست یا بالواسطہ طور پر گورنمنٹ کے کنٹرول میں لے لیا گیا۔ ان سارے رومانوی منصوبوں کو وقوع میں لانے کے لئے ملک کے اوپر بھاری ٹیکس لاد دیئے گئے۔ اس نام نہاد ''سوشلسٹ ماڈل'' کے اوپر ملک ۴۰ سال سے زیادہ مدت تک چلتا رہا۔

مگر اس انتہائی مہنگے منصوبے کا جو نتیجہ نکلا اس کو سی راج گوپال اچاری نے لائسنس پرمٹ راج کا نام دیا تھا۔ تاہم راج گوپال اچاری (وفات ۱۹۷۲) یہ دیکھنے کے لئے زندہ نہ رہے کہ نہرو کا لائسنس پرمٹ راج مزید ترقی کر کے لیتھارجی اور کرپشن کا راج بن گیا۔ نام نہاد نیشنلائزیشن کے نظام نے لوگوں کو عمومی طور پر کاہل بنادیا۔ زندگی کے تمام شعبوں کو سرکاری آدمیوں کے ہاتھ میں دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طرف ناقابل بیان حد تک رشوت اور کرپشن کا بازار گرم ہو گیا۔

نہرو کے سوشلسٹ نظام نے ملک میں بے شمار کلرکوں کی ایک فوج بنائی اور پھر قوم کو کلرکوں کی اس بے رحم فوج کے حوالہ کر دیا۔ نئے نظام کے تحت ان کو اتنے اختیارات حاصل تھے کہ ہر کلرک گویا کہ ایک گورنر تھا۔

اس سوشلسٹ نظام نے ملک کو طرح طرح کے مہلک نقصان پہنچائے۔ مثلاً اس نظام کے نتیجہ میں ٹریڈ یونین جیسی تحریکیں وجود میں آئیں جنھوں نے پورے کارکن طبقہ کو اور آخر کار پورے سماج کو ڈیوٹی کے بجائے حقوق پر نظر رکھنے والا بنادیا۔ اس طرح ملکی صنعت کی ترقی کے نام پر اس کو غیر فطری تحفظ دیا گیا۔ اس کے نتیجہ میں ملک کا مارکیٹ غیر معیاری سامانوں سے بھر گیا۔

اس سے بھی زیادہ بڑا نقصان یہ ہوا کہ اسمگلنگ کا جال سارے ملک میں پھیل گیا۔ حوالہ سسٹم کی صورت میں کرنسی کی ایک ایسی غیر قانونی تجارت وجود میں آگئی جو قانونی مالیاتی اداروں کے حجم سے

بھی زیادہ بڑی تھی۔ اس کے نتیجہ میں کھربوں کی بیرونی کرنسی ملک میں داخل ہوئے بغیر باہر ہی باہر فروخت ہوگئی۔

۲ جولائی ۱۹۹۸ کو حبیب محمد صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ حیدرآباد کے ایک تاجر ہیں۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ میں ایک صنعتی ادارہ چلاتا ہوں۔ اس کو چلانے کے لئے مجھے تقریباً ۴۵ سرکاری کھڑکیوں (windows) پر کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ ان میں سے ہر ونڈو مجھے پرسیکیوٹ کرنے کا اختیار رکھتی ہے۔ اس صورت حال نے مجھے اتنا پریشان کیا کہ اب میں نے اپنا کاروبار تقریباً ختم کردیا ہے۔

اس کے بعد انھوں نے کہا کہ حال میں میں امریکا گیا تھا۔ وہاں میں ایک مہینہ رہ کر واپس آیا ہوں۔ وہاں میں نے دیکھا کہ حکومت نے اپنے شہریوں کو ہر قسم کی سہولت دے رکھی ہے۔ آپ کو کسی سرکاری ونڈو پر لائن لگانے کی ضرورت نہیں۔ وہاں کھلا مقابلہ ہے۔ وہاں آپ کو صرف ایک کام کرنا ہے۔ مقابلہ میں اپنے آپ کو اہل ثابت کیجئے اور جتنی چاہے ترقی کرتے چلے جایئے۔ انھوں نے کہا کہ اب میں نے طے کیا ہے کہ اپنے بچہ کو امریکا بھیج کر وہاں سٹل کراؤں۔

حبیب محمد صاحب کی یہ گفتگو سن کر مجھے ۳۵ سال پہلے کا ایک واقعہ یاد آیا۔ میرے بھائی عبدالعزیز خاں مرحوم جو یوپی میں ایک تجارتی ادارہ چلاتے تھے، وہ اپنے کسی کام کے لئے اسی قسم کی ایک سرکاری ونڈو پر گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ ونڈو کے پیچھے بیٹھے ہوئے کلرک نے کچھ رعونت دکھائی۔ اس پر میرے بھائی نے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ یہاں کے گورنر ہیں۔ ونڈو کے پیچھے سے ایک متکبرانہ آواز آئی — اس میں کیا شک ہے، اس آفس میں تو میں ہی گورنر ہوں۔

یہ تھا وہ پرعذاب اور ترقی شکن نظام جو جواہر لال نہرو اور ان کے سوشلسٹ ساتھیوں نے اس ملک میں قائم کیا۔ نہرو کے ذہن میں نوجوانی کی عمر سے ایک سوشلسٹ خواب تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندستان کی حکومت پر قبضہ کرکے یہاں کی تمام چیزوں کو سرکاری کنٹرول میں لے لیں اور پھر حکومتی طاقت سے ایک نیا انڈیا بنائیں۔ اس خودساختہ نئے انڈیا کی تعمیر کے لئے وہ اتنا زیادہ بے تاب تھے کہ اس کے قیام کا جلد موقع حاصل کرنے کے لئے انھوں نے ملک کی تقسیم کو منظور کرلیا۔ مگر آزادی

کے بعد جب ان کا نام نہاد سوشلسٹ نظام قائم ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ صرف ایک ایسا مصنوعی نظام تھا جس نے بے رحم شکنجہ بن کر خود ترقی کے عمل ہی کو روک دیا۔

۱۹۹۲ میں بابری مسجد کے ڈھائے جانے سے پہلے اس وقت کے وزیر اعظم نرسمہا راؤ نے مجھے بابری مسجد کے بارے میں بات چیت کے لئے بلایا تھا۔ پرائم منسٹر ہاؤس میں جب ان سے میری ملاقات ہوئی تو میں بے اختیار رو پڑا۔ میں نے کہا کہ بابری مسجد کو بچانے سے بھی بڑا مسئلہ ملک کو بچانا ہے۔ جواہر لال نہرو کے نام نہاد سوشلزم نے ملک کو تباہی کے آخری کنارے پر پہنچا دیا ہے۔ آپ اگر کچھ کر سکتے ہیں تو اس اقتصادی عذاب سے ملک کو نجات دیجئے۔ اس کے بعد لبرلائزیشن کا وہ واقعہ وجود میں آیا جس کو عام طور پر ڈاکٹر من موہن سنگھ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جو اس وقت کی نرسمہا راؤ گورنمنٹ میں وزیر مالیات تھے۔

سوشلسٹ ماڈل کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ اس عالم اسباب میں قابل بقا (sustainable) نہ تھا۔ اس کے لئے ہندستان میں بھی اسی طرح ٹوٹنا مقدر تھا جس طرح وہ سوویت یونین میں ٹوٹ گیا۔ کسی ملک کی سب سے بڑی خوش قسمتی یہ ہے کہ اس کو ایسے دور اندیش لیڈر ملیں جو قوم کو ایسا نظام دے سکیں جو قابل بقا ہو۔ کسی بھی نظام کا پورا نتیجہ ''نصف صدی'' میں نکلتا ہے۔ اگر نصف صدی گزرنے کے بعد یہ معلوم ہو کہ چلایا جانے والا منصوبہ بے نتیجہ رہا تو نصف صدی کھو کر قوم کو اپنا سفر از سر نو پیچھے سے شروع کرنا پڑے گا۔

18

پاکستان کے قیام کے بعد وہاں جو نشانہ اختیار کیا گیا وہ بظاہر ایک صحیح نشانہ تھا، یعنی اسلامک پیٹرن آف سوسائٹی کا قیام۔ مگر نتیجہ کا برعکس صورت میں نکلنا بتاتا ہے کہ اس نعرہ میں کوئی بنیادی غلطی تھی اس لئے اس معاملہ کا بے لاگ جائزہ ضروری ہے تا کہ اس نقصان کا کم سے کم وہ فائدہ ہو جس کو فارسی شاعر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: من نکردم شما حذر بکنید۔ تا کہ اس تجربہ سے اگر کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا تو کم از کم اس کے سبق سے بعد کے لوگ محروم نہ رہیں۔

جیسا کہ معلوم ہے، مولانا شبیر احمد عثمانی (وفات ۱۹۴۹) پاکستان کے سرگرم حامیوں میں سے تھے۔ پاکستان کے قیام کے بعد وہ کراچی چلے گئے۔ پاکستان میں جو دستور ساز اسمبلی بنائی گئی اس کے وہ ایک اہم رکن تھے۔ دستور ساز اسمبلی کے ممبر کی حیثیت سے انھوں نے داخلی طور پر اپنا پورا زور اس پر ڈال دیا کہ پاکستان کا دستور اسلامی اصولوں پر بنایا جائے۔ داخلی اعتبار سے مولانا شبیر احمد عثمانی کی کوشش اور خارجی اعتبار سے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (وفات ۱۹۷۹) اور دوسرے علماء کی تقریری اور تحریری مہم کا یہ نتیجہ ہوا کہ ۱۹۴۸ میں دستور ساز اسمبلی نے قرارداد مقاصد (objectives resolution) کو منظوری دے دی۔ اس قرارداد مقاصد کے الفاظ شریعت کی روشنی میں وضع کئے گئے تھے۔ اس کا استقبال مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے یہ کہہ کر کیا کہ پاکستان کی ریاست نے اب کلمہ پڑھ لیا ہے۔ حالانکہ زیادہ صحیح یہ تھا کہ وہ اعلان کرتے کہ ہم پاکستانیوں کے دلوں پر تو اسلام نہ لکھ سکے البتہ ہم نے اسمبلی کے کاغذ پر اسلام کا نام تحریر کر دیا ہے۔

اس کے بعد نفاذ شریعت کے حصول کی مہم شروع ہوئی۔ اس مہم کے نتیجہ میں پاکستان دو طبقوں میں بٹ گیا۔ ایک حکمراں طبقہ اور دوسرا غیر حکمراں طبقہ۔ حکمراں طبقہ تقریباً سب کا سب سیکولر ذہن کا تھا۔ وہ سیکولر نظام بنانے کا حامی تھا۔ دوسری طرف غیر حکمراں طبقہ اسلامی شریعت کے نفاذ کا مطالبہ کر رہا تھا۔ اس کے نتیجہ میں دونوں طبقوں کے درمیان زبردست ٹکراؤ ہوا۔ وزیر اعظم لیاقت علی خان قتل کئے گئے۔ ذوالفقار علی بھٹو کو وزارت عظمیٰ سے ہٹا کر پھانسی دی گئی۔ جلسوں اور مظاہروں کے دوران بہت سے لوگ زخمی ہوئے یا مارے گئے۔ اس ہنگامہ خیز سیاست کے نتیجہ میں پاکستان میں اقتصادی ترقی کا عمل ٹھپ ہو کر رہ گیا۔

اسلام کے نام پر جو پرشور سیاست پاکستان میں چلائی گئی اس کا آخری نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان میں نہ سیکولر نظام قائم ہوا اور نہ اسلامی نظام۔ بلکہ ان دونوں کے سوا ایک تیسری چیز ظہور میں آئی، اور وہ تھی خانہ جنگی اور انارکی۔

کیوں ایسا ہوا کہ اسلام کے نام پر چلائی جانے والی مہم کا نتیجہ غیر اسلام کی صورت میں برآمد

ہوا۔ اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ اسلامی نظام کے نام پر پاکستان میں جو پرشور تحریک چلائی گئی وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک جذباتی ہنگامہ تھا، نہ کہ صحیح معنوں میں کوئی سوچی سمجھی تحریک۔ اور کوئی حقیقی نتیجہ ہمیشہ سوچی سمجھی تحریک کے ذریعہ نکلتا ہے، نہ کہ جذباتی ہنگاموں سے۔

اکتوبر ۱۹۷۰ میں پاکستان میں عام انتخابات ہوئے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی قیادت میں جماعت اسلامی پاکستان نے بھی اس میں حصہ لیا۔

مولانا مودودی کا کہنا تھا کہ پاکستان اسلام کے نام الاٹ ہو چکا ہے (اور شاید اسلام خود ان لوگوں کے نام)۔ جماعت اسلامی پاکستان نے نہایت زور وشور کے ساتھ الیکشن میں حصہ لیا۔ الیکشن کے خاتمہ کے بعد ۱۹۷۱ میں جب میں پاکستان گیا اس وقت میں نے دیکھا کہ اب بھی لاہور کی دیواروں پر ایسے پوسٹر موجود ہیں جن کے اوپر یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں—انشاء اللہ جیتے گی، جماعت اسلامی جیتے گی۔

اس موقع پر جماعت اسلامی پاکستان نے ایک لمبا انتخابی منشور شائع کیا تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ پاکستان میں اقتدار حاصل کرنے کے بعد وہ لوگ کس طرح پاکستان کو اسلامائز کریں گے۔ اس مفصّل منشور کا ایک جزء یہ تھا—اتوار کے بجائے جمعہ کو تعطیل مقرر کی جائے گی (الجمعیہ ویکلی، دہلی، ۶ مارچ ۱۹۷۰)

جماعت اسلامی پاکستان اس الیکشن میں بری طرح ہار گئی۔ تاہم اس نے، اور دوسرے پاکستانی علماء نے اتوار کے بجائے جمعہ کی چھٹی کی مانگ عوامی سطح پر بدستور جاری رکھی یہاں تک کہ پاکستان کے فوجی صدر جنرل محمد ضیاء الحق (وفات ۱۹۸۸) نے ایک صدارتی حکم کے ذریعہ اتوار کی چھٹی منسوخ کر دی اور اس کے بجائے جمعہ کے دن کو سارے پاکستان میں سرکاری تعطیل کا دن قرار دے دیا۔

''اسلامی تعطیل'' کا یہ تجربہ چند سال کے بعد سخت تنقیدوں کا شکار ہو گیا۔ خاص طور پر تاجر طبقہ اس کی کھلی مخالفت کرنے لگا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس ''اسلامی تعطیل'' کے نتیجہ میں پاکستان کو ہفتہ میں دو دن کا اقتصادی نقصان برداشت کرنا پڑتا تھا۔ پاکستان کے تجارتی ادارے جمعہ کو چھٹی کرتے تھے جب

کہ ساری دنیا اس دن تجارتی سرگرمیوں میں مشغول ہوتی تھی۔ اس کے بعد پاکستان کے تجارتی ادارے اتوار کو اپنے دفاتر کھولتے تھے جب کہ ساری دنیا اس دن اپنے دفتروں کو بند کئے ہوئے ہوتی تھی۔ آخر کار ۱۹۹۷ میں نواز شریف کی حکومت نے ایک حکم کے ذریعہ جمعہ کی چھٹی منسوخ کردی اور اس کے بجائے اتوار کے دن کی چھٹی کو بحال کردیا۔

اس عجیب وغریب صورت حال کا ایک معکوس نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے لوگ یہ سمجھنے لگے کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس میں وقت کا ساتھ دینے کی طاقت نہیں۔ حالانکہ ''جمعہ کی چھٹی'' کا اسلام سے کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ یہ کچھ سیاسی ہنگامہ پسندوں کا ایک طبع زاد شوشہ تھا نہ کہ اسلام کا کوئی حکم۔

قرآن کی سورہ نمبر ۶۲ اس معاملہ میں ایک واضح رہنما کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سورہ میں جمعہ کے آداب بتاتے ہوئے کہا گیا ہے کہ: اے ایمان والو، جب جمعہ کے دن کی نماز کے لئے پکارا جائے تو اللہ کی یاد کی طرف چل پڑو اور خرید وفروخت چھوڑ دو، یہ تمھارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو۔ پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو، اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو، تاکہ تم فلاح پاؤ۔ (۱۰-۹)

اس آیت میں اسلامی زندگی کا جو نقشہ بتایا گیا ہے اس کے مطابق، جمعہ کا دن چھٹی کا دن نہیں ہے۔ یہ آیت تصدیق کرتی ہے کہ اہل ایمان جمعہ کی نماز کے مختصر وقفہ کو چھوڑ کر، جمعہ سے پہلے بھی اقتصادی سرگرمیوں میں مصروف ہوں گے۔ اور جمعہ کے بعد بھی دوبارہ اقتصادی عمل میں مصروف ہوں گے۔ اس آیت کے مطابق، جمعہ کے دن کی تخصیص صرف یہ ہے کہ اس دن ظہر کی نماز کی جگہ جمعہ کی نماز پڑھی جائے گی۔ اس مختصر وقفہ کے علاوہ مسلمان جمعہ کے دن بھی اسی طرح مشغول رہیں گے جس طرح وہ عام دنوں میں مشغول رہتے ہیں۔

یہ ایک علامتی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نفاذ شریعت کے نام پر چلائی جانے والی مہم محض کچھ مذہبی لیڈروں کی جذباتی ہنگامہ آرائی تھی نہ کہ حقیقتاً اسلامی نفاذ کی کوشش۔ اور اس طرح کی غیر سنجیدہ کوشش کا انجام خدا کی اس دنیا میں وہی ہوگا جو عملاً پاکستان میں پیش آیا۔

19

۱۹۴۷ کے بعد کے انڈیا میں مسلمانوں کے درمیان کم از کم دو شخصیتیں ایسی تھیں جو پورے معنوں میں قائدانہ اوصاف کی حامل تھیں۔ ایک مولانا، حسین احمد مدنی، دوسرے مولانا ابوالکلام آزاد۔ مگر عجیب بات ہے کہ یہ دونوں ۱۹۴۷ سے پہلے کے ہندستان میں سراپا سرگرم بنے ہوئے تھے۔ ۱۹۴۷ کے بعد کے ہندستان میں وہ تقریباً خاموش ہو کر رہ گئے۔ ان کے قائدانہ اوصاف کا کوئی فائدہ ۱۹۴۷ کے بعد کے ہندستان کو نہیں ملا۔

ان کے بعد اگر چہ بہت سے لوگ مسلم قیادت کے میدان میں سرگرمی دکھانے کے لئے اٹھے مگر وہ حقیقتاً اس عربی مثل کا مصداق تھے کہ: کبرنی موت الکبراء (بڑوں کی موت نے مجھ کو بڑا بنا دیا)

آزادی کے بعد کے دور میں مسلمانوں کے درمیان بہت سی قیادتی تحریکیں اٹھیں مگر وہ سب کی سب بے نتیجہ اچھل کود کے ہم معنٰی بن گئیں۔ اس سلسلہ میں غالباً پہلی نمایاں تحریک وہ ہے جو اتر پردیش میں اٹھی۔ اس کا مقصد ریاست میں اردو کو ثانوی درجہ دلانا تھا۔ یہ ایک طوفان خیز تحریک تھی۔ کثیر تعداد میں مسلمانوں نے شہر شہر اور گاؤں گاؤں گھوم کر چودہ لاکھ دستخطوں کا ایک ڈھیر اکٹھا کیا۔ کاغذوں کا یہ ڈھیر ٹرکوں پر لاد کر دہلی لایا گیا تاکہ اس کو صدر جمہوریۂ ہند کی خدمت میں منظوری کے لئے پیش کیا جائے۔

یہ تحریک اپنے سارے جوش وخروش کے باوجود کتنی زیادہ بے حقیقت تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی طور پر کیا جاسکتا ہے۔ پریزیڈنٹ آف انڈیا کے سامنے اردو کی درخواست پیش کرنے کی یہ مہم جس کمیٹی کے تحت چلائی گئی اس کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین (وفات ۱۹۶۹) تھے۔ بعد کو یہی ڈاکٹر ذاکر حسین خود پریزیڈنٹ آف انڈیا کی کرسی پر پہنچ گئے مگر وہ اردو کی اس درخواست کے بارے میں کچھ بھی نہ کر سکے۔ اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ صدر ذاکر حسین اس کو کر سکتے تھے اور انھوں نے نہیں کیا، اس کا سبب یہ تھا کہ یہ کام حقیقی حالات کے اعتبار سے ہونے والا ہی نہ تھا اس لئے وہ نہیں ہوا۔

۱۹۴۷ کے بعد بار بار مسلمانانِ ہند کے درمیان اس قسم کی جذباتی تحریکیں اٹھائی جاتی رہی ہیں جو یا تو بے نتیجہ رہیں یا ان کا معکوس نتیجہ برآمد ہوا۔

مثلاً آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت فرقہ وارانہ فسادات کو روکنے کے لئے اٹھی۔ مگر وہ ایک فی صد بھی فسادات کو روکنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ مسلم یونیورسٹی کو مسلم کردار دینے کے لئے طوفان خیز تحریک اٹھی مگر وہ ظاہری کامیابی کے باوجود مسلم یونیورسٹی کے معیار کو صرف پست کرنے کا ذریعہ بنی۔ ریزرویشن کی پر جوش تحریک نے مسلمانوں کو ریزرویشن تو نہیں دیا البتہ ان کے اندر سے اس جذبہ کو چھین لیا کہ وہ محنت کر کے آگے بڑھیں۔ شاہ بانو تحریک کی بظاہر شاندار کامیابی کا انجام صرف یہ ہوا کہ ہندو فرقہ پرست طاقتیں از سرِ نو زندہ ہو گئیں۔ بابری مسجد تحریک کا یہ برعکس انجام ہوا کہ ہندوؤں کا انتہا پسند طبقہ شدت سے بھڑک اٹھا یہاں تک کہ آپے سے باہر ہو کر اس نے بابری مسجد کو ڈھا دیا۔

جو لوگ چیزوں کو ظاہری سطح (face value) پر لینے کے عادی ہیں وہ صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ کچھ غضبناک ہندوؤں نے بابری مسجد کو ڈھا دیا۔ مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ بابری مسجد کو مسٹر ہندو نے نہیں ڈھایا بلکہ مسٹر ایگو نے ڈھایا۔ اور مسٹر ہندو کو مسٹر ایگو بنانے والے خود مسلمانوں کے نااہل قائدین تھے۔

جہاں تک میرا خیال ہے، ۱۹۴۷ کے بعد ہندستانی مسلمانوں کے درمیان کوئی ایسی قابل ذکر تحریک نہیں اٹھی جس کو مثبت معنوں میں تعمیری تحریک کہا جا سکے۔ اور موجودہ حالات میں غالباً ایسا ہونا ممکن بھی نہیں۔ اس کی بنیادی وجہ ہندستانی مسلمانوں کی غیر حقیقت پسندانہ سوچ ہے۔ وہ اپنے آپ کو غیر واقعی حد تک برتر اور اپنے ہم وطنوں کو غیر واقعی حد تک کمتر سمجھتے ہیں۔ جو لوگ اس طرح کی منفی نفسیات میں مبتلا ہوں ان کے درمیان صرف ردّ عمل کی تحریکیں ابھر سکتی ہیں نہ کہ مثبت معنوں میں کوئی نتیجہ خیز تحریک۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے یہاں ایک نمائندہ مثال درج کی جاتی ہے۔ دہلی کے سہ روزہ دعوت میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کا ایک انٹرویو ’’افادۂ عام کی غرض سے‘‘ شائع کیا گیا ہے۔ اس

انٹرویو کا ایک سوال اور جواب من وعن یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

سوال: ملک میں روز بروز بڑھتی ہوئی ہندو فرقہ پرستی کے تناظر میں آپ کو یہاں انسانیت کا مستقبل کیسا نظر آتا ہے، خصوصاً جب کہ آں جناب ''پیام انسانیت'' تحریک کے داعی وعلم بردار ہیں۔

جواب: درحقیقت انسانیت کا پیغام وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ملکی سطح پر جو زبردست سیاسی، تہذیبی اور اخلاقی خلا موجود ہے، اسے صرف مسلمان ہی پُر کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ وہ کتاب وسنت اور سیرت رسول ﷺ کے وارث ہیں۔ بلکہ میں تو پورے یقین واعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر مسلمان نہ ہوتے تو یہ ملک عذاب الٰہی کا نشانہ بن جاتا اور اسے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا ہوتا۔ (سہ روزہ دعوت، نئی دہلی، ۲۵ جنوری ۱۹۹۷)

جس ملک کے دو گروہوں میں سے ایک گروہ کی سوچ یہ ہو کہ دوسرا گروہ عذاب الٰہی کا مستحق ہو چکا ہے اور ملک میں صرف میری موجودگی اس کو اس بھیانک انجام سے بچائے ہوئے ہے۔ وہاں نفرت اور حقارت کا ماحول تو بن سکتا ہے مگر محبت اور احترام کا ماحول ایسے لوگوں کے درمیان کبھی نہیں بنے گا۔ اور جس ملک کے دو بڑے گروہوں کے درمیان اس قسم کا منفی ماحول ہو وہاں مثبت معنوں میں لوگوں کے درمیان معتدل انسانی تعلقات کا قیام ممکن ہی نہیں۔

20

آزادی (۱۹۴۷) کے بعد ہندستان میں جو پہلی پارلیمنٹ بنی اس کے ایک بنگالی ممبر پروفیسر ہیرن مکرجی تھے۔ پارلیمنٹ کے اجلاس میں شرکت کے بعد وہ دہلی سے کلکتہ کے لئے بذریعہ ٹرین روانہ ہوئے۔ وہ فرسٹ کلاس میں سفر کر رہے تھے۔ انھوں نے جب چلتی ہوئی ٹرین کے باہر نظر ڈالی تو سڑک کے دونوں طرف جھگی جھونپڑی کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ گندگی اور تاریکی کے غیر صحت مند ماحول میں عورت، مرد اور بچے اس طرح رینگ رہے تھے جیسے کہ وہ انسان نہ ہوں بلکہ جانور ہوں۔

پروفیسر ہیرن مکرجی اس منظر کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔ واپس پہنچ کر کلکتہ سے انھوں نے اس وقت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کو ایک خط روانہ کیا۔ اس خط میں انھوں نے لکھا کہ ٹرین کے

فرسٹ کلاس میں بیٹھا ہوا جب میں جھگی جھونپڑی کی ان گندی بستیوں سے گذرا تو میں نے سوچا کہ اگر یہ لوگ مجھ سے پوچھیں کہ انڈیا کی آزادی سے ہم کو کیا ملا، تو میں ان کو کیا جواب دوں گا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اس کے جواب میں پروفیسر ہیرن مکرجی کو جو خط روانہ کیا اس میں انھوں نے لکھا تھا کہ ـــــ تم اپنے حساس ہونے کی قیمت ادا کر رہے ہو:

You are paying the price of being sensitive.

یہ ایک علامتی واقعہ ہے جو بتاتا ہے کہ آزادی کے ابتدائی زمانہ ہی میں دردمند لوگوں نے ہمارے لیڈروں کے ضمیر کو کھٹکھٹایا۔ مگر وہ جاگنے کے بجائے خواب آور گولیاں کھا کر گہری نیند سو گئے۔ انھوں نے یاد دلانے والوں کو یہ کہہ کر چپ کرادیا کہ یہ تمہاری حسّاسیت کا مسئلہ ہے، نہ کہ کوئی حقیقی مسئلہ۔

ہمارے لیڈروں نے ایسا جواب کیوں دیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ایک بار حکومت کا تجربہ کرنے کے بعد ان کی ساری دلچسپی اس سے ہوگئی کہ وہ اپنے اقتدار کو آخر وقت تک باقی رکھ سکیں۔ اب ان کی توجہات کا مرکز صرف یہ تھا کہ وہ کس طرح اگلے الیکشن میں اپنے آپ کو شکست سے بچائیں اور الیکشن جیت کر دوبارہ سیاسی اقتدار کی گدی پر بیٹھ جائیں۔ اس خود غرضانہ طرز فکر نے ہندستانی سیاست کو پہلے کرپٹ پالیٹکس بنایا، اور اس کے بعد اس کو وہ بدترین صورت دے دی جسے ممبئی کے مسٹر مدھو مہتا (وفات ۱۹۹۵) کریمنلائزیشن آف پالٹکس کہا کرتے تھے۔

شیخ سعدی شیرازی کا ایک شعر ہے کہ کسی چشمہ کا منبع ابتدا میں ایک تیلی سے بند کیا جا سکتا ہے۔ مگر جب وہ بھر جائے تو اس کو ہاتھی کے ذریعہ بھی بند کرنا ممکن نہیں:

سر چشمہ شاید گرفتن بہ میل　　　چو پُر شد نشاید گذشتن بہ پیل

آزادی کے بعد ابتدائی دور میں اگر ہمارے لیڈر صرف اتنا کرتے کہ وہ جیت کے ساتھ ہار کو قبول کرنے کے لئے بھی تیار ہو جاتے تو ملک میں اتنا بگاڑ کبھی نہیں آسکتا تھا۔ ڈیما کریسی کی بنیاد الیکشن پر ہے اور الیکشن اگر صحیح طور پر کرائے جائیں تو کبھی ایک گروہ جیتے گا اور کبھی دوسرا گروہ۔ اس لئے ڈیما کریسی کا نظام درست طور پر صرف اس وقت چل سکتا ہے جب کہ پارٹیاں ہارنے کو بھی اسی طرح

قبول کریں جس طرح وہ جیتنے کو قبول کرتی ہیں۔ اگر یہ مزاج نہ ہوتو برسر اقتدار پارٹی اپنے اقتدار کو مسلسل باقی رکھنے کے لئے ایسی بدعنوانیاں کرے گی جس کے نتیجہ میں پورا ملک تباہ ہو کر رہ جائے۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں یہی کچھ پیش آیا ہے۔

21

۱۹۴۷ سے پہلے جو لوگ آل انڈیا کانگریس میں جڑے وہ طرح طرح کی سوچ کے لوگ تھے۔ ان کو جس چیز نے کانگریسی اتحاد میں اکھٹا کیا وہ صرف انگریز مخالف سیاست تھی۔ یہ لوگ پرو انڈیا جذبہ سے زیادہ اینٹی برٹش جذبہ کے تحت کانگریس کے پلیٹ فارم پر اکھٹا ہوئے تھے۔ آزادی کے بعد جب پنڈت جواہر لال نہرو کو ملک کا وزیر اعظم بنایا گیا تو کسی نے ان سے کہا کہ کانگریس میں تو طرح طرح کے لوگ اکھٹا ہیں۔ اس قسم کے مختلف لوگوں کو لے کر آپ کس طرح حکومت کا کاروبار چلائیں گے۔ پنڈت نہرو نے جواب دیا: ہر ایک کی ایک قیمت ہے، اور وہ قیمت میں اس کو ادا کر سکتا ہوں۔

پنڈت نہرو کا یہ فارمولا ایک مفاد پرست حکومت کو چلانے کے لئے کافی ہو سکتا تھا۔ مگر وہ ایک بااصول اور باکردار حکومت کو چلانے کے لئے قطعی طور پر ناکافی تھا۔ چنانچہ آزادی کے بعد ملک میں جو سیاسی ڈھانچہ بنا وہ یہ تھا کہ یہاں کوئی بااصول سیاسی نظام قائم نہ ہو سکا۔ اس کے برعکس جو کچھ پیش آیا وہ یہ تھا کہ ہر ایک اپنی ''قیمت'' وصول کرنے لگا۔ مزید یہ کہ اس کی یہ قیمت بھی خود اس کے اپنے خود ساختہ اندازوں کی بنیاد پر تھی نہ کہ حقیقت واقعہ کی بنیاد پر۔

چنانچہ قیمت وصول کرنے کا یہ سلسلہ کہیں نہیں رکا۔ پہلے یہ قیمت ہزاروں میں وصول کی جاتی تھی۔ اس کے بعد لاکھوں میں قیمت لی جانے لگی۔ پھر کروروں میں اور مزید بڑھ کر اربوں کی مقدار میں لوگ اپنی قیمت وصول کرنے لگے۔ یہ معاملہ اتنا بڑھا کہ ہندستانی روپیہ کی شکل میں اپنی قیمت لینا لوگوں کو کم دکھائی دینے لگا۔ اب لوگ ڈالر اور پونڈ کی صورت میں اپنی قیمت وصول کرنے لگے۔ ملک کی دولت ہندستان سے نکل کر بیرونی ملکوں کے بینکوں میں جمع ہو گئی۔

یہاں تک کہ قیمت وصول کرنے کا یہ معاملہ ایک مستقل فن بن گیا۔ اب سیاسی اور حکومتی

شخصیتوں نے یہ کیا کہ وہ ملکی اور سماجی ترقی کے نام پر بڑے بڑے منصوبے بنائیں، صرف اس لئے کہ اس کے بہانے سے اپنے گھروں کو نوٹ سے بھرے ہوئے بوروں کا گودام بنا سکیں۔ ملک بدستور بے ترقی کی حالت میں رہا مگر ملکی ترقی کے نام پر حکومتی شخصیتوں اور بڑے بڑے افسروں کا یہ حال ہوا کہ ان کے گھروں میں دولت کے انبار لگ گئے۔ ملک کی سڑکیں بدستور ٹوٹی پھوٹی حالت میں پڑی رہیں مگر انھیں سڑکوں کے نام پر لوگوں کے شاندار ذاتی محل تعمیر ہو گئے۔

یہ معاملہ یہاں بھی نہیں رکا۔ حکومتی شخصیتوں نے دیکھا کہ ملکی ترقی کے نام پر وہ صرف ہندستانی روپیہ لوٹ سکتے ہیں۔ اب انھوں نے جنگ کا ہوّا کھڑا کیا۔ سرحدی خطرات کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔ صرف اس لئے تاکہ مغربی ملکوں کی اسلحہ فیکٹریوں سے نہایت مہنگی قیمت پر ہتھیاروں کی خریداری کا معاملہ کریں اور اس بہانے کروروں اور اربوں ڈالر باہر کی کمپنیوں سے بطور کمیشن وصول کر کے اس کو سوئزرلینڈ کے بنکوں میں خفیہ کھاتے کے طور پر جمع کر سکیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو کا سوشلسٹ فارمولا ابتدائی طور پر ایک سادہ فارمولا دکھائی دیتا تھا۔ مگر اپنی انتہا کو پہنچ کر ان کا سوشلسٹ فارمولا ایک ایسا لوٹ فارمولا بن گیا جس کی کوئی مثال ہندستان کی ہزاروں سال کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

آزادی کے بعد ہندستان میں لاقانونیت کی جو صورت پیش آئی وہ کوئی اتفاقی بات نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا بیج ۱۹۴۷ سے پہلے آزادی کی تحریک کے دوران ہی ڈال دیا گیا تھا۔ آزادی کے بعد، لاقانونیت کا مزاج جو ملک میں پایا جاتا ہے وہ آزادی سے پہلے کے حالات ہی کا ایک براہ راست نتیجہ ہے۔

سبھاش چندر بوس نے کہا تھا کہ تم مجھ کو خون دو میں تم کو آزادی دوں گا۔ اس کے مقابلہ میں مہاتما گاندھی نے کہا کہ تم انگریزی قانون کو توڑو اور پھر تم کو آزادی مل جائے گی۔ سبھاش چندر بوس کے انقلاب میں اگر انسان قتل ہوتے تھے تو گاندھی کے انقلاب میں روایات قتل ہو گئیں۔ اور تاریخ بتاتی ہے کہ قتل انسان کے مقابلہ میں قتل روایات کا طریقہ زیادہ سخت ہے۔

مہاتما گاندھی کی پوری تحریک گویا پر امن قانون شکنی تھی ـــــ حکومت کو ماننے کے بجائے حکومت کو نہ ماننا، اسکولوں اور کالجوں سے لوگوں کو نکالنا، اس قسم کی بہت سی خلافِ روایت چیزیں تھیں جن کو مہاتما گاندھی نے ملک میں رواج دیا۔ ان کی اس تدبیر کا ایک جزء وہ تھا جس کو سول نافرمانی (civil disobedience) کہا جاتا ہے۔

مہاتما گاندھی اور ان کے ساتھیوں کا خیال تھا کہ قانون شکنی کی اس تحریک کے ذریعہ وہ برٹش اقتدار کو غیر مستحکم (destabilized) کررہے ہیں ۔ ہمارا سماج صدیوں سے کچھ اخلاقی روایات پر قائم تھا۔ یدھشٹر کا قصہ ان اخلاقی روایات کی ایک علامتی مثال ہے۔ کہانی بتاتی ہے کہ یدھشٹر ایک سچے انسان تھے۔ اس بنا پر ان کا رتھ زمین کے اوپر اوپر چلتا تھا۔ مگر ایک جنگ کے موقع پر انھوں نے بظاہر ایک جھوٹ بات کہہ دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا رتھ زمین پر آ گیا۔ اس کے بعد پھر وہ کبھی زمین سے اوپر اٹھ کر نہیں چلا۔

قدیم ہندستانی سماج اس قسم کی بہت سی اخلاقی روایات کے اوپر قائم تھا۔ اس وقت کے سماج میں اس اخلاقی روایات کے ڈھانچہ کو توڑنا بہت زیادہ برا سمجھا جاتا تھا۔ ان روایات کا غلبہ ذہنوں پر اتنا زیادہ تھا کہ کوئی بھی شخص ان کو توڑنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ مہاتما گاندھی کی عوامی تحریک نے پہلی بار اس کا خاتمہ کیا۔

روایت شکنی اور قانون کی پامالی کے اس طریقہ کا نشانہ ۱۹۴۷ سے پہلے برٹش اقتدار تھا، ۱۹۴۷ کے بعد اس کا نشانہ خود ہندستانی سماج بن گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندستانی سماج ایک ایسا سماج بن گیا جس میں قانون اور اقدار کا احترام ختم ہوگیا تھا۔ جہاں لوگوں کے لئے قانون اور اخلاقی روایات کے خلاف عمل کرنا کوئی سنگین بات نہ تھی۔ آج ہندستانی سماج میں لوٹ اور انارکی کی جو کیفیت پائی جاتی ہے اس کا کم ازکم ایک بڑا سبب یہی ہے۔

22

دنیا بھر میں مسلمانوں کی تعداد ایک بلین سے زیادہ ہوچکی ہے۔ اس تعداد کا تقریباً تہائی حصہ

صرف برصغیر ہند میں آباد ہے۔اسی طرح انڈیا میں ہندوستر کرور سے زیادہ ہیں۔کوئی ایک کمیونٹی اتنی بڑی تعداد میں کسی ایک ملک میں نہیں پائی جاتی۔اس طرح ہندو اور مسلمان دونوں اس خطۂ ارضی میں غیر معمولی امکانات کے حامل ہیں۔مگر عجیب بات ہے کہ پچھلے سو سال کی ہنگامہ خیز سرگرمیوں کے باوجود دونوں میں سے کوئی بھی کمیونٹی کوئی قابل لحاظ کارنامہ انجام نہ دے سکی۔

اس المیہ کا سبب کیا ہے۔میرے نزدیک اس کا واحد سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اس پوری مدت میں کوئی دانش مند قیادت برصغیر ہند میں ابھر نہ سکی۔اس مدت میں کچھ ایسے لیڈر ضرور دکھائی دیتے ہیں جن کو قوم کے حق میں مخلص کہا جاسکتا ہے۔مگر دوراندیشی اور گہرے تدبر سے تقریباً ہر ایک خطرناک حد تک خالی تھا۔اس لئے ان میں سے کوئی بھی پورے معنوں میں نتیجہ خیز تحریک وجود میں نہ لا سکا۔

قائد کی مثال باغبان جیسی ہے۔باغ کے درخت آج لگائے جاتے ہیں مگر ان کا پھل بہت سال بعد مستقبل میں حاصل ہوتا ہے۔اس لئے قائد کی صحیح پہچان یہ ہے کہ وہ ایسی تحریک اٹھا سکے جو مستقبل کے اعتبار سے نتیجہ خیز ثابت ہو۔مگر بدقسمتی سے ایسا کوئی لیڈر نہ ہندوؤں میں پیدا ہوا اور نہ مسلمانوں میں۔

امریکا کے ابتدائی لیڈروں نے امریکا کو سائنسی تعلیم کے میدان میں ڈالا تھا۔یہی کام بعد کو جاپان نے کیا۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد ہندستان کے لیڈر اپنی سیاسی تحریک کو تیز کرنے کے لئے ہندستانی نوجوانوں کو اسکولوں اور کالجوں سے باہر لا رہے تھے،اسی زمانہ میں جاپانی لیڈر اپنے نوجوانوں کو اسکول اور کالج میں داخل کرکے انھیں بہترین تعلیم دلوا رہے تھے۔یہ عمل لمبی مدت تک امریکا اور جاپان میں جاری رہا۔ان کی اگلی نسلوں کو اس نشانہ میں تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔اس کے برعکس روس میں ۷۵ سال تک اسٹیٹ اکانومی کا غلغلہ رہا۔اس کے بعد اس کو ترک کرکے لبرل اکانومی کے اصول پر قوم کو چلایا جانے لگا۔یہی معاملہ چھوٹے پیمانے پر ہندستان میں پیش آیا۔

یہی وہ فرق ہے جس کی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ امریکا اور جاپان ایک ترقی یافتہ ملک ہیں اور روس اور ہندستان دونوں غیر ترقی یافتہ ملک۔ترقی مسلسل طور پر جاری رہنے والا عمل ہے۔اس لئے ترقی کے

لئے وہی اسکیم کارآمد ہے جو قابل بقا (sustainable) ہو۔ جو اسکیم قابل بقا نہ ہو وہ ترقی کا ذریعہ بھی نہیں بن سکتی۔

اس معیار کی روشنی میں دیکھئے تو ہندوؤں اور مسلمانوں کے تمام بڑے بڑے لیڈر اس پر پورے اترتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ مثال کے طور پر مہاتما گاندھی نے چرخا پر مبنی اکانومی کا نظریہ پیش کیا مگر وہ کچھ انفرادی لوگوں میں وقتی طور پر رہا اور اس کے بعد اس کا خاتمہ ہو گیا۔ اسی طرح پنڈت نہرو نے سرکاری اکانومی کو رائج کیا مگر چالیس سال بعد اس کو لپیٹ کر رکھ دینا پڑا۔

مولانا محمد علی جوہر نے خلافت تحریک کے نام پر تھوڑے دنوں کے لئے پورے برصغیر کو ہلا دیا مگر ۱۹۲۴ میں ان کی زندگی ہی میں اس طوفانی تحریک کا اس طرح خاتمہ ہو گیا جیسے کہ اس کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ اسی طرح مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے طاغوتی نظام کا نظریہ پیش کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ مسلمان انسانی ساخت کے تمام نظاموں سے قطع تعلق کریں اور ان سے لڑ کر دنیا بھر میں ان کا خاتمہ کر دیں۔ ورنہ اس دنیا میں ان کی زندگی ہی جائز زندگی نہ ہوگی۔ اس بے بنیاد نظریہ نے بھی ایک محدود عرصہ کے لئے وقتی جوش وخروش دکھایا اس کے بعد وہ کتابوں کے صفحات میں دفن ہو کر رہ گیا۔ اس کی وجہ بھی دوبارہ یہی تھی کہ اس عالم اسباب میں اس قسم کا انتہا پسندانہ تصور قابل بقا ہی نہ تھا۔

23

۱۹۳۸ میں عربی تعلیم کے لئے میں نے مدرسۃ الاصلاح (اعظم گڈھ) میں داخلہ لیا۔ اس مدرسہ میں اس وقت ہندستان کی دو شخصیتوں کا زیادہ چرچا تھا۔ اردو میں مولانا ابوالکلام آزاد (وفات ۱۹۵۸) اور عربی میں مولانا حمید الدین فراہی (وفات ۱۹۳۰)۔ اس زمانہ میں یہاں کے کتب خانہ (دار المعلومات) میں مولانا آزاد کے الہلال کے پرچے مجلد صورت میں نہایت اہتمام کے ساتھ رکھے گئے تھے۔ عام کتابوں کی طرح یہ جلدیں اشو نہیں کی جاتی تھیں۔ ان کو صرف کتب خانہ میں ہی بیٹھ کر پڑھا جا سکتا تھا۔

الہلال کو پڑھ کر جو ذہن بنتا تھا وہ صرف استعمار سے نفرت کا ذہن تھا۔ اس کا ہر شمارہ گویا

انگریزوں کے خلاف ایک بغاوت نمبر ہوتا تھا۔اس کو پڑھ کر آدمی کے اندر صرف یہ ذہن پیدا ہوتا تھا کہ انگریز ایک قابل نفرت قوم ہے۔ ان کا مقصد حیات یہ ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچائیں اور اگر ممکن ہو تو ان کو دنیا سے مٹادیں۔

مولانا حمید الدین فراہی کوئی سیاسی آدمی نہ تھے۔ان کا موضوع اصلاً تفسیر قرآن تھا۔لیکن انگریزوں کے معاملے میں ان کے خیالات وہی تھے جو اس زمانے کے دوسرے علماء کے یہاں پائے جاتے تھے۔اس زمانہ کے علماء عام طور پر انگریزوں سے سخت بیزار تھے۔وہ انگریزوں کو اسلام کا دشمن نمبر ایک سمجھتے تھے۔چنانچہ اس زمانہ کے علماء کے حالات میں عام طور پر یہ لکھا ہوا ملے گا کہ ''حضرت کو انگریزوں سے سخت نفرت تھی''۔یہی حال خود مولانا حمید الدین فراہی کا بھی تھا۔انھوں نے اپنی ساری زندگی قرآن کے مطالعہ میں گزاری۔مگر قرآن سے انھیں آیتوں اور سورتوں میں نظم کا مسئلہ تو ملا مگر انسان سے محبت کا مسئلہ انھیں شاید اس میں نہیں ملا۔

انگریز پروفیسر آرنلڈ (T.W.Arnold) کی کتاب دعوت اسلام (The Preaching of Islam) پہلی بار ۱۸۹۶ میں چھپی۔اس وقت مولانا حمید الدین فراہی علی گڑھ میں تھے۔خود کتاب کے انگریز مصنف بھی اس وقت استاذ کی حیثیت سے علی گڑھ میں موجود تھے۔پروفیسر آرنلڈ (وفات ۱۹۳۱) نے ۵۰۰ صفحہ کی اس کتاب میں کامیابی کے ساتھ یہ دکھایا ہے کہ اسلام تلوار کے ذریعہ نہیں پھیلا بلکہ دعوت و تبلیغ کے ذریعہ پھیلا۔

یہ کتاب لندن سے چھپ کر جب علی گڈھ آئی تو مولانا حمید الدین فراہی نے اس کو پسند نہیں کیا۔ان کے نزدیک یہ کتاب انگریزوں کی سازش کا ایک حصہ تھی۔انگریز اپنے استعماری مفاد کے تحت مسلمانوں سے جہاد کا جذبہ ختم کردینا چاہتے ہیں، اس لئے انھوں نے پروفیسر آرنلڈ سے اس قسم کی کتاب لکھوائی ہے۔مولانا حمید الدین فراہی کا یہ احساس اتنا زیادہ بڑھا ہوا تھا کہ ایک انگریز لارڈ کرزن (Lord Curzon) (وفات ۱۹۲۵) ان کو اپنے عربی ترجمان کی حیثیت سے عرب لے جانا چاہتا تھا۔انھوں نے اس کو ''دشمنِ اسلام کے ساتھ تعاون'' سمجھ کر اس سے انکار کردیا۔بعد کو اپنے استاذ مولانا

شبلی نعمانی (وفات ۱۹۱۴) کے کہنے پر بادل ناخواستہ وہ مذکورہ انگریز کے ساتھ جانے پر راضی ہوئے۔

اس طرح مدرسہ میں مجھ کو جو ذہن ملا وہ نفرت انگریز (یا نفرت انسان) کا ذہن تھا۔ اسلام کا مطلوب ذہن محبت انسان کا ذہن ہے۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ پچھلے سو سال کے درمیان ہمارے رہنماؤں نے مسلمانوں کے اندر جو ذہن بنایا وہ براہ راست یا بالواسطہ طور پر نفرت انسان کا ذہن تھا، نہ کہ محبت انسان کا ذہن۔ مجھے یاد ہے کہ اس وقت کے مشہور مسلم شاعر انور صابری ہمارے مدرسہ میں آئے۔ انھوں نے وہاں اپنی کچھ نظمیں سنائیں۔ ان کا ایک شعر بہت مقبول ہوا جو اب تک مجھے یاد ہے:

تمنا ہے کہ دنیائے غلامی کو بدل ڈالوں　　　شہنشاہوں کا سر پائے بغاوت سے کچل ڈالوں

مدرسۃ الاصلاح میں میرے استاذ مولانا امین احسن اصلاحی (وفات ۱۹۹۸) سیاسی اعتبار سے کانگریسی تھے۔ تاہم تقسیم (۱۹۴۷) کے بعد وہ پاکستان چلے گئے۔ وہاں وہ لاہور میں مقیم رہے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ غالباً ۱۹۵۰ میں وہ کچھ دنوں کے لئے ہندستان آئے تھے اور اپنے وطن بمہور (اعظم گڑھ) میں قیام کیا تھا۔ میں بھی چند دوسرے نوجوانوں کے ساتھ بمہور گیا۔ مولانا جب یہاں آئے تو ان کو حسب قاعدہ پولیس اسٹیشن جا کر اپنی آمد کا اندراج کرانا پڑا۔ اس قسم کی چیز ان کے مزاج کے خلاف تھی۔ چنانچہ ہم لوگوں سے گفتگو کے دوران انھوں نے کہا: پاکستان میں میں وزیر اعظم کو ڈانٹ سکتا ہوں، مگر انڈیا میں میں نمبر ۱۰ کا مجرم ہوں۔

استاذ کی زبان سے یہ جملہ سن کر اس وقت میرے اندر یہ تاثر پیدا ہوا کہ انڈیا بہت خراب ملک ہے اور پاکستان اس کے مقابلے میں بہت اچھا ملک ہے۔ اس کے ایک عرصہ بعد ۱۹۷۱ میں میں خود پاکستان گیا اور وہاں لاہور میں چند دن قیام کیا۔ اس سفر میں میرے ساتھ ٹھیک وہی واقعہ پاکستان میں پیش آیا جو مولانا امین احسن اصلاحی کے ساتھ انڈیا میں پیش آیا تھا۔ مجھ کو بھی وہاں پہنچ کر پہلے ہی دن پولیس اسٹیشن جانا پڑا اور وہاں اپنی آمد کی تفصیل پولیس کے رجسٹر میں درج کرانی پڑی۔

ان چند متفرق واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ پچھلے سو سال کے اندر کس قسم کے خیالات چھائے رہے ہیں اور ہمارے اداروں اور ہماری شخصیتوں کے ذریعہ لوگوں کو کس قسم کا ذہن ملتا رہا ہے۔ مثلاً اس

پورے دور میں ہم نے انگریز کے مسئلہ کو ''غلامی'' کا مسئلہ سمجھا۔ حالانکہ زیادہ صحیح لفظوں میں وہ نو آبادیات (colonialism) کا مسئلہ تھا۔ غلامی کا لفظ صرف نفرت اور حقارت پیدا کرتا ہے۔ وہ انگریزوں کا تعارف صرف ایک ظالم کے روپ میں کرتا ہے۔ اس کے برعکس، نوآبادیات کا لفظ یہ بتاتا ہے کہ انگریزوں نے علم اور صنعت کے میدان میں ترقی کر کے ہمارے اوپر برتری حاصل کرلی۔ اسی برتری کی بنا پر وہ اس قابل ہو گئے کہ سات سمندر پار کر کے وہ ہمارے ملک میں آئیں اور یہاں حکومت کریں۔

اس طرح نوآبادیات کا لفظ نئی سوچ پیدا کرتا ہے۔۔ وہ ترغیب دیتا ہے کہ ہم بھی علم اور صنعت کے میدان میں ترقی کریں اور صحت مند مقابلہ کر کے ان سے آگے بڑھ جائیں۔ جب کہ غلامی کے لفظ سے اس قسم کا کوئی مثبت ذہن نہیں بنتا۔

اسی طرح لوگوں کے اندر ایک عام کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنے قریبی حالات کے زیر اثر رائے قائم کرتے ہیں۔ اس بنا پر ان کی رائے اکثر غلط ہو جاتی ہے۔ ایک پاکستانی مسلمان کو انڈیا میں پولیس کے دفتر میں حاضری دینی پڑے تو انڈیا کے بارے میں اس کی رائے خراب ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس نے معاملہ کو صرف اپنے محدود تجربہ کے دائرے میں دیکھا۔ اگر وہ اس حقیقت کو بھی سامنے رکھے کہ انڈیا کا ایک مسلمان جب پاکستان جاتا ہے تو وہاں بھی اس کو پولیس اسٹیشن میں اسی طرح حاضری دینی پڑتی ہے۔ اگر وہ دونوں قسم کے واقعات کو ملا کر سوچے تو اس کی رائے میں توازن پیدا ہو جائے گا۔

اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ سوچا جائے کہ یورپ میں لوگ ایک ملک سے دوسرے ملک میں ویزا کے بغیر آسانی کے ساتھ آتے جاتے رہتے ہیں۔ پھر انڈیا میں اس کے خلاف صورتِ حال کیوں۔ اس پر غور کرنے کے بعد معلوم ہوگا کہ اس کا سبب ہمارے لیڈروں کی غلط سیاست ہے۔ یورپ میں ایک ملک اور دوسرے ملک کے درمیان نفرت کی سیاست نہیں چلائی گئی۔ اس لئے وہاں مختلف ملکوں کے درمیان معتدل حالات موجود ہیں۔ انڈیا اور پاکستان میں اس کے برعکس نفرت اور کشاکش کی سیاست چلائی گئی۔ دراصل یہی منفی سیاست ہے جس کا انجام آج برصغیر ہند کے لوگ بھگت رہے ہیں۔

24

۱۹۶۶ میں لکھنؤ مسلم سیاست کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد منظور نعمانی، ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی، وغیرہ نہایت جوش وخروش کے ساتھ ڈاکٹر رام منوہر لوہیا کی ''نان کانگریس ازم'' کی مہم میں شریک تھے۔ اس زمانے میں ایسی تقریریں کی جارہی تھیں جیسے کہ کانگریس کو ہرانا مسلمانوں کا مستقبل بنانے کے ہم معنٰی ہے۔

میں اس سیاست کو سراسر ایک بے فائدہ سیاست سمجھتا تھا۔ میں نے اس تحریک کے اکثر رہنماؤں سے تبادلۂ خیال کرنے کی کوشش کی۔ مگر اس وقت وہ اتنے جوش میں تھے کہ کوئی بھی شخص کچھ سننے کے لئے تیار نہ ہوا۔ آخر کار میں ۱۶/اپریل ۱۹۶۷ کو ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی سے ملا۔ یہ گفتگو لکھنؤ میں (فریدی بلڈنگ، حضرت گنج) میں ہوئی۔ پون گھنٹہ تک گفتگو جاری رہی۔ میں نے ان کے تمام دلائل کو رد کرتے ہوئے انھیں بتایا کہ کسی پولیٹکل پارٹی کو ہرانا مسلمانوں کے لئے کسی مثبت نتیجہ کو پیدا کرنے والا نہیں بن سکتا۔ جب ڈاکٹر فریدی کے پاس میری دلیلوں کا کوئی جواب نہ رہا تو آخر میں انھوں نے کہا: اسٹیٹس کو میں چینج تو ہوگا (یعنی موجودہ سیاسی صورتحال میں تبدیلی تو ہوگی) اس کے بعد گفتگو ختم ہوگئی۔

ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی (وفات ۱۹۷۴) کا یہ جواب علامتی طور پر موجودہ زمانہ کی پوری مسلم قیادت پر صادق آتا ہے۔ اس زمانہ میں تقریباً ہر مسلم قائد (نہ صرف ہندستان میں بلکہ ساری دنیا میں) بس پولیٹکل اسٹیٹس کو میں چینج لانے کی سیاست چلاتا رہا، صرف اس فرق کے ساتھ کہ کسی نے شعوری طور پر ایسا کیا اور کسی نے غیر شعوری طور پر۔

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں کی ہنگامہ خیز کوششیں کوئی مثبت نتیجہ پیدا کئے بغیر ختم ہوگئیں۔ اس کی واحد مشترک وجہ یہ تھی کہ انھوں نے سیاسی اسٹیٹس کو میں چینج کو کام سمجھ لیا۔ وہ بار بار اس اسٹیٹس کو میں تبدیلی لانے کے لئے دھواں دار تحریکیں چلاتے رہے، صرف اس لئے کہ جو کچھ پہلے حاصل تھا وہ بھی ان سے چھن جائے۔

اصل یہ ہے کہ اسٹیٹس کو میں چیلنج لانے کے لئے تحریک چلانا کوئی تحریک ہی نہیں۔ کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ جو اسٹیٹس کو بن گیا ہے اس کو وقتی طور پر تسلیم کرتے ہوئے حاصل شدہ مواقع کار کو مثبت تعمیر کے لئے استعمال کیا جائے۔ جو سیاسی اسٹیٹس کو آپ کو یہ موقع دیتا ہے کہ آپ اس کے خلاف تحریک چلائیں وہ مزید اضافہ کے ساتھ آپ کو یہ موقع دے گا کہ اس کو چھیڑے بغیر غیر نزاعی دائرے میں خاموش تعمیر کی کامیاب جدوجہد کریں۔

اسٹیٹس کو میں چیلنج ایک سلبی عمل ہے اور اسٹیٹس کو سے ٹکرائے بغیر غیر سیاسی میدان میں کوشش کرنا ایک ایجابی عمل۔

اس دنیا میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ مختلف اسباب سے ایک فریق اور دوسرے فریق کے درمیان ایک اسٹیٹس کو قائم ہو جاتا ہے۔ اگر کام کا آغاز اس اسٹیٹس کو کے بدلنے سے کیا جائے تو پہلے ہی مرحلے میں فریق ثانی سے ٹکراؤ پیش آجائے گا۔ مزید یہ سراسر غیر یقینی ہوتا ہے کہ اگر اسٹیٹس کو بدل بھی جائے تو اس کے بعد جو صورت حال پیدا ہوگی وہ کس کے حق میں ہوگی۔ مثال کے طور پر، مصر کے 'اسلام پسندوں' نے شاہ فاروق کے زمانے میں پولیٹکل اسٹیٹس کو کو بدلنے کی کوشش کی مگر جب وہ بدلا تو وہ اسلام پسندوں کے بجائے فوجی افسروں کے حق میں چلا گیا۔ پاکستان کے اسلام پسندوں نے صدر ایوب خاں کے زمانہ میں پولیٹکل اسٹیٹس کو میں تبدیلی کی کوشش کی۔ مگر جب وہ بدلا تو وہ اسلام پسندوں کے بجائے سیکولر لیڈروں کے حق میں چلا گیا۔ اسی طرح ہندستان میں انگریزوں کے زمانے میں جو پولیٹکل اسٹیٹس کو تھا اس کو نیشنلسٹ مسلمانوں نے بدلنے کی کوشش کی مگر جب وہ بدلا تو نیشنلسٹ مسلمانوں کے بجائے دوسری پارٹیوں کے حق میں چلا گیا، وغیرہ۔ اس لئے صحیح اور مفید طریقۂ کار یہ ہے کہ اسٹیٹس کو کو عملاً قبول کرتے ہوئے بقیہ دائروں میں اپنے تعمیر و استحکام کی جدوجہد جاری کی جائے۔ بالفاظ دیگر مسائل کو نظر انداز کرتے ہوئے مواقع کو استعمال کیا جائے۔ یہی طریقہ درست ہے اور یہی طریقہ نتیجہ خیز بھی۔

25

بی بی سی لندن سے ۳۱ مئی ۱۹۹۸ کو ایک ادبی پروگرام نشر ہوا۔ یہ سعادت حسن منٹو کے

بارے میں تھا۔ وہ اردو کے مشہور افسانہ نگار تھے۔ ان کی پیدائش انڈیا میں ہوئی۔ تقسیم (۱۹۴۷) کے وقت وہ بمبئی میں تھے۔ اس کے بعد وہ پاکستان چلے گئے ۔ ۱۹۵۵ میں لاہور میں ان کا انتقال ہوگیا۔ انھوں نے کیوں ایسا کیا کہ وہ انڈیا کو چھوڑ کر پاکستان چلے گئے۔ نشریہ میں بتایا گیا تھا کہ اس سوال کا جواب خود سعادت حسن منٹو نے عصمت چغتائی کو ان الفاظ میں دیا تھا: پاکستان میں مسلمانوں کا مستقبل روشن ہے۔ وہاں ہر طرف ہم ہی ہم ہوں گے۔ خوب ترقی کریں گے۔

یہی ذہن ان تمام لوگوں کا تھا جو پاکستان کے حامی تھے۔ مگر واقعات بتاتے ہیں کہ پچاس سال گذرنے کے بعد بھی پاکستان کا مسلمان مطلوب ترقی حاصل نہ کرسکا۔ حتیٰ کہ خود پاکستان کے لوگ اپنے ملک کے حالات سے اتنا زیادہ غیر مطمئن ہوئے کہ تعلیم یافتہ پاکستانیوں کی بہت بڑی تعداد باہر کے ملکوں میں چلی گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ نظریہ بذات خود غلط تھا کہ جس ملک میں صرف ایک قوم کے لوگ بستے ہوں وہاں خوب ترقی ہوگی۔ بلکہ اصل معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ ترقی کے لئے فطرت کا ایک اٹل قانون ہے۔ اور جب بھی کوئی قوم ترقی کرتی ہے تو وہ اسی قانون کے مطابق کرتی ہے۔ کوئی خودساختہ نظریہ کبھی کسی قوم کو ترقی کی طرف نہیں لے جاتا۔

فطرت کے قانون کے مطابق، ترقی کا تعلق چیلنج اور مسابقت پر ہے نہ کہ یکسانیت پر۔ کوئی قوم اس وقت ترقی کرتی ہے جب کہ وہ مسابقت کے ماحول میں ہو، جب کہ اسے دوسروں کی طرف سے چیلنج پیش آرہا ہو۔ جہاں چیلنج نہ ہو وہاں یقینی طور پر ترقی بھی نہ ہوگی۔ مسلمانوں کی ترقی کا راز یہ تھا کہ وہ غیر منقسم ہندستان میں ہندوؤں کے درمیان مثبت ذہن کے ساتھ رہتے۔ اس طرح دونوں کے درمیان صحت مند مقابلہ (healthy competition) جاری ہوتا۔ یہ مقابلہ دونوں کے لئے ترقی کا ضامن بن جاتا۔

جب بھی مختلف گروہ مل کر ساتھ رہیں تو ان کے درمیان مختلف قسم کے ناخوشگوار واقعات پیش آتے ہیں جو ایک دوسرے کے لئے شکایت کا باعث بنتے ہیں۔ ۱۹۴۷ سے پہلے ایسا ہی معاملہ غیر منقسم

ہندستان میں پیش آیا۔ یہاں ہندو اور مسلم دونوں طرف کے قائدین صحیح رہنمائی دینے میں ناکام رہے۔ ہندی اخبارات مسلمانوں کی باتوں کو زیادتی کا روپ دے کر پیش کرتے رہے۔ دوسری طرف اردو اخبارات مزید اضافہ کے ساتھ ہندوؤں کے واقعات کو تعصب اور ظلم کی شکل میں چھاپتے رہے۔ حالانکہ دونوں طرف کے لکھنے اور بولنے والوں کو یہ کرنا چاہیئے تھا کہ وہ اپنی اپنی قوم کو بتائیں کہ اس طرح کی ناخوشگوار باتیں ہر سماج میں پیش آتی ہیں۔ حتیٰ کہ ایسے ماحول میں بھی جہاں تمام لوگ ایک ہی مذہب اور ایک ہی کلچر کے ماننے والے ہوں۔ ان کو چاہیئے تھا کہ وہ لوگوں کے اندر یہ ذہن بنائیں کہ وہ اس طرح کے واقعات کو چیلنج کے روپ میں لیں، نہ کہ زیادتی کے روپ میں۔

اگر بروقت لوگوں کو یہ رہنمائی دی جاتی تو وہ جانتے کہ غیر منقسم انڈیا ترقیاتی امکان کے اعتبار سے موزوں ترین ملک ہے۔ یہاں وہ حالات پوری طرح موجود ہیں کہ آزاد ماحول میں دونوں فرقوں کے درمیان صحت مند مقابلہ جاری ہو۔ اور پھر فطرت کے قانون کے مطابق، دونوں تیزی کے ساتھ ترقی کا سفر طے کریں۔ مگر بروقت صحیح رہنمائی نہ ملنے کی وجہ سے دونوں میں سے کوئی بھی حقیقی ترقی حاصل نہ کر سکا۔

26

میرا احساس یہ ہے کہ ۱۹۴۷ سے پہلے ملک میں جو ہندو رہنما یا مسلم رہنما ابھرے ان میں سے کوئی بھی حقیقی معنوں میں کسی کریڈٹ کا مستحق نہیں۔ دونوں نے یکساں طور پر حریفانہ قسم کی تحریکیں چلائیں۔ ایک طرف ظفر علی خاں نے کہا:

دنیا میں بلائیں دو ہی ہیں — اک ساورکر اک گاندھی ہے
اک کفر کا چلتا جھکڑ ہے — اک ظلم کی چلتی آندھی ہے

دوسری طرف گرو گولوالکر نے یہ نظریہ پیش کیا کہ بھارت میں صرف ہندو ہی سچے نیشنلسٹ ہیں۔ کیوں کہ یہ صرف ہندو ہیں جو انڈیا کو ہولی لینڈ کے طور پر دیکھتے ہیں۔ اس سرزمین کا ہر ذرہ ان کے لئے مقدس ہے۔ مسلمان چونکہ نیشنلٹی کے ٹسٹ پر پورے نہیں اترتے اس لئے وہ

نیشنلسٹ نہیں ہیں۔ (بنچ آف تھاٹ از گرو گولوالکر)

عجیب بات ہے کہ مسلمانوں کے محبوب شاعر اقبال نے بھی یہی بات ان لفظوں میں کہی تھی:

خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے

مگر اسی کے ساتھ اقبال نے اس کے برعکس بات بھی ان لفظوں میں کہی:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے   جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

تاہم اس معاملہ میں مسلمانوں کا جو ذہن بنا وہ خواہ کسی اور کے موافق ہو یا نہ ہو، وہ اینٹی گرو گولوالکر ضرور تھا۔

یہ مزاج اتنا بڑھا کہ دونوں کی صحافت میں صرف الفاظ کا فرق رہ گیا۔ مثال کے طور پر ریڈینس ایک مسلم ہفتہ وار ہے اور آرگنائزر ایک ہندو ہفتہ وار۔ مگر باعتبار حقیقت دونوں میں اتنی زیادہ یکسانیت ہے کہ یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ آرگنائزر ہندوؤں کا ریڈینس ہے اور ریڈینس مسلمانوں کا آرگنائزر۔

برصغیر ہند میں مسلم پریس کی پہچان یہ بن گئی کہ وہ اینٹی ہندو لہجہ میں بولتا ہو اور ہندو پریس کی پہچان یہ بن گئی کہ وہ اینٹی مسلم لہجہ میں بولتا ہو۔ پر وانسانیت لہجہ نہ ہندو پریس کا رہا اور نہ مسلم پریس کا۔ اس معاملہ میں بعض استثناء ہو سکتے ہیں مگر برصغیر ہند کے پریس کا عمومی انداز یہی ہے۔

27

مہاتما گاندھی ہندستان کی سیاسی آزادی کو ملک کے تمام مسائل کا حل سمجھتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میرا مشن صرف انگریزوں کو ملک سے نکالنا نہیں ہے بلکہ میرا مشن ہر آنکھ کے آنسو پوچھنا ہے:

My mission is to wipe away tears from all faces.

مگر آزادی کے پچاس سال بعد بھی ملک کی یہ حالت ہے کہ رونے والی آنکھوں کی تعداد پہلے سے بھی زیادہ ہو چکی ہے۔ آج ہمارا ملک اس سے بھی زیادہ مسائل سے دوچار ہے جس سے وہ ۱۹۴۷ سے پہلے دوچار تھا۔

اس کا سبب کیا ہے۔ گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ مہاتما گاندھی اور ان کے ساتھیوں

کا یہ اندازہ درست نہ تھا۔ انگریز کے سیاسی غلبہ کا خاتمہ ملک میں ترقی اور خوشحالی کے نئے دور کا آغاز ہے۔ اس معاملہ میں ہمارے لیڈر معصومانہ حد تک ایک غلط اندازہ کا شکار ہوئے۔

وقت کے بہت سے دوسرے سیاسی رہنماؤں کی طرح، مہاتما گاندھی نے یہ سمجھ لیا کہ ملک میں انگریزوں کا راج تمام خرابیوں کا منبع (source of all evils) ہے۔ جب بدیشی راج ختم ہوگا اور دیشی راج ملک میں آئے گا تو اس کے بعد اپنے آپ سارے معاملات درست ہو جائیں گے۔ مگر یہ انسانی نفسیات اور تاریخی عوامل سے معصومانہ حد تک بے خبری کا نتیجہ تھا۔ کیونکہ سماجی حالات خود سماج کی اصلاح سے درست ہوتے ہیں، نہ کہ حکومتی افراد کی تبدیلی سے۔ یہی وجہ ہے کہ مہاتما گاندھی اور ان کے ساتھیوں کا لایا ہوا سوراج محض ایک قسم کا (coup) بن گیا، نہ کہ وہ چیز جس کو انقلاب (revolution) کہا جاتا ہے۔ کوپ میں صرف حکمراں افراد بدلتے ہیں، جب کہ انقلاب میں پورے سماجی حالات میں ایک نیا دور آجاتا ہے۔ (اس معاملہ کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، انگریزی اخبار پانیر ۲۶ جنوری ۱۹۹۷)

۲۰ جنوری ۱۹۹۷ کی مذکورہ میٹنگ میں میری بات سن کر ایک تعلیم یافتہ ہندو نے کہا کہ آپ مہاتما گاندھی پر تنقید کر رہے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ یہ مسئلہ کسی شخصیت کا نہیں ہے بلکہ ملک کا ہے:

I love Gandhi, but I love India more than Gandhi.

میں نے کہا کہ یہ تنقید نہیں ہے بلکہ وہ از سر نو جائزہ (re-assessment) ہے۔ اس قسم کا جائزہ اس لئے ضروری ہے کہ ہم بار بار اسی سابقہ غلطی کو دوہرا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ۱۹۷۷ میں جے پرکاش نرائن نے پورن سوراج (total revolution) کا آندولن چلایا، اس کا فلسفہ بھی عین وہی تھا۔ ہمارے پچھلے لیڈروں نے برٹش راج کو تمام خرابیوں کا سرچشمہ سمجھا تھا۔ اسی نظریہ کے تحت جے پرکاش نرائن نے کانگریس راج کو ملک کی تمام خرابیوں کا سرچشمہ سمجھ لیا اور اس کے خلاف دھواں دھار تحریک شروع کر دی۔

کانگریس راج ختم کرنے کی حد تک یہ تحریک صد فی صد کامیاب رہی۔ مگر مطلوب ریولیوشن

لانے میں وہ صد فی صد نا کام رہی۔ٹوٹل ریولیوشن تو درکنار جزئی ریولیوشن بھی اس کے ذریعہ سے نہ آسکا۔اس لئے انتہائی ضروری ہے کہ ماضی کی سیاسی تاریخ کا بے لاگ جائزہ لیا جائے تا کہ ہم ایک ہی غلطی کو بار بار دہرانے سے بچ جائیں۔حقیقت یہ ہے کہ انقلاب کا راز غیر سیاسی اداروں کی تبدیلی میں ہے، نہ کہ کسی سیاسی گدی کے گدی نشین کو بدلنے میں۔

28

زیکوسلوا کیا (Czechoslovakia) پر جرمن ڈکٹیٹر ہٹلر کے قبضہ کے بعد وہاں کے بہت سے یہودی بھاگ کر دوسرے ملکوں میں چلے گئے۔ان میں ایک یہودی جوڑا ڈاکٹر نیڈل اور مسز نیڈل ہندستان آئے۔یہ لوگ ایک دستکاری کے ماہر تھے جو اس وقت کے زیکوسلوا کیا میں پائی جاتی تھی۔وہ مخصوص ٹیکنیک سے شیشہ کو پگھلا کر اس سے آرائشی چیزیں بناتے تھے۔یہ ۱۹۳۸ کا زمانہ تھا جب کہ ہندستان کی کئی ریاستوں میں کانگریس کی حکومت پہلی بار قائم ہوئی تھی۔یو پی گورنمنٹ کے ٹیکنیکل ایجوکیشن کے ڈپارٹمنٹ نے اس یہودی جوڑے کو بنارس ہندو یونیورسٹی میں ٹھہرایا۔اور یہ انتظام کیا کہ وہ اپنا یہ فن ہندستانیوں کو سکھائیں۔

یو پی کی کانگریس حکومت کے تعاون سے جن لوگوں نے اس صنعت کو سیکھا ان میں میرے بڑے بھائی عبدالعزیز خاں (وفات ۱۹۸۸) بھی تھے۔اس فن کو سیکھنے کے بعد انھوں نے ۱۹۴۴ میں اعظم گڈھ میں لائٹ ایڈ کمپنی کے نام سے ایک کارخانہ کھولا جو بعد کو لائٹ اینڈ کمپنی لمٹیڈ بن گیا۔

میرے بھائی ڈاکٹر نیڈل کے بہت سے قصے سناتے تھے۔انھوں نے بتایا کہ ڈاکٹر نیڈل ڈسپلن کا بہت زیادہ پابند تھا۔ایک منٹ ادھر اُدھر ہونا اس کو گوارہ نہ تھا۔ایک بار اس نے زیر تربیت نوجوانوں کو گورنمنٹ کی کوئی ہدایت بتائی۔ایک مرحلہ میں اس کو محسوس ہوا کہ لوگ سختی سے اس ہدایت کی پابندی نہیں کر رہے ہیں۔اس نے تقریباً چیخ کر کہا کہ یہ ایک سرکاری حکم ہے:

It is a government rule.

میرے بھائی جو سامان تیار کرتے تھے وہ زیادہ تر باہر کے علاقوں میں بھیجا جاتا تھا۔مثلاً

ساؤتھ انڈیا، سری لنکا، وغیرہ۔ یہ پورا کام ڈاکخانہ کے ذریعہ ہوتا تھا۔اس زمانہ میں ڈاکخانہ نہایت صحت کے ساتھ کام کرتا تھا۔ایک بار ایک پوسٹ مین نے ہماری کوئی ڈاک گڑ بڑ کردی۔ بھائی صاحب نے اس کی شکایت لکھ کر ڈاکخانہ بھیج دی۔اس کے بعد ڈاکخانہ کا پورا محکمہ، حتیٰ کہ پوسٹ آفس سپرنٹنڈنٹ اس طرح سرگرم ہوگئے جیسے کہ کوئی ہنگامی صورت حال پیدا ہوگئی ہو۔ یہ معاملہ صرف اس وقت ختم ہوا جب کہ پوسٹ مین نے آکر میرے بھائی سے معافی مانگی اور انھوں نے اس کو تحریری معافی نامہ دے دیا۔

یہ ۱۹۴۷ سے پہلے کا وہ ہندستان تھا جس کو بہت سے دوسرے دیکھنے والوں کے ساتھ میں نے بھی دیکھا اور جانا۔آج یہ ہندستان کہیں موجود نہیں۔آج یہ حالت ہے کہ سرکاری ہدایات آتی ہیں اور دفتروں میں فائل کرکے رکھ دی جاتی ہیں۔نہ کوئی ان کو سنجیدگی کے ساتھ پڑھتا ہے، اور نہ وہ ان پر عمل کرتا ہے۔

۱۹۴۷ کے بعد جب ہمارے سماج میں بگاڑ آیا اور ہر شعبہ میں گراوٹ کے آثار ظاہر ہوئے تو ہمارے نئے حکمرانوں نے اس کا حل یہ نکالا کہ وہ ہر مسئلہ پر ایک قانون بنائیں۔انگریزوں نے اپنے دوسو سالہ حکومت کے دوران صرف پانچ سو قانون بنائے تھے۔مگر آزادی کے بعد ہماری حکومت نے پچاس سال کے اندر پانچ ہزار سے زیادہ قوانین بناڈالے۔ان کے علاوہ قاعدوں اور ضابطوں کی صورت میں روزانہ جو احکام جاری ہوتے رہتے ہیں ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔مگر آج یہ حالت ہے کہ سرکاری دفتروں میں کوئی شخص قانون اور ضابطہ کے حوالہ سے اپنا کوئی حق نہیں پاسکتا۔اب سرکاری دفتروں سے لے کر عدالتوں تک ہر جگہ رشوت اتنی زیادہ عام ہوچکی ہے کہ مزید پیسہ خرچ کئے بغیر کسی کا کوئی کام ہونا ممکن ہی نہیں۔

قانون کی کثرت نے موجودہ ہندستان کو قانون کا جنگل بنادیا ہے۔قوانین کی یہ کثرت ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے، نہ کہ معاون۔نئی دہلی کے ایک سینئر وزیر نے جون ۱۹۹۸ میں اپنی ایک گفتگو کے دوران کہا کہ میں حکومت میں بڑے بڑے ارادے لے کر آیا تھا مگر یہاں حالت یہ ہے کہ میرا بیش تر

وقت قانون اور ضابطہ کی خانہ پری میں الجھا رہتا ہے۔ دفتر میں ہر روز میرا تقریباً دس گھنٹہ کاغذوں کے انبار پر دستخط کرنے میں گذر جاتا ہے۔

۱۹۴۷ سے پہلے انگریزی حکومت کے زمانہ میں موجودہ قسم کے کرپشن کا کوئی تصور ہی نہ تھا جو آج ہر جگہ پایا جارہا ہے۔ میں نے ایک میٹنگ میں کہا کہ اس صورت حال کی ذمہ داری سب سے زیادہ ہمارے ان لیڈروں پر ہے جو تحریک آزادی کے ہیرو سمجھے جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان ہیروؤں نے اس حقیقت کو کیوں نہیں جانا کہ ملک کو انگریزوں سے آزاد کر کے وہ اس کو جس سماج کے حوالہ کر رہے ہیں وہ ایک دولت پرست سماج ہے۔ انگریزی دور میں محکوم ہونے کی بنا پر اس کی دولت پرستی چھپی ہوئی ہے۔ جیسے ہی اس کو حاکمانہ حیثیت حاصل ہوگی اس کی دولت پرستی پورے طور پر ابھر آئے گی اور ملک لوٹ اور بھرشٹاچار کا جنگل بن جائے گا جیسا کہ عملاً پیش آیا۔

آزادی کے بعد ملک کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے کہا تھا کہ ہمارے ملک میں سب سے زیادہ جس چیز کی کمی ہے وہ سائنٹفک ٹمپر (سائنسی مزاج) ہے۔ یہ بلاشبہ ایک صحیح بات تھی۔ مگر یہ بات ان کو ۱۹۴۷ سے پہلے جاننا چاہئے تھا۔ ہمارے لیڈروں، ہندو اور مسلم دونوں پر فرض کے درجہ میں ضروری تھا کہ وہ سب سے پہلے یہ کام کریں کہ قوم سے دولت پرستی کا مزاج ختم کریں اور اس کے اندر صحیح معنوں میں سائنسی مزاج پیدا کریں۔ اگر وہ ۱۹۴۷ سے پہلے ذہنی تعمیر کا یہ کام کرتے تو آزادی بلاشبہ ہمارے لئے ایک نعمت ہوتی۔ مگر اس ابتدائی تیاری کے بغیر جب وہ آزادی لائے تو فطری طور پر یہ ہوا کہ ملک مالی بھرشٹاچار کا جنگل بن گیا۔

موجودہ زمانہ میں ایک لفظ کا بہت زیادہ چرچا کیا جاتا ہے، اور وہ دیش بھکتی ہے۔ میں دیش بھکتی کو ملک کی نئی تعمیر کے لئے بے حد اہم سمجھتا ہوں۔ مگر دیش بھکتی کے شور میں مجھے کوئی سچا دیش بھکت دکھائی نہیں دیتا۔ اپنے علم اور تجربہ کی بنیاد پر میرا شدید احساس ہے کہ ہمارے لیڈروں میں شاید کوئی ایک شخص بھی نہیں جو حقیقی معنوں میں دیش بھکت ہو۔ مجھے ہر ایک صرف خویش بھکت دکھائی دیتا ہے، نہ کہ دیش بھکت۔

29

یشپال ایک ہندی ناول نگار ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی تشدد پسند انقلابی کی حیثیت سے شروع کی۔ ۱۹۳۱ میں انگریزی حکومت نے انھیں گرفتار کرلیا۔ بعد کو وہ ایک زیرک دانشور کی حیثیت سے ابھرے۔ انھوں نے پریم چند کی روایات کو آگے بڑھایا۔ ''جھوٹا سچ'' ان کا ایک بہت مشہور ناول ہے۔

اس ناول میں وہ بتاتے ہیں کہ ۱۹۴۷ سے پہلے برصغیر ہند کے نیتاؤں نے جن نعروں پر قوم کو سرحد کے دونوں طرف اٹھایا وہ سب تباہ کن نعرے تھے۔ نعروں کی اس سیاست نے پورے برصغیر کو تباہی کے سوا اور کچھ نہیں دیا۔ نیتاؤں کے نعرے صرف جھوٹے تھے جن کو سچ کے روپ میں پیش کیا گیا۔ ''جھوٹا سچ'' اسی کی کہانی ہے، تاہم ان کے ناول کا آخری باب پرامید الفاظ پر ختم ہوتا ہے۔ ''دیش کا مستقبل چند نیتاؤں کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ جنتا کے ہاتھ میں ہے''۔

مگر ناول نگار کے یہ الفاظ بھی موجودہ مدت میں ایک فریب کے سوا اور کچھ نہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہندستان کا نظام کیا وہ سو کروڑ باشندے چلائیں گے جن کو جنتا کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوسکتا۔ عملی طور پر جو ہوگا وہ یہ کہ ملک میں الیکشن کرائے جائیں گے۔ اس الیکشن میں جو لوگ جیتیں گے وہی حکومت بنا کر ملک کا نظام چلائیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دوبارہ یہ نیتا ہی ہوں گے جو ملک کے حال اور مستقبل کے مالک ہوں گے نہ کہ جنتا۔

ہمارے ملک کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ یہاں کی عام جنتا ایک بےشعور بھیڑ ہے۔ تعلیمی پسماندگی کی بنا پر وہ نعرہ اور حقیقت کے درمیان فرق نہیں جانتے۔ وہ استحصالی الفاظ اور تعمیری الفاظ کے درمیان تمیز نہیں کرسکتے۔ جنتا کی یہی بےشعوری ہے جس نے نیتاؤں کو یہ موقع دیا کہ وہ جھوٹ کو سچ کے روپ میں پیش کریں اور جنتا اس پر یقین کرتے ہوئے انھیں اپنا ووٹ دے۔

۱۹۴۷ سے پہلے جب مہاتما گاندھی سیاسی آزادی کا آندولن چلا رہے تھے تو ان سے کہا گیا کہ آپ ملک کو آزاد کرکے اسے جن لوگوں کے ہاتھ میں دینا چاہتے ہیں وہ اَشکچھت لوگ ہیں اور اَشکچھت

لوگ کسی ملک کا نظام درست طور پر نہیں چلا سکتے۔ مہاتما گاندھی نے اس کے جواب میں کہا کہ میرے دیش کے لوگ اشکچھت ہیں، مگر وہ اگیانی نہیں۔ لیکن پچھلے پچاس سال کا تجربہ بتاتا ہے کہ جو لوگ اشکچھت ہوں وہ ہمیشہ اگیانی ہی ہوتے ہیں۔ گیان کے لئے شکچھا دینا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ جسم کی تندرستی کے لئے غذا، یہ فطرت کا ایک اصول ہے جس میں کوئی استثنا نہیں۔

جنتا کی اس کمزوری نے ہمارے لیڈروں کو یہ موقع دیا کہ وہ بڑے بڑے الفاظ بول کر ان کا سیاسی استحصال کریں۔ جو لوگ سنجیدہ طور پر قوم کی تعمیر کرنا چاہتے ہوں وہ ہمیشہ لو پروفائل میں کلام کرتے ہیں۔ لیکن بے شعور جنتا لو پروفائل کی زبان نہیں سمجھتی۔ چنانچہ وہ ان لوگوں کے پیچھے دوڑ پڑتی ہے جو ہائی پروفائل میں بول رہے ہوں۔ سنجیدہ قائد لوگوں کے سامنے حقیقت پسندانہ پروگرام پیش کرتا ہے۔ مگر بے شعور جنتا حقیقت پسندانہ پروگرام کی اہمیت کو سمجھ نہیں پاتی۔ چنانچہ وہ ان لوگوں کے پیچھے دوڑ پڑتی ہے جو فرضی نقشے بنا کر جذباتی تقریریں کر رہے ہوں۔

یہ ساری خرابی اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ بے شعور یا کم علم لوگ معاملات کا تجزیہ نہیں کر پاتے۔ اس لئے وہ استحصالی نیتاؤں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر مئی ۱۹۹۸ میں ہندستان کے موجودہ حکمرانوں نے فوجی خزانہ پر نا قابل برداشت بوجھ ڈال کر پانچ ایٹمی دھماکے کئے۔ اس پر امریکا نے اعتراض کیا تو ہمارے لیڈروں نے کہا کہ امریکا کو ہمارے اوپر اعتراض کرنے کا حق نہیں۔ کیونکہ ہم نے تو صرف پانچ ایٹمی دھماکے کئے ہیں، جب کہ امریکا اب تک دو ہزار سے زیادہ ایٹمی دھماکے کر چکا ہے۔ اس طرح ہمارے لیڈروں نے عوام کو جذباتی شراب پلا کر اتنا بے خود کر دیا کہ وہ معاملہ پر زیادہ گہرائی کے ساتھ سوچ ہی نہ سکیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں اصل تقابل دھماکوں کی گنتی کا نہیں ہے بلکہ ہندستان اور امریکا کے درمیان اقتصادی فرق کا ہے۔ امریکا نے دو سو سال تک مسلسل تعمیری عمل کر کے اپنے ملک کو اعلیٰ ترین ترقی یافتہ ملک بنا دیا۔ وہاں ہر قسم کی شہری سہولتیں اتنی زیادہ ہیں کہ ہندستان سے لاکھوں لوگ حتیٰ کہ خود ہمارے لیڈروں کے بیٹے اور بیٹیاں بھاگ بھاگ کر امریکا پہنچ رہے ہیں۔ ایسی حالت میں

ہمارے لیڈروں پر فرض ہے کہ پہلے وہ ملک کے شہریوں کو وہ تمام سہولتیں فراہم کریں جو امریکا کے شہریوں کو حاصل ہیں۔ اس کے بعد ہی وہ ایٹمی دھماکے کر سکتے ہیں۔ موجودہ حالت میں ایٹمی دھماکہ ایک ایسا ایٹمی تعیش ہے جس کا تحمل ہندستان جیسا غریب ملک نہیں کر سکتا۔

دہلی کے ایک صاحب نے اس معاملہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ دہلی میں میرے پاس اتنی پراپرٹی ہے کہ اگر میں ان سب کو بیچ دوں تو میں ایک ہوائی جہاز خرید سکتا ہوں۔ مگر میرا ہوائی جہاز خریدنا صرف اس قیمت پر ہوگا کہ اگلے دن میں اور میرے بچے بالکل بے سہارا حالت میں سڑک پر ہوں گے۔ ہندستان کا ایٹمی دھماکہ جس اقتصادی تباہی کی قیمت پر ہوا وہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص اپنا سارا اثاثہ بیچ کر ایک ہوائی جہاز خرید لے اور فخر سے کہے کہ فلاں شخص کی طرح میں بھی ہوائی جہاز کا مالک ہو گیا، حالانکہ اس کے بعد اس کے پاس نہ رہنے کا کوئی گھر ہو اور نہ کھانے پینے کا کوئی سامان۔

30

آل انڈیا مسلم لیگ کے لیڈر چودھری خلیق الزماں (۱۹۷۳-۱۸۸۸) ۱۹۴۷ میں فخر کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ نہرو سے زیادہ سیاست میرا کوچوان جانتا ہے۔ چودھری خلیق الزماں اور دوسرے مسلمان لیڈر اس بھرم میں تھے کہ ''مسلمان'' چونکہ ہزار سال سے حکومت کرتے چلے آرہے ہیں۔ اس لئے حکومت و سیاست ان کا خاندانی ہنر بن چکا ہے۔ پاکستان بن جائے گا تو اپنے آپ ہی مسلمان اس کا نظام بہتر طور پر چلانے لگیں گے۔ مگر پاکستان کی پچاس سالہ تاریخ ثابت کر رہی ہے کہ یہ مفروضہ مکمل طور پر بے بنیاد تھا۔

قومی یا ملی تعمیر ایک لمبا عمل ہے۔ وہ حال میں شروع ہو کر مستقبل میں اپنی تکمیل تک پہنچتا ہے۔ اس لئے قومی زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ اس کو ایسے صاحب بصیرت لیڈر مل جائیں جو مستقبل بیں ہوں اور اپنے زمانہ میں قومی عمل کو ایسا رخ دے سکیں جو مستقبل میں مطلوب نتیجہ ظاہر کرنے والا ہو۔

۱۹۴۷ سے پہلے اس بات کی ضرورت تھی کہ قوم کو تعلیم کے رخ پر چلایا جائے کیوں کہ تعلیم ہی وہ انسان بناتی ہے جو زندگی کے کاروبار کو بہتر طور پر سنبھالنے کا اہل ہو۔ الطاف حسین حالی (وفات ۱۹۱۴) اپنے زمانے کے مسلمانوں میں ایک بدنام شخص کی حیثیت رکھتے تھے۔ معاصر مسلمان ان کو اپنے رہنما کے طور پر قبول نہ کر سکے، تاہم انھوں نے اس معاملہ میں نہایت صحیح اور سچی بات کہی تھی:

بس اب وقت کا حکم ناطق یہی ہے — کہ دنیا میں جو کچھ ہے تعلیم ہی ہے

مگر ۱۹۴۷ سے پہلے کے دور میں تعلیم کے بجائے سیاسی آزادی کو زیادہ اہمیت دے دی گئی۔ اس غلط ترجیح کا بھیانک نتیجہ یہ نکلا کہ ایک عظیم ملک ایک ایسی بھیڑ کے ہاتھ میں آ گیا جس کو یہ معلوم ہی نہ تھا کہ اس کے نظام کو کس طرح چلانا ہے۔

آزادی کے بعد سب سے زیادہ اہمیت اس بات کی تھی کہ ملک میں بہترین مواقع کار پیدا کئے جائیں تا کہ ہر آدمی کو اپنے ترقیاتی حوصلوں کی تکمیل کے اسباب ملتے چلے جائیں۔

مگر آزادی کے بعد جس قیادت کے ہاتھ میں ملک کا سیاسی اختیار ملا وہ ایک بے شعور قیادت تھی۔ اس نے انتہائی نادانی کے ساتھ یہ کیا کہ زندگی کے تمام شعبوں کو حکومت کے کنٹرول میں لینے کو سب سے اہم کام سمجھ لیا۔ اس نے دیو پیکر پبلک سکٹر (صحیح تر لفظ میں سرکاری سکٹر) قائم کئے۔ ہر سرگرمی کے لئے سرکاری پرمٹ اور سرکاری لائسنس کو ضروری بنا دیا۔ سماجی فلاح کے نام پر ایسے غیر فطری قوانین بنائے کہ جے آر ڈی ٹاٹا کے الفاظ میں — ''ایک کمپنی کا مالک اپنی بیوی کو طلاق دے سکتا ہے مگر وہ اپنے ایک کارکن کو برخاست نہیں کر سکتا۔''

ٹاٹا کا اشارہ اس صورت حال کی طرف تھا کہ لیبر کے حقوق کے تحفظ کے نام پر ایسے قوانین اور ضابطے بنائے گئے جو مکمل طور پر لیبر کے حق میں تھے۔ ہمارے حکمرانوں نے اپنے سوشلسٹ ذہن کی بنا پر یہ فرض کر لیا کہ کمپنی کا مالک لازماً ظالم ہوگا اور کمپنی کا ملازم لازماً مظلوم۔ چنانچہ انھوں نے آزادی کے بعد ایسے قوانین اور ضابطے بنائے جو یک طرفہ طور پر ملازمین کی موافقت میں تھے۔ یہ قوانین ملازمین کے حق میں اندھا ہتھیار بن گئے ہیں جن کے ذریعہ وہ اقتصادی ادارہ کو اکسپلائٹ کریں اور اقتصادی

ادارے بے بسی کے ساتھ اس کا تماشہ دیکھتے رہیں۔ مزید یہ کہ تحفظِ حقوق کے اس سوشلسٹ نظریہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ اقتصادی عمل سے مسابقت کا عنصر ختم ہوگیا۔ ان غیر فطری قوانین نے کروڑوں لوگوں کو اس بات سے بے خوف بنادیا کہ ان کے جاب کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ انھیں یقین ہوگیا کہ وہ ڈیوٹی ادا کئے بغیر بھی اپنے حقوق کو پا سکتے ہیں۔ اس طرح ان نام نہاد قوانین نے ملک کے کروروں لوگوں کو کاہل بنادیا اور ڈیوٹی کی اہمیت کا احساس ان کے اندر سے ختم کردیا۔

31

ملک کی تقسیم کی تحریک ایک غیر فطری تحریک تھی۔ مزید یہ کہ وہ انتہائی غیر فطری انداز میں چلائی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا نقصان واقعی نقصان سے کئی گنا زیادہ ہوگیا۔

تقسیم بذات خود کوئی گناہ کی بات نہیں۔ مگر کوئی کام حتیٰ کہ کھانا اور پینا بھی اگر غلط طریقہ سے کیا جائے تو وہ آدمی کے لئے نقصان کا سبب بن جائے گا۔ یہی معاملہ تقسیم کے ساتھ پیش آیا۔

۱۔ پہلی بات یہ کہ تقسیم کی تحریک کسی ایجابی سوچ کے تحت نہیں اٹھی وہ تمام تر ردعمل کے تحت اٹھی۔ کچھ ہندوؤں کی فرقہ وارانہ تحریک نے مسلمانوں میں جوابی فرقہ واریت پیدا کی۔ اور اس نے آخر کار تقسیم کی تحریک کا رخ اختیار کرلیا۔ اس تحریک کے سب سے بڑے قائد زبردست نیشنلسٹ اور لمبی مدت تک کانگریسی تھے۔ بعض واقعات کی بنا پر وہ کانگریسی قائدین سے غصہ ہوگئے اور آل انڈیا مسلم لیگ میں شامل ہوکر تقسیم کی تحریک کے علمبردار بن گئے۔

ردعمل کی نفسیات کے تحت جو تحریک شروع کی جائے وہ منفی نتائج تو ضرور پیدا کرسکتی ہے مگر وہ مثبت نتائج کا سبب نہیں بن سکتی۔ یہی پاکستان کے ساتھ پیش آیا۔

۲۔ تقسیم کے بعد پاکستان عملاً جہاں بننے والا تھا وہ مسلم اکثریت کا علاقہ تھا۔ مگر یہ تحریک زیادہ تر ان علاقوں میں چلائی گئی جہاں مسلمان اقلیت کی حیثیت رکھتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اکثریتی علاقہ کے مسلمان اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ مل جل کر رہ رہے تھے۔ ان کے یہاں ''ہندو مسئلہ'' نام کی کوئی چیز موجود نہ تھی۔ اس لئے ان کے درمیان تقسیم کی تحریک پنپ نہ سکی۔ البتہ مسلم

اقلیت والے علاقے کے مسلمان ہندو کی طرف سے عدم تحفظ کے احساس میں مبتلا تھے۔ اس لئے یہاں اس تحریک کو مفید میدان مل گیا۔ مگر تحریک کا یہ انداز خطرناک حد تک غیر فطری تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان عملاً مسلم اکثریت کے علاقہ میں بنا مگر اس کی قیمت تمام تر اس علاقہ کے مسلمانوں کو دینی پڑی جہاں وہ اقلیتی حیثیت رکھتے تھے، کیوں کہ اسی علاقہ میں پاکستانی تحریک کی دھوم مچائی گئی تھی۔

۳۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ پاکستان کی تحریک کی قیادت مسٹر طبقہ نے کی۔ علماء کا طبقہ تقریباً ۹۹ فیصد اس سے الگ رہا۔ بالفاظ دیگر پاکستان کی تحریک ایک قومی اور مادی تحریک تھی۔ وہ کسی بھی درجہ میں کوئی مذہبی یا اسلامی تحریک نہ تھی۔ مگر عوام کا استحصال کرنے کے لئے مسلسل طور پر اس کے حق میں اسلام کا نام استعمال کیا گیا۔ اس کی حمایت میں یہ لفظی نعرہ وضع کیا گیا کہ: پاکستان کا مطلب کیا، لا الٰہ الا اللہ۔

ایک قومی تحریک کو اسلامی تحریک بنانا سراسر دو عملی کا ایک فعل تھا۔ یہ وہی چیز تھی جس کو شریعت کی زبان میں منافقت کہا جاتا ہے۔ یہ منافقانہ سیاست کا ایک ایسا واقعہ ہے جس کی کوئی دوسری مثال اسلام کی پوری تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ منافقانہ روش پاکستان کی تمام پالیسیوں کا اہم ترین عنصر بن گیا۔ ہر غیر دینی کام کو دینی اصطلاح میں بیان کرنا پاکستان کے دانشوروں کا کمال قرار پایا۔ اسلام کی پوری تاریخ میں میرے علم کے مطابق، کوئی بھی مسلم گروہ ایسا نہیں جس نے منافقت ہی کو اپنی تمام پالیسیوں کی بنیاد بنایا ہو۔ تقسیم کے نتیجہ میں بننے والا مسلم ملک ہی اس کی واحد تاریخی مثال ہے جس کو برعکس طور پر پاکستان کہا جا سکتا ہے۔

۴۔ پاکستان جب بنا تو لیڈروں کی ناعاقبت اندیشانہ سیاست کے نتیجہ میں سرحد کے دونوں طرف بھیانک فسادات پھوٹ پڑے۔ لوٹ مار اور قتل وغارتگری کا زبردست سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس کے نتیجہ میں نفرت کی ایک خونیں فصل اگ آئی۔

تقسیم کے بعد سرحد کے دونوں طرف عرصہ دراز تک لوگ زبان اور قلم کے ذریعہ اس کی خونیں داستانیں دہراتے رہے۔ اس داستان سرائی کا بدترین پہلو یہ تھا کہ پاکستان میں لکھی جانے والی کتابوں میں صرف ان واقعات کا تذکرہ تھا جو بوقت تقسیم ہندوؤں نے مسلمانوں پر کئے۔ اور

انڈیا میں لکھی جانے والی کتابوں میں صرف ان واقعات کا تذکرہ تھا جس میں ہندو، مسلمانوں کے ظلم کا شکار ہوئے۔ مکمل رپورٹنگ کی جاتی تو دونوں کے درمیان توازن قائم رہتا مگر مذکورہ قسم کی یکطرفہ رپورٹنگ نے سرحد کے دونوں طرف نفرت اور عداوت کی آگ بھڑکا دی جو کسی طرح ختم ہوتی ہوئی نظر نہیں آتی۔

۵۔ پاکستان کی بنیاد اگر اسلام پر ہوتی تو وہاں اپنے پڑوسیوں کے لئے محبت اور خیر خواہی کا جذبہ ابھرتا، کیونکہ اسلام دوسری قوموں کو اپنا مدعو سمجھتا ہے۔ اور مدعو کے حق میں ہمیشہ محبت کی نفسیات پیدا ہوتی ہے نہ کہ عداوت کی نفسیات۔ مگر پاکستان کی بنیاد باعتبار حقیقت اسلام تھی ہی نہیں۔ پاکستان ہندوؤں سے قومی نفرت کی بنیاد پر بنا۔ اسی کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ پاکستان بننے کے بعد وہاں رات دن ہندو اور ''بھارت'' کے خلاف نفرت کا پروپیگنڈہ ہونے لگا۔ بھارت کا لفظ پاکستانی زبان میں، ایک نفرت انگیز چیز کے ہم معنٰی بن گیا۔ پاکستانی علماء اور دانشوروں کا ذہن یہ بن گیا کہ پاکستان کی بقا اور اس کے استحکام کے لئے ضروری ہے کہ ہر پاکستانی کو بھارت سے متنفر کر دیا جائے۔

پچھلے پچاس سال میں پاکستان کی ہر تقریر وتحریر بھارتی نفرت سے بھری ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ بلا شبہ ایک عظیم نقصان ہے۔ کیونکہ کوئی قوم نفرت کی بنیاد پر نہ کھڑی ہوسکتی ہے اور نہ ترقی کر سکتی ہے۔

۶۔ تقسیم کا مطلب علیٰحدگی ہے۔ دو بھائیوں میں جائداد کی تقسیم ہو تو دونوں کی فلاح اس میں ہے کہ اول دن ہی ہر چیز کا کامل بٹوارہ ہو جائے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ خاندانی بٹوارہ کے بعد اگر ایک درخت بھی متنازع رہ جائے تو اس پر بھی لڑائی شروع ہو جاتی ہے جو دونوں کو تباہ کر کے رکھ دیتی ہے۔

پاکستان کے قائدین کے لئے فرض کے درجہ میں ضروری تھا کہ وہ اس حقیقت کو جانیں اور ۱۵ راگست ۱۹۴۷ ہی کو اس طرح مکمل طور پر الگ ہو جائیں کہ اس کے بعد کوئی بھی چیز غیر منقسم حالت میں باقی نہ رہے۔ مگر اس سنگین حقیقت کو نہ پاکستانی قائدین نے سمجھا اور نہ ہندستانی قائدین نے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقسیم کے باوجود کشمیر کی ریاست نزاعی حالت میں پڑی رہی۔

یہ بلاشبہ دونوں طرف کے قائدین کے لئے ایک ہمالیائی غلطی تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ انڈیا اور پاکستان دونوں ہی کے وسائل کا پچاس فیصد سے زیادہ حصہ کشمیر کے نزاع پر قربان ہو رہا ہے۔ پچاس سال گذرنے کے باوجود یہ مسلسل تباہی ختم ہوتی ہوئی نظر نہیں آتی۔

دونوں ملکوں کے قائدین کا یہ اہم ترین فرض تھا کہ تقسیم کے وقت ہی وہ کسی بھی صورت میں اس مسئلہ کا مکمل خاتمہ کر دیتے۔ مگر دونوں میں سے کسی بھی ملک کی قیادت نے اس معاملہ میں تدبر کا ثبوت نہیں دیا۔ پاکستان کے سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے بعد از خرابیٔ بسیار ۱۹۷۲ء میں وہ معاہدہ کیا جس کو عام طور پر شملہ ایگریمنٹ کہا جاتا ہے۔ اس معاہدہ کے تحت، پاکستانی وزیر اعظم نے بلا اعلان یہ مان لیا تھا کہ قبضہ کی لائن (LoC) دونوں ملکوں کے درمیان تسلیم شدہ سرحد ہوگی۔

پاکستان کے لوگوں نے اگر ۱۹۷۲ کے اس معاہدے کو دل سے مان لیا ہوتا تو پچھلے پچیس سال میں پاکستان نے اتنی ترقی کی ہوتی کہ اس کے عوام کشمیر کو بھول جاتے۔ مگر پاکستانی حکمرانوں نے کاغذ پر تو دستخط کر دیئے مگر وہ اس کو اپنی عملی پالیسی نہ بنا سکے۔ ۱۹۷۲ کے بعد پاکستان میں ایک نئی تاریخ بننے والی تھی مگر وہ بنتے بنتے رہ گئی۔

32

۱۹۴۷ سے پہلے کے دور میں ایک انقلابی شاعر نے ایک نظم لکھی جس کا ایک شعر یہ تھا:

بُرجِ محن سے نکلا سورج، روشن اپنا مستقبل ہے

اس تصور کو لے کر طفیل احمد منگلوری نے ایک کتاب لکھی جس کا نام انھوں نے روشن مستقبل رکھا۔ یہ کتاب اس زمانہ میں بہت مقبول ہوئی۔ اس واقعہ کے تقریباً ۶۰ سال بعد یکم جون ۱۹۹۸ کو میں آل انڈیا نشریات سن رہا تھا۔ اس تاریخ کو بھاجپا گورنمنٹ کے وزیر مالیات مسٹر یشونت سنہا نے ۹۹-۱۹۹۸ کا بجٹ پیش کیا۔ اپنی بجٹ اسپیچ انھوں نے اس جملے سے شروع کی کہ آج ایک نیا انڈیا ابھر رہا ہے:

A new India is rising.

انھوں نے کسی قدر جوش کے ساتھ کہا کہ ۱۱ مئی کو پوکھرن سے جو سفر شروع ہوا وہ پیچھے جانے والا نہیں۔ میں نے سوچا کہ اپنی نوجوانی کی عمر سے اب تک میں بار بار مختلف لفظوں میں یہ بات سنتا رہا ہوں۔ مگر آج تک یہ الفاظ واقعہ نہیں بنے۔ نہ سورج نے نکل کر ہماری تاریکیوں کو روشن کیا اور نہ نئے انڈیا کا محل تعمیر ہو سکا۔ بظاہر مستقبل قریب تک اس کی کوئی امید نہیں۔

اس ناکامی کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے رہنما ایک ایسی چیز سے امید باندھتے رہے ہیں جس سے اس کا حصول ممکن ہی نہیں تھا۔ ۱۹۴۷ سے پہلے لوگوں نے جس چیز کو روشن مستقبل سمجھا تھا اس کا تعلق صرف سیاسی تبدیلی سے تھا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ انگریزی راج کا ختم ہونا ملک کے افق پر نئی صبح کا طلوع ہونا ہے۔ حالانکہ محض پولیٹیکل ٹیم کی تبدیلی کسی قوم کے لئے روشن مستقبل کی ضمانت نہیں۔ اسی طرح اب ۱۹۹۸ میں ایٹمی دھماکہ کے بعد نئے انڈیا کی باتیں کی جارہی ہیں۔ مگر یہ بھی محض ایک فرضی امید ہے۔ ایٹمی دھماکہ کا تعلق ایک ایسی سرگرمی سے ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے تمام تر سلبی ہے اور ایک سلبی سرگرمی سے خواہ بظاہر وہ کتنی ہی بڑی ہو، کوئی ایجابی نتیجہ برآمد ہونے والا نہیں۔ اس قسم کی ایٹمی سرگرمی صرف وسائل کو کھانے والی ہے نہ کہ وسائل کو مفید چیزوں میں تبدیل کرنے والی۔

روشن مستقبل یا نئے انڈیا کا ظہور جس چیز پر منحصر ہے وہ وسیع تر سماجی تبدیلی ہے نہ کہ محض سیاسی تبدیلی۔ پھیلے ہوئے ملک کے قدرتی ذرائع مثبت مقاصد کے لئے استعمال ہوں۔ ایسی پلاننگ کی جائے جس کے نتیجہ میں لوگوں کو صاف پانی اور تازہ ہوا مل سکے۔ ملک کو ایسا ایڈمنسٹریشن دیا جائے جس کے تحت دفتروں میں رشوت کے بغیر کام ہو۔ عدالتوں میں ایک عام آدمی کو انصاف ملے۔ سڑک، بجلی، ٹیلی فون اور دوسری ضروری چیزیں معیاری صورت میں دستیاب ہوں۔ ریل اور ٹرانسپورٹ کے شعبے اس طرح منظّم ہوں کہ لوگوں کے لئے محفوظ اور بروقت سفر کرنا ممکن ہو جائے۔ اسپتالوں میں ہر آدمی بہ آسانی اپنا علاج پا سکے۔ مگر ان چیزوں کا تعلق نہ ایٹمی دھماکہ سے ہے اور نہ سیاسی گدی پر ایک کو ہٹا کر دوسرے کو بٹھانے سے۔

میرے جیسے ایک آدمی کو مذکورہ قسم کے الفاظ سے کوئی خوشی نہیں ہوتی۔ میری بوڑھی آنکھیں

ملک میں تعمیر و ترقی کا ایک حقیقی عمل دیکھنا چاہتی ہیں۔مگر بدقسمتی سے ابھی تک اس کا آغاز بھی نہیں ہوا۔

33

ہندستان نے بھارتیہ جنتا پارٹی کی سیاسی قیادت کے تحت پانچ ایٹمی دھماکے کئے۔ یہ دھماکے ۱۱ مئی اور ۱۳ مئی ۱۹۹۸ء کو پوکھرن (راجستھان) میں کئے گئے۔اس کے بعد پاکستان میں اس کا ردّ عمل ہوا۔ پاکستانی عوام کی طرف سے شدید مطالبہ ہونے لگا کہ پاکستان کو بھی اس کے جواب میں ایٹمی دھماکہ کرنا چاہیے۔ یہ معاملہ پرشور طور پر عالمی میڈیا میں گونجتا رہا۔امریکا نے اصرار کے ساتھ کہا کہ پاکستان خاموشی اختیار کرلے اور ہندستان کے جواب میں ایٹمی دھماکہ نہ کرے۔امریکی حکومت نے کہا کہ دھماکہ کرنے کی صورت میں پاکستان کے خلاف سخت اقتصادی پابندیاں عائد کی جائیں گی اور دھماکہ نہ کرنے کی صورت میں نہ صرف اس کی اقتصادی مدد جاری رہے گی بلکہ اس کو ''ایٹمی چھتری'' بھی دی جائے گی۔تاکہ اس کے لئے ہندستانی حملہ کا خطرہ باقی نہ رہے۔آسٹریلیا نے یہ تجویز پیش کی کہ پاکستان اگر ایٹمی دھماکہ نہ کرے تو ترقی یافتہ ممالک اس کی امداد کی رقم کو دوگنا کردیں گے۔

مگر پاکستان کے وزیراعظم نواز شریف کے لئے یہ زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ پاکستان کے جذباتی عوام کا یہ مطالبہ اتنا شدید تھا کہ اس کو نہ ماننے کی صورت میں یقینی طور پر اتنا ہنگامہ کھڑا ہوتا کہ نواز شریف کی حکومت ختم ہوجاتی۔کئی دن کی متضاد خبروں کے بعد آخرکار ۲۸ مئی ۱۹۹۸ء کی شام کو پاکستانی وزیراعظم نواز شریف نے ٹی وی پر اعلان کیا کہ آج شام چار بجے ہم نے بلوچستان کے صحرا میں پانچ ایٹمی دھماکے کئے ہیں۔اگلے دن پاکستان نے ایک اور ایٹمی دھماکہ کیا۔اس دھماکہ کے فوراً بعد امریکا اور دوسرے ترقی یافتہ ملکوں نے اعلان کردیا کہ وہ پاکستان کی اقتصادی امداد کو فوری طور پر بند کررہے ہیں۔

پاکستان کے اس دھماکہ کے بعد امریکی صدر بل کلنٹن نے شدید رنج کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان نے ایک نہایت قیمتی موقع (priceless opportunity) کھودیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ تبصرہ بالکل درست تھا۔ بدقسمتی سے پاکستان میں جتنے بھی لیڈر پیدا ہوئے، ابتدائی قائد سے

لے کر آخری قائد تک، ہر ایک پاکستانی مسلمانوں کو جذباتی شراب پلاتا رہا۔ پاکستان کے تمام علماء اور دانشور وہاں کے لوگوں کو فخر کی خوراک دیتے رہے۔ اسی بگڑے ہوئے مزاج کا یہ نتیجہ تھا کہ پاکستان کے یہ عوام اور خواص اپنی تاریخ کے اس انتہائی فیصلہ کن موقع پر جذبات کی رو میں بہہ گئے۔ وہ معاملات میں حقیقت پسندانہ رائے قائم کرنے سے قاصر رہے۔

پاکستان کے لوگ اگر سوج بوجھ سے کام لیتے تو یقیناً وہ جان لیتے کہ ہندستان کے ایٹمی دھماکہ کا جواب دوبارہ ایٹمی دھماکہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کا زیادہ موثر جواب یہ ہے کہ عالمی رائے کا احترام کیا جائے۔ اگر پاکستان کو ہندستان کی طرف سے ایٹمی حملہ کا خطرہ تھا تو اس کا زیادہ کارگر حل یہ تھا کہ امریکا کی پیشکش کے مطابق، اس کی طرف سے فراہم کردہ ایٹمی چھتری کو قبول کرلیا جائے، جیسا کہ جاپان نے قبول کررکھا ہے۔ اس کے مقامی وسائل اور عالمی ادارہ کے ذریعہ ملک کی اقتصادی اور تعلیمی ترقی کا کام پوری توجہ کے ساتھ شروع کردیا جائے۔ پاکستان اگر اس حقیقت پسندانہ منصوبہ پر عمل کرتا تو دس سال میں وہ اتنی زیادہ ترقی کرلیتا کہ ایٹمی دھماکہ کے بغیر ہی وہ ایک ناقابل تسخیر طاقتور ملک بن جاتا۔

حقیقی لیڈرشپ وہ ہے جو اپنی قوم کو حقیقت پسند بنائے۔ اس کے برعکس جو قیادت اپنی قوم کو جذباتیت کی خوراک دے وہ سرے سے قیادت ہی نہیں۔

صاحب بصیرت لوگ جانتے ہیں کہ کسی ملک کے لئے دفاع کا مسئلہ ہو تب بھی اس کا حل عوام کو ایجوکیٹ کرنا ہے نہ کہ مہلک ہتھیاروں کا ذخیرہ اکٹھا کرنا۔ ۹ جولائی ۱۹۹۸ء کو نئی دہلی کے مالینکر ہال میں ایک جلسہ تھا۔ ہندستانی وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی بطور چیف گیسٹ وہاں موجود تھے۔ وزیر اعظم نے اپنی تقریر میں ہندستان کے ایٹمی دھماکہ کو ڈیفنس کی ایک اعلیٰ تدبیر کے طور پر پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ پوکھرن کے ایٹمی دھماکے نے ساری دنیا کو ہلا دیا ہے۔

پروفیسر یشپال نے بھی اس موقع پر تقریر کی۔ انھوں نے وزیر اعظم کا حوالہ دیئے بغیر کہا کہ دفاع سمیت ہر مسئلہ کا ایک ہی حل ہے، اور وہ ہے قوم کو اعلیٰ تعلیم یافتہ بنانا۔ انھوں نے اس کی تفصیل کرتے ہوئے کہا کہ تعلیم سب سے زیادہ اعلیٰ دفاع ہے:

No defence is higher than education

بدقسمتی سے زندگی کی اس حقیقت کا علم نہ ہندستان کے لیڈروں کو ہے اور نہ پاکستان کے لیڈروں کو۔

34

۲۸ مئی ۱۹۹۸ کو پاکستان نے اپنے اعلان کے مطابق، ایک ہی دن پانچ ایٹمی ٹسٹ کئے تھے۔ ۳۰ مئی ۱۹۹۸ء کو حکومت پاکستان نے اعلان کیا کہ آج اس نے بلوچستان کے ریگستان میں ایک اور ایٹمی ٹسٹ کیا ہے۔ اس کے آخری دھماکہ کی طاقت ہیروشیما میں گرائے جانے والے ایٹم بم (۱۹۴۵) کے مقابلہ میں دوگنا تھی۔ اس طرح پاکستان نے انڈیا کے پانچ ایٹمی دھماکہ کے مقابلہ میں چھ ایٹمی دھماکے کئے۔

۳۰ مئی کے اس دھماکہ کے بعد پاکستانی حکومت نے اعلان کیا کہ اب ہم نے دوبارہ اس علاقہ میں طاقت کا وہ توازن قائم کرلیا ہے جو ہندستان کے ایٹمی دھماکہ کے بعد ٹوٹ گیا تھا۔ مگر کیا ایٹمی دھماکہ اس مسئلہ کا حل ہے۔ تاریخ کا جواب یہ ہے کہ ہرگز نہیں۔

ٹھیک اسی قسم کی صورت حال امریکا اور سوویت یونین کے درمیان پیش آچکی ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران ۱۹۴۵ میں جب امریکا نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر اپنے ایٹم بم کا تجربہ کیا تو اس کے بعد سوویت یونین کے لیڈروں نے کہا کہ اب فوجی طاقت کا توازن امریکا کے حق میں چلا گیا ہے۔ اس لئے ہم کو بھی ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم بنانا چاہیئے۔ سوویت یونین جس کا رقبہ اس وقت ہندستان اور پاکستان سے زیادہ تھا اس نے اپنے تمام اقتصادی وسائل ایٹمی ریسرچ اور ایٹم بم کی تیاری میں لگادیئے یہاں تک کہ اس کے وسیع اسلحہ خانہ میں ۲۹ ہزار چھوٹے بڑے ایٹم بم بن کر اکٹھا ہوگئے۔

اب سوویت یونین اس پوزیشن میں تھا کہ امریکا سمیت اپنے تمام دشمنوں کو اسی طرح تباہ کردے جس طرح ہیروشیما تباہ ہوا تھا۔ مگر انتہائی نازک حالات کے باوجود سوویت یونین اپنا ایک بم بھی اپنے دشمنوں کے خلاف استعمال نہ کرسکا۔ یہاں تک کہ ۱۹۹۱ میں سوویت یونین ٹوٹ گیا۔ ایٹم بموں کا ذخیرہ اس کے لئے اپنی سپر پاور حیثیت کو بچانے میں کامیاب نہیں ہوا۔

اس کھلی ہوئی قریبی مثال سے انڈیا اور پاکستان کے سیاسی لیڈروں نے کوئی سبق نہیں لیا۔

دونوں میں سے ہر ایک یہ اعلان کرر ہا ہے کہ ہم سلف ڈیفنس کے لئے ایٹم بم اور ہائیڈ روجن بم بنارہے ہیں۔حالانکہ حقیقی واقعات یہ ثابت کرر ہے ہیں کہ ایٹم بم کا کوئی بھی تعلق سلف ڈیفنس سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق صرف سلف ڈسٹرکشن (خود تخریبی) سے ہے۔ایٹم بم اگر استعمال ہوں تب بھی وہ ہلاکت ہیں اور اگر وہ استعمال نہ ہوں تب بھی ہلاکت۔

انڈیا اور پاکستان کے لیڈروں کو یہ خبر نہیں کہ ایٹم بم اگر بالفرض استعمال ہوں تب بھی ان کی زد میں صرف حریف قوم نہیں آتی بلکہ خود استعمال کرنے والا بھی ان کے غیر معمولی نقصانات کی زد میں آجاتا ہے۔ایٹمی جنگ بلا شبہ ایک بوم رینگ(boomerang) کھیل ہوگا۔کیوں کہ اس کے نتیجہ میں نہ صرف زیر نشانہ پڑوسی ملک تباہ ہوگا بلکہ خود ایٹم بم مارنے والا ملک بھی یقینی طور پر اس کی زد میں آجائے گا۔ایٹم بم گرانے کے بعد جو تابکاری (radioactivity) پھیلے گی،فضائی کثافت میں جو اضافہ ہوگا،سمندروں کا پانی جس طرح زہر آلود ہوگا اور ان سب کے نتیجہ میں جو بیماریاں پھیلیں گی، دونوں ملک یکساں طور پر اس کی لپیٹ میں آجائیں گے۔

تاہم ایٹم بم اگر استعمال نہ ہوں،وہ بنا بنا کر صرف رکھے جاتے رہیں تب بھی وہ نا قابل بیان حد تک ہلاکت خیز ہیں۔اس کے نتیجہ میں جو طرح طرح کے مسائل پیدا ہوتے ہیں ان میں ایک مسئلہ یہ ہے کہ وہ اتنی مہنگی قیمت پر تیار ہوتے ہیں کہ پورے ملک کی اقتصادی حالت تباہ و برباد ہوجائے۔ چیزوں کی قیمت میں بے پناہ اضافہ،ضروری اشیا کی شدید قلت،چیزوں میں ملاوٹ کا طوفان،حتیٰ کہ تازہ پانی اور صاف ہوا جیسی چیزوں کے حصول کا بھی مشکل ہوجانا۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کے لئے ایٹمی طاقت بننا ہولناک حد تک اس کی اقتصادی کمزوری پر منتج ہوتا ہے۔اس کا کھلا ہوا نمونہ سوویت یونین (موجودہ روس) کی صورت میں دیکھا جاسکتا ہے۔جو ملک ۱۹۹۰ تک سپر پاور سمجھا جاتا تھا،وہ آج اقتصادی اعتبار سے ایک تباہ شدہ ملک بن چکا ہے۔میں نے خود اپنے ایک سفر کے دوران سوویت یونین کی یہ تباہ حالت دیکھی ہے جس کو میں اپنے سفر نامہ میں لکھ چکا ہوں۔(سفر نامہ روس،مطبوعہ الرسالہ،فروری۔مارچ ۱۹۹۱)

کہا جاتا ہے کہ ایٹمی ہتھیار مانع جنگ کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس طرح وہ امن کی ضمانت (پیس گارنٹر) ہیں۔ مگر یہ ایک شدید مغالطہ ہے۔ امریکا اور سوویت یونین کا تجربہ بتاتا ہے کہ جب دونوں ملکوں نے ایٹمی مانع کی صلاحیت حاصل کرلی تو صرف یہ ہوا کہ دونوں میں براہ راست فوجی ٹکراؤ کا امکان ختم ہوگیا۔ اور اس کے بجائے وہ ٹکراؤ شروع ہوگیا جس کو مخفی جنگ (covert war) کہا جاتا ہے۔ کولڈ وار اور پراکسی وار اسی کی صورتیں ہیں۔ دوسری قسم کی جنگ جو امریکا میں اور سوویت یونین کے درمیان جاری ہوئی، ۱۹۹۱ تک اس کے تحت دنیا کے مختلف حصوں میں تقریباً دو کروڑ انسان ہلاک ہوگئے۔ گویا ایٹمی ہتھیار جنگ کو روکنے والا نہیں ہے بلکہ وہ صرف یہ کرتا ہے کہ جنگ کے میدان کو بدل دیتا ہے۔

جنگ کیوں ہوتی ہے۔ جنگ کا اصل سبب دو گروہوں کے درمیان دشمنی کی نفسیات ہے۔ جب دلوں میں دشمنی کے جذبات موجود ہوں تو کوئی ہتھیار جنگ کو بند نہیں کرتا، وہ صرف جنگ کی صورت کو بدل دیتا ہے۔ اس طرح اکثر حالات میں جنگی ٹکراؤ اور زیادہ شدید ہوجاتا ہے۔ اس کا نمونہ ہمیں انڈیا اور پاکستان کے درمیان بھی نظر آتا ہے۔ مئی ۱۹۹۸ میں جب دونوں ملکوں نے اس بات کا مظاہرہ کیا کہ انھوں نے ایٹمی ہتھیار بنا لئے ہیں تو اس کے بعد ہی سرحد پر متشددانہ سرگرمیاں بڑھ گئیں۔ بم اور گن کے استعمال میں پہلے سے زیادہ اضافہ ہوگیا۔

35

پاکستان نے نواز شریف حکومت کے تحت ۲۸ مئی اور ۳۰ مئی کو مجموعی طور پر چھ ایٹمی دھماکے کئے۔ بالفاظ دیگر، یہ ثابت کیا کہ پاکستان ایٹم بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ ایٹمی دھماکے ہندستان کے جواب میں کئے گئے جو ۱۱ مئی اور ۱۳ مئی ۱۹۹۸ کو پانچ کی تعداد میں کئے گئے تھے۔

اس کے بعد ایران کے وزیر خارجہ مسٹر کمال خرازی پاکستان آئے۔ ۲ جون ۱۹۹۸ کو انھوں نے اس کے بارے میں کہا کہ پاکستان کے کامیاب ایٹمی دھماکہ نے ساری دنیا کے مسلمانوں کو نیا اعتماد عطا کیا ہے۔ ملیشیا کے مسلم لیڈر انور ابراہیم کا تاثر اس سے مختلف تھا۔ انھوں نے انڈیا اور پاکستان دونوں

ملکوں پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ یہ دھماکے دونوں ملکوں کے غریب لوگوں کی قیمت پر کیے گئے ہیں:

It is a nuclear adventurism on the cost
of poor people of both the country.

میں سمجھتا ہوں کہ اس معاملہ میں انور ابراہیم کا تبصرہ ہی زیادہ درست ہے۔ کسی قوم کے اعتماد اور طاقت کا راز یہ نہیں ہے کہ اس کے پاس ایٹم بموں کا ذخیرہ ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو سوویت یونین کبھی نہ ٹوٹتا، جس کے پاس ہندستان اور پاکستان کے مقابلہ میں ہزاروں گنا زیادہ ایٹم بم تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ قومی اعتماد اور قومی طاقت کا راز یہ ہے کہ ملک میں سماجی امن ہو۔ ضرورت کی چیزیں مناسب قیمت پر مل رہی ہوں۔ شہری سہولتیں ہر ایک کو بخوبی طور پر پہنچ رہی ہوں۔ تعلیم اور علاج کا عمدہ انتظام ہو، دفتروں میں رشوت کے بغیر کام ہوتا ہو، وغیرہ۔

موجودہ صورتحال یہ ہے کہ انڈیا اور پاکستان دونوں انتہائی غریب ملک ہیں۔ جہالت سے لے کر بھرشٹا چار تک ہر قسم کی برائیوں نے عام انسان کی زندگی کو مصیبت بنا رکھا ہے۔ ایسی حالت میں ان ملکوں میں ایٹم بم بنانا دراصل لوگوں کو غریب اور بدحال رکھ کر قومی دولت کو ایٹمی دھماکوں میں تباہ کرنا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ عمل اتنا زیادہ تباہ کن ہے کہ کسی ملک کے عوام بھی اس کو برداشت نہیں کر سکتے۔ مگر سطحی قسم کے لیڈر عوام کو نفرت اور جوش کی شراب پلا کر اس طرح مدہوش کر دیتے ہیں کہ وہ اپنے فائدہ اور نقصان کو بھی سمجھ نہیں پاتے۔ ان کا نشہ صرف اس وقت اترتا ہے جب کہ بربادی اپنی آخری حد تک پہنچ چکی ہو اور سرے سے واپس لوٹنے کا امکان ہی باقی نہ رہے۔

دونوں ملک دفاع کے نام پر ایٹمی دھماکہ کر رہے ہیں۔ مگر دفاع کا کوئی تعلق ایٹم بم سے نہیں۔ اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ایٹم بم جیسی ہلاکت خیز چیز تاریخ میں صرف ایک بار استعمال ہوتی ہے۔ پھر جب ایک بار استعمال کئے جانے کے بعد ایٹم بم کے مزید استعمال کے خلاف عالمی سطح پر ایک طاقتور مانع (deterrent) قائم ہو چکا ہو تو اس پر نہ ہونے والے حملہ سے دفاع کی آخر کیا ضرورت۔

36

مئی ۱۹۹۸ء سے پہلے تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ دنیا میں مبینہ طور پر پانچ ایسی قومیں ہیں جن کے

پاس ایٹمی ہتھیار ہیں۔مگر اب انڈیا اور پاکستان کی طرف سے ایٹمی دھماکہ کے بعد ایسی طاقتوں کی تعداد سات ہوچکی ہے۔حتیٰ کہ فرانس نے تجویز کیا ہے کہ ان کو شامل کرتے ہوئے سات نیوکلیر قوموں (N-7) کا اجتماع بلایا جائے۔عجیب بات ہے کہ انڈیا اور پاکستان دونوں ایک دوسرے کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں مگر دونوں نے مئی میں جو ایٹمی دھماکے کئے ہیں ان کے پیچھے اصل دماغ دونوں جگہ دو مسلم سائنس دانوں کا ہے۔انڈیا میں ڈاکٹر عبد الکلام اور پاکستان میں ڈاکٹر عبد القدیر۔

بی بی سی لندن نے یکم جون ۱۹۹۸ کو پاکستانی سائنس داں ڈاکٹر عبد القدیر کا ایک انٹرویو نشر کیا۔ان سے پوچھا گیا کہ ایسے خونیں اور امن شکن ہتھیار آپ کیوں بنا رہے ہیں۔ان کا جواب یہ تھا کہ —"ایٹم بم کو میں سب سے بڑا ضامنِ امن (peace guaranter) سمجھتا ہوں۔اب جب کہ انڈیا اور پاکستان دونوں کے پاس ایٹم بم ہیں تو مجھے یقین ہے کہ اب ان کے درمیان کبھی جنگ نہیں ہوگی"۔

مگر ایک غیر جانب دار مبصر کے لئے اس سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔پاکستان کا کہنا کہ انڈیا نے جارحیت کر کے کشمیر پر قبضہ کر رکھا ہے۔یہی وہ مسئلہ ہے جس کے لئے ہمیں ایٹم بم کی تیاری تک جانا پڑا۔مگر صرف ایٹم بم بنانے سے پاکستان کو کشمیر نہیں مل سکتا۔زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ انڈیا کو پاکستان کے خلاف کسی آئندہ جارحیت سے روک سکے۔مگر تمام واقعات بتاتے ہیں کہ انڈیا کا ایسا کوئی جارحانہ ارادہ نہیں۔

پھر پاکستان نے ایٹم بم کیوں بنایا۔اگر پاکستان اپنے ایٹم بم کو استعمال کرے تو خود ڈاکٹر عبد القدیر کے اعتراف کے مطابق، یہ اس کے لئے ایک خودکشی کا فعل ہوگا جس میں کشمیر اور پاکستان دونوں تباہ ہوجائیں گے۔گویا کہ ایٹم بم کو استعمال کرنا یا اس کو استعمال نہ کرنا دونوں ہی پاکستان کے لئے غیر مفید ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ موجودہ حالت میں پاکستان کے لئے دوسرا زیادہ بہتر انتخاب (choice) موجود تھا،اور وہ تھا صورت موجودہ (status quo) کو مان لینا۔

نہایت مہنگی قیمت پر ایٹم بم بنانے کے باوجود پاکستان کے لئے یہی مقدر ہے کہ وہ کشمیر کے

معاملہ میں صورت موجودہ (لائن آف ایکچول کنٹرول) پر نہ چاہتے ہوئے بھی راضی رہے۔ کیوں کہ اس کا دوسرا بدل صرف قومی خودکشی ہے۔ ایسے حالات میں پاکستان کو یہ کرنا چاہیے تھا کہ وہ اس معاملہ میں امریکا اور دوسری مغربی قوموں کی پیشکش کو مان لے۔ اس پیشکش میں اس کو دو قیمتی چیزیں مل رہی تھیں ــــــ ایک نہایت فیاضانہ اقتصادی امداد۔ دوسرے امریکا کی طرف سے قابل اعتماد نیوکلیر تحفظ۔

حقیقت یہ ہے کہ ایٹم بم نہ انڈیا کے لئے مفید ہے اور نہ پاکستان کے لئے۔ دونوں ہی کے لئے وہ سفید ہاتھی پالنے کے ہم معنٰی ہے۔ دونوں ہی نے اس کو اپنے قومی فخر (pride) کے لئے بنایا ہے، نہ کہ حقیقی معنوں میں قومی دفاع کے لئے۔ جب متفقہ طور پر ایٹم بم قابل استعمال ہی نہ ہو تو کوئی فوجی مقصد اس سے کس طرح حاصل کیا جاسکتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں فوجی یا غیر فوجی مقاصد کے لئے پر امن ڈائیلاگ ہی ایک ممکن تدبیر ہے۔ متشددانہ تدبیر اب سرے سے قابل عمل ہی نہیں۔ پر تشدد عمل میں یقینی خطرہ ہے کہ آج جو کچھ آپ کے پاس ہے وہ بھی آپ کے پاس باقی نہ رہے۔

یہاں میں اضافہ کروں گا کہ پچھلے کچھ سالوں سے برازیل اور ارجنٹینا کے درمیان ایٹمی اسلحہ کی وہی دوڑ جاری تھی جو آج انڈیا اور پاکستان میں دکھائی دے رہی ہے۔ مگر اس کے برے اقتصادی نتائج کو دیکھ کر دونوں ملکوں کے سنجیدہ لوگ تڑپ اٹھے۔ دونوں نے آپس میں گفت وشنید شروع کردی۔ یہاں تک کہ ۱۹۹۷ میں دونوں ملکوں میں ایک مشترکہ فیصلہ کے ذریعہ ایٹمی اسلحہ کی تیاری مکمل طور پر بند کردی گئی اور اپنے وسائل کو پوری طرح اقتصادی ترقی کی طرف موڑ دیا گیا۔

برازیل اور ارجنٹینا کا یہ فیصلہ بلاشبہ نہایت درست ہے۔ انڈیا اور پاکستان دونوں کو اسی فیصلہ کی پیروی کرنا چاہیئے۔ ایٹمی ہتھیاروں کا راستہ بلاشبہ دونوں کے لئے تباہ کن ہے، خواہ یہ ہتھیار استعمال ہوں یا استعمال نہ ہوں۔

37

۲۰ ویں صدی کے نصف اول کا زمانہ برصغیر ہند کے لئے نازک زمانہ تھا۔ اس زمانہ کے لوگ

ایک قسم کے رومانی تصورات میں جی رہے تھے۔ وہ ذہنی طور پر اس کے لئے تیار تھے کہ کوئی شخص خوبصورت نظریہ پیش کرے تو وہ دوڑ کر اسے قبول کرلیں۔ اس زمانہ کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں مختلف قسم کے اہل فکر اٹھے۔ انھیں میں سے ایک گروہ وہ تھا جو نظریاتی انتہا پسندی میں مبتلا تھا اور طلسماتی الفاظ کے ذریعہ اپنی قوم کو اس کی طرف بلا رہا تھا۔ ان میں سے ایک کو میں ہندو انتہا پسند اور دوسرے کو مسلم انتہا پسند کا نام دوں گا۔ چونکہ اس وقت دونوں فرقوں میں رومانی جوش وخروش پایا جارہا تھا۔ اس لئے جوانوں کی بڑی تعداد دونوں طرف اکٹھا ہوگئی۔ اس طرح تقریباً ایک ہی زمانہ میں دو مختلف گروہ وجود میں آئے۔ ایک ہندو انتہا پسندوں کا گروہ اور دوسرا مسلم انتہا پسندوں کا گروہ۔ ۲۰ ویں صدی میں برصغیر ہند میں جو تباہ کن حالات پیش آئے اس کے سب سے بڑے ذمہ دار یہی دونوں انتہا پسند گروہ ہیں۔

نظریاتی انتہا پسندی ایک قسم کا جنون ہے۔ ایسے لوگ ہمیشہ تاریخ کو اپنے خودساختہ نظریات میں ڈھالنے پر اصرار کرتے ہیں۔ وہ تاریخ کے پہیہ کو الٹی طرف چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں تاریخ کا سفر تو الٹی طرف جاری نہیں ہوتا، البتہ ترقی اور تعمیر کے امکانات تباہ ہوکر رہ جاتے ہیں۔

ہندو انتہا پسند گروہ کے پچھلے پچاس سال کے ریکارڈ کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے اس مدت میں صرف تین بڑے 'کارنامے' انجام دیے ہیں۔ اول، ۱۹۴۸ میں مہاتما گاندھی کو گولی مار کر ہلاک کرنا۔ دوم، ۱۹۹۲ میں اجودھیا کی تاریخی مسجد کو ڈھا دینا جب کہ اس کا کیس ابھی عدالت میں زیر سماعت تھا۔ سوم، ۱۹۹۸ میں پانچ ایٹمی دھماکے کرکے اس پورے علاقے میں ایٹمی ہتھیار کی دوڑ شروع کردینا۔

مسلم انتہا پسندوں کا ریکارڈ بھی اس معاملہ میں کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ اپنے نظریاتی جنون کے تحت انھوں نے ۱۹۴۷ میں برصغیر ہند کا بٹوارہ کرایا اور اس پورے علاقہ میں ابدی طور پر نفرت کی فصل اگائی۔ اس کے بعد اسی نظریاتی جنون کے تحت انھوں نے نام نہاد اسلامی جنگ جوئی کا طوفان برپا کیا جس کے نتیجہ میں نہ صرف لیاقت علی خاں (وفات ۱۹۵۱) اور ذوالفقار علی بھٹو (وفات ۱۹۷۹) جیسے بہت سے لوگوں کو قتل کیا گیا بلکہ کشمیر میں اور خود پاکستان میں تشدد کا ایک آتشیں جنگل اگ آیا جس کا

بظاہر کوئی خاتمہ نظر نہیں آتا۔ اور پھر یہی مسلم انتہا پسند ہیں جنھوں نے وہ حالات پیدا کئے جس کا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ انڈیا اور پاکستان ہلاکت خیز انجام کے کنارے پر کھڑے ہو گئے۔

انتہا پسندی کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ سمجھوتہ اور مصالحت (conciliation) کو نہیں جانتی۔ ایسے لوگ صرف ایک بات کو جانتے ہیں اور وہ ہے ساری دنیا کو اپنے خیالات کے سانچے میں ڈھالنا۔ یہی وجہ ہے کہ نظریاتی انتہا پسندی ہمیشہ نفرت اور تشدد تک پہنچتی ہے۔ بدقسمتی سے برصغیر ہند میں ہندو انتہا پسندی اور مسلم انتہا پسندی دونوں نے ہمارے سماج میں یہی غیر مطلوب فصل اگائی ہے۔

38

کسی لیڈر کی سب سے زیادہ تباہ کن چیز نظریاتی جنون ہے۔ لیڈر کے دماغ میں جب ایک نظریہ بس جائے تو بقیہ تمام چیزیں اس کے لئے ثانوی بن جاتی ہیں۔ وہ اپنے خود ساختہ نظریہ کو قائم کرنے کے لئے تمام دوسری چیزوں کو بلڈوز کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ اخلاق اور انسانیت جیسی اعلیٰ قدروں کو بھی۔ اسٹالن نے اپنے اسی نظریاتی جنون کی بنا پر ۲۵ ملین انسانوں کو ہلاک کر دیا۔ ہٹلر نے اپنے اسی نظریاتی جنون کی بنا پر تاریخ کی وہ ہولناک جنگ چھیڑ دی جس کو دوسری عالمی جنگ کہا جاتا ہے، وغیرہ۔

بدقسمتی سے برصغیر ہند بھی آزادی کے بعد اس قسم کے نظریاتی جنون کا شکار ہو رہا ہے۔ پاکستان میں وہاں کے نام نہاد اسلام پسندوں نے اپنے نظریاتی جنون کے تحت پاکستان کے تمام بہترین امکانات کو ملیا میٹ کر دیا۔ انڈیا میں پہلے ہمارا ملک نہرو کے سوشلسٹ جنون کا شکار رہا۔ اب وہ بھاجپا کے ہندتو جنون کا شکار ہو رہا ہے۔ یہ صرف خدا کو معلوم ہے کہ اس قسم کی جنونی سیاست برصغیر ہند میں مزید کب تک جاری رہے گی۔

ہر سماج میں ایسے افراد ہو سکتے ہیں جو اپنے نظریہ کے حق میں مجنونانہ یقین رکھتے ہوں۔ دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سماج میں ہمیشہ مختلف سوچ اور مختلف نظریہ رکھنے والے لوگ پائے جاتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ مختلف اور متضاد ذہن رکھنے والوں کے درمیان حکومتی نظام کس طرح

بنایا جائے۔ یہ ضروری ہے کہ ہمارے پاس اس مقصد کے لئے پر امن اور قابل عمل فارمولا موجود ہو۔بصورت دیگر، ہرسماج ابدی طور پرتشدد کا سماج بنا رہے گا۔

یہ فارمولا دریافت ہو چکا ہے اوراس فارمولے کا نام ڈیموکریسی ہے۔اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سماج کے مختلف گروہ اس پر راضی ہو جائیں کہ حکومت سازی کا معاملہ الیکشن پراسس کے حوالے کردیا جائے۔ ہر پانچ سال پر آزادانہ اور منصفانہ(free and fair) الیکشن منعقد کیا جائے۔اس الیکشن میں جوگروہ بھی جائز طور پر اکثریت لائے اس کومحدود مدت کے لئے حکومت (صحیح تر لفظ میں، ایڈمنسٹریشن) کا کام چلانے کا موقع دیا جائے۔ یہ فاتح گروہ دل سے راضی رہے کہ اگلے الیکشن میں اگروہ ہار جاتا ہےتو وہ اسی طرح معتدل طور پر اپنی ہار کوقبول کرلے گا جس طرح اس سے پہلے اس نے اپنی جیت کوقبول کیا تھا۔

اس کے بعد وہ لوگ ہیں جواپنے دماغوں میں کوئی اصلاحی نظریہ رکھتے ہیں مگرعوامی رائے بروقت ان کے ساتھ نہیں ہے۔ایسے لوگوں کے لئے واحد صحیح اور قابل عمل بات یہ ہے کہ وہ انتظار کی پالیسی اختیار کریں۔یعنی وہ جائز حدود میں اپنے نظریہ کی پرامن تبلیغ کریں۔ وہ لوگوں کوایجوکیٹ کرکے ان کے ذہن کواپنے موافق بنانے کی کوشش کریں۔اس عمل میں وہ نہ کوئی متشددانہ طریقہ اختیار کریں اور نہ غیراخلاقی طریقہ۔وہ اسی طرح پرچار کے دائرہ میں اپنی تعمیری مہم جاری رکھیں۔ یہاں تک کہ وہ وقت آجائے جب کہ خود انتخابی عمل ان کے حق میں فیصلہ دے دے۔

39

۱۹۴۷ میں جب ایک طرف انڈیا اوردوسری طرف پاکستان بنا تو اول دن ہی سے دونوں میں حریفانہ تعلق قائم ہوگیا۔حریفانہ تعلق قائم ہونا کوئی بری چیز نہیں۔وہ ترقی کا زینہ ہے۔کہا جاتا ہے کہ امریکا کی ترقی کا راز روس کی صورت میں اس کے ایک حریف کا وجود میں آنا تھا۔ چنانچہ جب ۱۹۹۱ میں سوویت یونین ٹوٹ گیا تو امریکی ماہرین یہ کہنے لگے کہ ہمیں اب کوئی دوسرا حریف تلاش کرنا چاہیے ورنہ ہمارے یہاں ترقی کا عمل رک جائے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ حریفانہ کشاکش اپنی ذات میں کوئی بری چیز نہیں ہے۔ یہ خود فطرت کا بنایا ہوا کورس ہے۔ فطرت نے انسانی ترقی کے لئے یہی کورس مقرر کیا ہے کہ لوگوں میں مقابلے ہوں اور ان مقابلوں کے دوران ہر ایک اپنے کو اونچا دکھانے کی کوشش کرے اور اس طرح انسانیت کی مجموعی ترقی جاری رہے۔

انڈیا اور پاکستان کے درمیان جو حریفانہ کشمکش پیش آئی، وہ اپنی ذات میں اسی قسم کی ایک چیز تھی۔ مگر یہ حریفانہ کشمکش دونوں ہی ملک کے لئے تباہی کا ذریعہ بن گئی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے یہاں اس حریفانہ کشمکش نے منفی رخ اختیار کرلیا۔ ہمارے یہاں یہ حریفانہ کشاکش منفی کشاکش بن گئی، وہ مثبت رخ اختیار نہ کرسکی۔

ابتدا میں دونوں ملکوں کا میڈیا ایک دوسرے کے خلاف منفی پروپیگنڈے کے لئے وقف ہوگیا۔ جب ہندستان کا ایک ہندو پاکستان جاتا ہے اور وہاں اس کی ملاقات انفرادی سطح پر پاکستان کے مسلمانوں سے ہوتی ہے تو اس کو ہمیشہ ان کی طرف سے گرم جوشی اور مہمان نوازی کا تجربہ ہوتا ہے۔ وہ انڈیا واپس آکر کہتا ہے کہ پاکستان کے لوگ تو ہم سے انسانیت اور پیار کے ساتھ ملتے ہیں پھر دونوں ملکوں میں قومی سطح پر دشمنی کیوں۔

یہی معاملہ ان پاکستانی مسلمانوں کے ساتھ پیش آتا ہے جو پاکستان سے انڈیا آتے ہیں۔ اور یہاں کے ہندوؤں سے انفرادی طور پر ملتے ہیں۔ وہ بھی پاکستان واپس جاکر یہی بات کہتے ہیں کہ انڈیا کا ہندو تو ہم سے انتہائی پیار کے ساتھ ملا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ قومی سطح پر دونوں ملکوں کے درمیان مسلسل دشمنی قائم ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں ملکوں میں جب ہندو اور مسلمان آپس میں ملتے ہیں تو یہ ایک انسان کی دوسرے انسان سے ملاقات ہوتی ہے۔ جب بھی ایک انسان دوسرے انسان سے انفرادی طور پر ملے تو یہ ملاقات فطرت کے دو پیکروں کے درمیان ہوگی، اور جہاں تک فطرت کا سوال ہے وہ ایک ہندو کے اندر بھی وہی ہے جو ایک مسلمان کے اندر ہے۔

مگر قومی تعارف کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ انفرادی ملاقات میں دونوں کی رہنما ان کی فطرت ہوتی ہے مگر ایک پاکستانی مسلمان جب ہندستانی قوم کے بارے میں جاننا چاہے تو وہ اپنی اس واقفیت کو اخبارات کے ذریعہ حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح جب ایک ہندستانی ہندو پاکستانی قوم سے آگاہ ہونا چاہے تو وہ بھی اخبارات کے ذریعہ یہ آگہی حاصل کرتا ہے۔ اور جیسا کہ معلوم ہے، اخبارات صرف نفرت اور عداوت کی باتیں چھاپتے ہیں۔ وہ حریف قوم کو ایک قابل نفرت دشمن کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔

انفرادی اور قومی تصویر کا یہ فرق اس مطالعہ کے فرق کا نتیجہ ہے۔ اگر دونوں ملکوں کے اخبارات اور میڈیا کو ہٹا دیا جائے اور دونوں ملکوں کے لوگ ایک دوسرے کے بارے میں قومی تعارف بھی اسی طرح براہ راست حاصل کریں جس طرح وہ انفرادی تعارف براہ راست حاصل کرتے ہیں تو یہ تضاد ختم ہو جائے گا۔

40

قرآن کی سورہ نمبر ۱۰ میں فطرت کا ایک قانون ان الفاظ میں بتایا گیا ہے — "پھر ہم نے ان کے بعد تم کو زمین میں با اقتدار بنایا تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسا عمل کرتے ہو"۔ (یونس ۱۴)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین میں جب کسی فرد یا گروہ کو سیاسی اقتدار ملتا ہے تو وہ اس کا ذاتی حق نہیں ہوتا۔ زمین خدا کی ہے اور وہی جس کو چاہتا ہے اس کو یہاں اقتدار عطا کرتا ہے، یہ اقتدار ہر ایک کے لئے صرف محدود مدت کے لئے ہوتا ہے، اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ سیاسی مواقع دے کر اس کو جانچا جائے کہ اس نے اپنے اختیار کو کس طرح استعمال کیا۔ پھر اس کی اس کارکردگی کی بنیاد پر آخرت میں اس کے لئے انعام یا سزا کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اس اعتبار سے برصغیر ہند کو دیکھئے۔ پانچ سو سال پہلے یہاں مختلف راجاؤں کی حکومت تھی۔ اس کے بعد مغلوں کا سیاسی دور آیا جو انیسویں صدی کے وسط تک جاری رہا۔ اس کے بعد انگریزوں کو اس ملک میں سیاسی اقتدار ملا۔ یہ اقتدار ۱۹۴۷ میں ختم ہو گیا۔ اس کے بعد ملک کے دو حصے

ہوگئے۔ایک حصہ میں ہندو اکثریت کو سیاسی بالاتری حاصل ہوئی اور دوسرے حصہ میں مسلم اکثریت کوسیاسی بالاتری کی حیثیت حاصل ہوئی۔

پچھلے تمام سیاسی دورصرف وقتی تھے۔ان میں سے کوئی بھی مستقل نہ تھا۔اسی طرح موجودہ سیاسی دوربھی صرف وقتی ہے۔دونوں میں سے کسی فرقہ کو یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اس کو مستقل طور پر زمین کے اس حصے کا سیاسی الاٹ مینٹ مل گیا ہے۔دونوں ہی گروہ،قرآن کے مطابق، مالک کائنات کی براہ راست نگرانی میں ہیں۔وہ جب تک چاہے گا ان کا اقتدار رہے گا اور جب وہ چاہے گا دونوں کا اقتدار ختم کرکے کسی اورگروہ کو یہ سیاسی مواقع دے دے گا۔

اس اعتبار سے دیکھئے تو ہندو اور مسلمان دونوں ہی گویا سیاسی امتحان ہال میں بیٹھے ہوئے ہیں۔دونوں ہی کوایک مشترک پرچہ حل کرنا ہے،وہ پرچہ کیا ہے،وہ پرچہ یہ ہے کہ دونوں ہی اپنے آپ کو اس خطۂ ارضی کا مالک نہ سمجھیں بلکہ صرف اس کا امین سمجھیں۔وہ اس سیاسی اقتدارکواپنے لئے ایک ذمہ داری سمجھیں، نہ کہ کوئی ذاتی حق کا معاملہ۔وہ اس بارے میں آخری حدتک سنجیدہ ہوں کہ انھیں اپنے اختیارکوذاتی خواہش کے تحت استعمال نہیں کرنا ہے بلکہ اس کوخدا کی مرضی کے تحت استعمال کرنا ہے۔وہ پورے شعور کے ساتھ اس حقیقت کواپنے ذہن میں تازہ رکھیں کہ انھیں اپنے ہرقول وعمل کے لئے خدا کی عدالت میں اپنا حساب دینا ہے جہاں انصاف کے سواکسی بھی دوسری چیز کی کوئی قیمت نہ ہوگی۔

دونوں فرقوں کو یہ جاننا چاہیے کہ انھیں یہ سیاسی موقع اس لئے دیا گیا ہے کہ وہ خدا کی زمین کو سنواریں، نہ کہ اس کو بگاڑیں۔وہ خدا کے بندوں کو انصاف دیں، نہ کہ انھیں اپنے ظلم کا نشانہ بنائیں۔وہ تمام انسانوں کوراحت پہنچائیں، نہ کہ انھیں نئے نئے مسائل میں الجھادیں، وہ ملک کے وسائل کوملک کی مثبت تعمیر میں لگائیں، نہ کہ اس کواپنے ذاتی عیش یا ذاتی برتری کے لئے استعمال کریں۔وہ ان مواقع کوخدا کی امانت سمجھیں، نہ کہ ذاتی ملکیت۔

صبح کو جب سورج طلوع ہوتا ہےتو وہ اس بات کا پیغام دیتا ہے کہ مالک کائنات تمھاری نگرانی کررہا ہے۔ہرروز جب رات آتی ہے تو وہ یہ پیغام لاتی ہے کہ تمھارا عروج بھی لازماً زوال کا شکار

ہوگا۔ زمین کی مسلسل گردش بتارہی ہے کہ اس دنیا میں نہ کسی کی زندگی کے لئے ٹھہراؤ ہے اور نہ کسی کے سیاسی اقتدار کے لئے۔ یہ گویا دونوں گروہوں کے لئے، اور اس طرح تمام انسانوں کے لئے فطرت کی زبان میں خدا کی ایک چیتاؤنی ہے۔ دانش مند وہ ہے جس کے لئے یہ چیتاؤنی اس کی اصلاحِ حال کا ذریعہ بن جائے اور نادان وہ ہے جو اس چیتاؤنی کو نظر انداز کردے، اس کے لئے ذلت اور ناکامی کے سوا کوئی دوسرا انجام نہیں۔

41

۱۸۹۶ میں سوامی ویویکانند امریکا گئے۔ وہاں وہ مذاہب کی پارلیمنٹ (شکاگو) میں شرکت کے لئے گئے تھے۔ اس دوران ایک روز یہ واقعہ پیش آیا کہ وہ شہر کی ایک سڑک پر چل رہے تھے۔ اس وقت حسب معمول ان کے جسم پر بغیر سلا ہوا گیروا کپڑا تھا۔ یہ منظر اس وقت اہل امریکا کے لئے نیا تھا۔ ایک امریکی عورت جو اپنے شوہر کے ساتھ سڑک پر چل رہی تھی اس نے سوامی جی کو دیکھ کر کہا: یہ آدمی مجھ کو جنٹل مین دکھائی نہیں دیتا۔ سوامی جی نے اس کی یہ بات سن لی۔ وہ اس کے قریب گئے اور نرمی سے کہا کہ محترم خاتون، مجھے معاف کیجئے۔ آپ کے ملک میں درزی ایک آدمی کو جنٹل مین بناتا ہے۔ مگر میں جس ملک سے آیا ہوں وہاں کردار کسی آدمی کو جنٹل مین بناتا ہے:

> Excuse me madam. In your country tailor makes a man gentleman. But the country from which I come, character makes a man gentleman.

یہ سوسال پہلے کی بات ہے جب کہ انڈیا میں انگریزوں کی حکومت تھی۔ حال میں ایک کانفرنس میں شرکت کے لئے میں نے امریکا کا سفر کیا۔ وہاں میں نے ایک امریکی پروفیسر سے سوامی ویویکانند کا مذکورہ واقعہ بتایا۔ امریکی پروفیسر نے توجہ کے ساتھ اس واقعہ کو سنا۔ اس کے بعد سنجیدگی کے ساتھ کہا کہ جناب، سوسال پہلے کیریکٹر آپ کے ملک کی پہچان ہوگا مگر آج کیریکٹر کی بات آپ کے ملک کے لئے ایک اکسپورٹ آئٹم ہے، وہ لوکل کنزمپشن کی چیز نہیں۔

میں ہندستان کی آزادی سے تقریباً ۲۵ سال پہلے پیدا ہوا۔ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں

کہ اس وقت کے ہندستان میں ہر طرف انسانی شرافت تھی ۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس وقت کیریکٹر انڈیا کی پہچان تھا۔مگر آج معاملہ بالکل برعکس ہے۔آج کرپشن اور بھرشٹا چار انڈیا کی پہچان بن چکا ہے۔ برٹش انڈیا کو ہمارے سیاسی لیڈر غلام انڈیا کہا کرتے تھے،اور آج کے انڈیا کو آزاد انڈیا کہا جاتا ہے۔ پھر کردار اور انسانیت کے اعتبار سے دونوں میں یہ فرق کیوں ۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں، برٹش حکمرانوں نے اس زمانے میں ملک میں کنٹرول قائم کررکھا تھا۔ اس کنٹرول کے تحت اخلاقی ڈسپلن بھی قائم تھا۔آزادی کے بعد یہ خارجی کنٹرول ختم ہوگیا۔اب ملک کا ہر شہری اپنے آپ کو آزاد محسوس کرنے لگا۔اس نئے ماحول میں اخلاقی اقدار (moral values) کا نظام صرف سلف ڈسپلن کے تحت قائم رہ سکتا تھا۔مگر بدقسمتی سے سلف ڈسپلن کا مزاج آزاد ہندستان کے شہریوں میں موجود ہی نہ تھا۔یہی وجہ ہے کہ آزادی ہمارے ملک میں انارکی بن کررہ گئی۔

سلف ڈسپلن کسی آزاد سماج کے لئے بے حد ضروری ہے۔اس قسم کا ڈسپلن افراد کی شعوری تعمیر کے ذریعہ آتا ہے نہ کہ سیاسی معنوں میں صرف آزادی حاصل کر لینے سے۔اسی خاص اہمیت کی بنا پر آزادی سے پہلے ملک کے کچھ مدبر یہ کہتے تھے کہ سیاسی آزادی لانے سے پہلے ہمیں عوام کو ایجوکیٹ کرنا ہے۔شعوری تربیت کے ذریعہ ہمیں لوگوں کے اندر یہ صلاحیت پیدا کرنا ہے کہ وہ آزادی کا تحمل کرسکیں۔مگر اس زمانے کے لیڈر اپنے سیاسی جوش کے تحت یہ سمجھتے تھے کہ غلامی کا خاتمہ ہر برائی کا خاتمہ ہے اور سیاسی آزادی کو لانا ہر بھلائی کو لانے کے ہم معنٰی ہے۔مگر ان کا یہ اندازہ خوفناک حد تک غلط تھا۔آج ہم ان کی اسی غلطی کو بھگت رہے ہیں۔

42

۱۹۹۷ میں میں نے اٹلی کا سفر کیا۔اس سلسلے میں چند دن روم میں میرا قیام رہا۔اسی زمانے میں اٹلی کی اقتصادیات کے بارے میں اخباروں میں یہ خبر چھپی تھی کہ اٹلی کی شرح ترقی (rate of growth) یورپ کے دوسرے تمام ملکوں سے زیادہ ہے۔ میں نے ایک اطالوی پروفیسر سے پوچھا کہ آپ کے ملک میں سیاسی استحکام نہیں۔ یہاں بار بار حکومتیں بدلتی رہتی ہیں۔اس کے باوجود اٹلی کی اقتصادیات

میں تیز رفتار ترقی کا سبب کیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ یہ صحیح ہے کہ ہمارے ملک میں سیاسی استحکام نہیں، مگر سیاسی ادارہ کے باہر جو سسٹم ہے وہ بہت مستحکم (stable) ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی عدم استحکام کے باوجود ہمارے ملک میں اقتصادی ترقی کا سفر جاری رہتا ہے۔

پچھلے کئی سالوں کے تجربے کے بعد اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ہندستان میں سیاسی استحکام مستقبل بعید تک ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں ملک کے لئے ہمیں کیا کرنا ہے، اس کا ایک قابل تقلید نمونہ اٹلی کے تجربہ میں پایا جاتا ہے۔ اس کے مطابق، اب ہمیں یہ کرنا ہے کہ سیاسی استحکام کا انتظار کئے بغیر غیر سیاسی سطح پر مستحکم نظام قائم کرنے کی کوشش میں اپنی ساری قوت لگا دیں۔

خوش قسمتی سے ایک حد تک یہ نظام ہمارے یہاں موجود ہے۔ آزادی کے بعد ہمارے سوشلسٹ حکمرانوں نے نیشنلائزیشن اور پبلک سیکٹر کی صورت میں جو مصنوعی نظام بنایا تھا، اس کے بعد ملک کا انجام عین وہی ہونا چاہئے تھا جو اسی قسم کے تجربہ کے بعد سابق سوویت یونین کا ہوا۔ مگر ہمارا ملک اس قسم کی کامل تباہی سے بچ گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں نام نہاد سوشلسٹ سیکٹر کے ساتھ نجی سیکٹر بھی موجود تھا۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ آزادی کے بعد ہمارے حکمرانوں نے ملک کی قیمتی دولت استعمال کر کے جو سوشلسٹ سیکٹر بنایا تھا وہ مکمل طور پر ناکام رہا۔ اس کے باوجود ملک کا کامل تباہی سے بچ جانا جس وجہ سے ممکن ہوا وہ یہی نجی سیکٹر تھا جو ہمارے سوشلسٹ حکمرانوں کے علی الرغم ملک میں قائم رہا۔

اسی کے ساتھ اخلاقیات کا جو ماحول آج ہمارے ملک میں پایا جاتا ہے، اس میں ہمارے حکمرانوں کا کوئی حصہ نہیں۔ یہ تمام تر ان غیر سیاسی کوششوں کا نتیجہ ہے جو ملک کے مذہبی گروہ اپنے اپنے اداروں میں کرتے رہے ہیں۔ مثلاً مسلمان مسجدوں اور مدرسوں اور دوسرے اسلامی اداروں کی سطح پر، اسی طرح ہندو اپنے مختلف دھارمک اداروں کی سطح پر، وغیرہ۔ ضرورت ہے کہ غیر سیاسی سطح کی ان تعمیری کوششوں کو مزید اضافے کے ساتھ جاری رکھا جائے، کیوں کہ یہی وہ مقام ہے جہاں ملک کے لئے کسی بہتر مستقبل کی کرن دکھائی دیتی ہے۔

انڈیا اور پاکستان

انڈیا اور پاکستان

انڈیا اور پاکستان دونوں بظاہر ایک دوسرے کے حریف ملک ہیں۔ مگر دونوں کے درمیان سیاست اور دوسرے اعتبار سے حیرت انگیز مشابہت پائی جاتی ہے۔ میرے مطالعہ کے مطابق، دونوں ملکوں کے مسائل بھی ایک ہیں اور ان کے اسباب بھی ایک۔

دونوں ملکوں میں یکساں طور پر سیاسی عدم استحکام پایا جاتا ہے۔ دونوں ہی ملک اقتصادی اعتبار سے دنیا کے پسماندہ ملکوں میں شمار ہوتے ہیں۔ دونوں ہی ملکوں میں یہ المیہ پیش آیا کہ دونوں ہی ملک بلند بانگ دعووں کے ساتھ وجود میں آئے مگر آدھی صدی سے زیادہ مدت گزرنے کے باوجود دونوں ملکوں میں کوئی قابل ذکر ترقی نہ ہوسکی۔ اگر بظاہر کوئی ترقی کا واقعہ ہوا ہے تو وہ عالمی ترقیاتی سیلاب کا صرف ایک چھینٹا ہے، اور اس قسم کا خارجی چھینٹا دنیا کے ہر ملک کے حصہ میں آیا ہے، خواہ وہ کوئی چھوٹا ملک ہو یا کوئی بڑا ملک۔

ضرورت ہے کہ اس پورے معاملہ کا دوبارہ اندازہ (re-assessment) کیا جائے۔ اور یہ اندازہ انتہائی بے لاگ ہو۔ حتیٰ کہ اگر انڈیا اور پاکستان کے اعاظم اور اکابر اس کی زد میں آئیں تب بھی اس اندازہ کی موضوعیت (objectivity) کو متاثر نہ ہونے دیا جائے۔

ابتدائی تبصرہ

۱۹۴۷ سے پہلے ہندستانی قیادت کا ذہن یہ تھا کہ ساری برائیوں کی جڑ غلام لینڈ ہے اور ساری بھلائیوں کی جڑ آزاد لینڈ۔ اس ذہن کے تحت انھوں نے اپنی ساری طاقت اس محاذ پر لگادی کہ وہ ہندستان کو سیاسی غلامی سے نکال کر سیاسی آزادی کے دور میں پہنچائیں۔

عظیم کوششوں اور قربانیوں کے بعد اگست ۱۹۴۷ میں یہ نشانہ پورا ہوگیا۔ اب ہونا یہ چاہئے تھا کہ آزاد ہندستان اس خواب کی تعبیر بن جائے جس کو مہاتما گاندھی نے بائبل کے الفاظ کو مستعار لیتے ہوئے یہ کہا تھا کہ میرا مشن ہر آنکھ کے آنسو پونچھنا ہے۔ مگر عملاً اس کے برعکس ہوا۔ رونے والوں

کے آنسو تو خشک نہیں ہوئے، البتہ رونے والی آنکھوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔

اس معاملہ کی آخری حد یہ ہے کہ جن اہل مغرب کی سیاسی ماتحتی کو غلامی بتا کر اس کے خلاف آزادی کی جنگ لڑی گئی اور عظیم قربانی کے بعد اس سے نجات حاصل کی گئی تھی، آزادی کے بعد ہندستان کے بہترین ذہن ہندستان سے بھاگ کر دوبارہ انھیں اہل مغرب کے دیار میں پہنچنے لگے۔ چنانچہ آج ہمارے بہترین ذہن ہندستان کے آزاد لینڈ سے نکل کر برطانیہ اور امریکا کے ''غلام لینڈ'' میں جا کر آباد ہو رہے ہیں۔

آزادی کے بعد پیش آنے والے اس ظاہرہ کو عام طور پر برین ڈرین (brain drain) کہا جاتا ہے۔ ایک تعلیم یافتہ ہندو جو ہندستان سے نکل کر مغرب میں جا کر آباد ہو گیا ہے اس سے کسی نے اس برین ڈرین کی شکایت کرتے ہوئے کہا کہ آپ لوگ اپنے دیش کو چھوڑ کر کیوں باہر چلے جا رہے ہیں۔ اس نے جواب دیا:

Brain drain is better than the brain in drain.

اس جواب کا مطلب یہ تھا کہ ہندستانی دماغوں کا مغربی ملکوں میں جا کر ترقی کرنا اس سے بہتر ہے کہ وہ ہندستان کے غیر موافق ماحول میں پڑے رہیں اور ترقی نہ کر سکیں۔ اس تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ غلام لینڈ اور آزاد لینڈ کی تقسیم درست نہ تھی۔ اگر یہ تقسیم درست ہوتی تو یہ عجیب وغریب واقعہ پیش نہ آتا کہ لوگ اپنے دیش میں آزادی کی زندگی کو چھوڑ کر بدیش میں جا کر دوبارہ نئی قسم کی غلامی کو خود سے اپنے لئے قبول کر لیں۔

یہی معاملہ ۱۹۴۷ سے پہلے کی مسلم قیادت کا ہوا۔ اس قیادت نے یہ فرض کر لیا کہ تمام خوبیوں کا سرچشمہ مسلم لینڈ (Muslim land) ہے، اور تمام برائیوں کا سرچشمہ نان مسلم لینڈ (non-Muslim land) ہے۔ اس نظریہ کے تحت ایک پرشور تحریک شروع کی گئی۔ اور زبردست ہنگاموں اور بے شمار قربانیوں کے بعد آخر کار اگست ۱۹۴۷ میں برصغیر ہند کے ایک حصہ میں یہ مسلم لینڈ بن گیا۔

اب ہونا یہ چاہئے تھا کہ یہ مسلم لینڈ اس علاقہ کے تمام مسلمانوں کے لئے ان کے خوابوں کی تعبیر بن جاتا۔ یہاں ان کو دینی اعتبار سے مکمل طور پر ایک موافق ماحول حاصل ہوتا۔ یہاں ان کا جان

و مال پوری طرح محفوظ ہو جاتا۔ یہاں ان کے لئے ترقی کے تمام دروازے کھل جاتے۔ یہاں وہ، اپنے خیال کے مطابق، مسلمانوں کی عظمت رفتہ کا شاندار گنبد از سرِ نو بنا کر کھڑا کر دیتے۔ زمین کا یہ خطہ پورے معنوں میں ایک پاک سرزمین بن کر ان کے لئے گہوارۂ مسرت کی صورت اختیار کر لیتا۔

مگر نتیجہ بالکل برعکس نکلا۔ یہ مسلم لینڈ خود مسلمانوں کے لئے ایک غیر مطلوب ملک بن گیا۔ یہاں تک کہ لوگ مایوس ہو گئے اور مسلم لینڈ سے نکل کر نان مسلم لینڈ میں جا کر آباد ہونے لگے۔ میں نے امریکا میں آباد بہت سے پاکستانیوں سے پوچھا کہ آپ لوگ پاکستان کو چھوڑ کر یہاں کیوں آباد ہو گئے۔ تقریباً ان لوگوں کا جواب صرف دو تھا۔ کسی نے کہا کہ پاکستان میں ہمارے لئے ترقی کے زیادہ مواقع نہ تھے۔ کسی کا جواب یہ تھا کہ پاکستان میں ہم کو سیکورٹی حاصل نہیں تھی۔

یہ ایک حیرت انگیز واقعہ ہے کہ برصغیر ہند کے مسلمانوں نے اپنی قیادت کے تحت یہ پرشور مطالبہ کیا تھا کہ ہمیں اپنے دین کے مطابق رہنے کے لئے ایک علیٰحدہ ملک چاہئے۔ ہم ایک غیر مسلم ملک میں اپنے دین کے مطابق نہیں رہ سکتے۔ مگر جب خود ان کے اپنے نشانہ کے مطابق، ان کا مسلم لینڈ بن گیا تو یہاں بھی عین وہی واقعہ ہوا جو گاندھی اور نہرو کے ''آزاد لینڈ'' میں ہوا تھا۔ یعنی لاکھوں مسلمان اس مسلم لینڈ سے نکل کر دوبارہ امریکا اور یورپ کے ''نان مسلم لینڈ'' میں پہنچ گئے۔ اور اب وہ وہاں کی شہریت لے کر پر مسرت زندگی گزار رہے ہیں، حتیٰ کہ ان کا ایک نمائندہ اسٹیج پر پرفخر طور پر کہتا ہے کہ:

I am proud to be an American Muslim.

یہ تجربہ بتاتا ہے کہ ۱۹۴۷ سے پہلے مسلم لینڈ اور نان مسلم لینڈ کی جو تقسیم کی گئی، وہ درست نہ تھی۔ اگر وہ کوئی درست تقسیم ہوتی تو اس اسکیم کا یہ المناک انجام نہ ہوتا کہ وہ حقائق سے ٹکرا کر اس طرح پاش پاش ہو جائے۔

قائدین کا کردار

میری عمر اب (۱۹۹۹) ہجری کیلنڈر کے اعتبار سے اسّی سال ہو چکی ہے۔ میں نے اپنی تقریباً ساری عمر مختلف علوم کے مطالعہ میں گزاری ہے۔ میرے مطالعہ کے مطابق، کسی قوم کے مستقبل کو بنانے اور بگاڑنے میں ہمیشہ ان لوگوں کا حصہ ہوتا ہے جن کو قرآن میں اکابر قوم (الانعام ۱۲۳) کہا گیا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دراصل کسی قوم کے اکابر ہی ہیں جو اس کے مزاج ساز (opinion makers) ہوتے ہیں۔ یہی لوگ کسی قوم کو سمت کا شعور (sense of direction) دیتے ہیں۔ یہی لوگ کسی قوم میں وہ روایات قائم کرتے ہیں جن پر پوری قوم چلنے لگتی ہے۔ یہی لوگ کسی قوم کے لئے عملی نمونہ (role model) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور پھر یہی وہ لوگ ہیں جو کسی قوم میں بننے والی تاریخ کا آغاز کرتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ یہ لوگ تاریخ کے معمار ہوتے ہیں۔ وہ قوم کو صحیح رخ دیں تو قوم اپنی صحیح منزل تک پہنچتی ہے۔ اور اگر وہ قوم کو غلط رخ دیں تو قوم کا وہ حال ہوتا ہے جس کو ایک عربی شاعر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

اذا کان الغراب رئیس قوم سیھدیھم الیٰ دار البوار

حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کے اکابر ہی اس قوم کا مستقبل ہیں۔ یہی لوگ قوم کی قسمت کو بنانے والے بھی ہیں اور قوم کی قسمت کو بگاڑنے والے بھی۔

انڈیا کے اکابر

اب سب سے پہلے انڈیا کو لیجئے، میرے نزدیک انڈیا کے تمام مسائل ومصائب کے ذمہ دار بنیادی طور پر تین لوگ ہیں — مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، اور انتہا پسند ہندو کا وہ گروہ جس کے نتیجہ میں ہندوؤں میں وہ تنظیم وجود میں آئی جن کے مجموعہ کو سنگھ پریوار کہا جاتا ہے۔

مجھے مہاتما گاندھی کی حب الوطنی پر کوئی شک نہیں، مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مہاتما گاندھی ہی موجودہ المناک صورت حال کے پہلے ذمہ دار ہیں۔ ان کے مخصوص طریق کار نے ملک کو کئی مہلک تحفے دئے۔ مثلاً یہ کہ انھوں نے اسکول اور کالج اور یونیورسٹی میں تعلیم پانے والے نوجوانوں کو ابھارا کہ وہ اپنی تعلیم کو چھوڑ دیں اور باہر آکر ان کی ''پرامن عوامی فوج'' میں اضافہ کریں۔ اس جذباتی نعرہ کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ پوری زیر تعلیم نسل کیمپس سے نکل کر سڑکوں پر آگئی۔ یہاں تک کہ پورا تعلیمی نظام منتشر ہو کر رہ گیا۔ وہ تعلیمی روایات جو صدیوں سے چلی آرہی تھیں وہ اچانک درہم برہم ہو کر رہ گئیں۔

انگریز، اگرچہ خود اپنے انٹرسٹ کے تحت، مگر ملک کے حق میں، ایک بے حد مفید کام کررہے تھے۔

انھوں نے پورے ملک کو تعلیم یافتہ بنانے کی ایک زبردست مہم چھیڑ رکھی تھی۔ عنقریب وہ وقت آنے والا تھا جب کہ ہندستانی سماج صد فی صد تعلیم یافتہ سماج بن جائے۔ مگر مہاتما گاندھی کی تحریک نے اس تعلیمی تسلسل کو توڑ دیا۔ اور بلاشبہہ تمام نقصانوں میں یہ سب سے بڑا نقصان تھا۔

تعلیم صرف سروس کے لئے نہیں ہوتی۔ تعلیم کا سب سے بڑا مقصد قوم کو باشعور بنانا ہے۔ اور یہ صرف باشعور قوم ہے جس کے درمیان کوئی بڑا کام کیا جاسکتا ہے۔ مگر مہاتما گاندھی غالباً حقیقت سے آشنا نہ تھے۔ ان سے کسی نے کہا کہ ہندستان ابھی ایک غیر تعلیم یافتہ ملک ہے، اور غیر تعلیم یافتہ لوگ آزادی کا تحمل نہیں کر سکتے۔ مہاتما گاندھی کا سادہ جواب یہ تھا: میرے دیش کے لوگ اشکچھت ہیں، مگر وہ اگیانی نہیں ہیں۔ کاش مہاتما گاندھی کو یہ معلوم ہوتا کہ اَشکچھت لوگ ہی اَگیانی ہوتے ہیں۔ اگر وہ اس راز کو جانتے تو وہ کبھی بھی ملک میں جاری شدہ تعلیمی عمل کو اس طرح درہم برہم نہ کرتے۔ یہ دراصل تعلیمی اعتبار سے ہندستانی سماج کا پچھڑا پن ہی تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آزادی ہمارے یہاں عملاً وہ چیز بن گئی جس کو امریکی پروفیسر گال بریتھ (وفات ۲۰۰۶) نے فنکشننگ انارکی (functioning anarchy) سے تعبیر کیا تھا۔

مہاتما گاندھی نے اپنے تمام تر وطنی اخلاص کے باوجود، ایک اور غلطی یہ کی کہ انھوں نے عوام کو انگریزوں کے خلاف ابھارنے کے لئے وہ تحریک چلائی جس کو چرخا تحریک کہا جاتا ہے۔ مہاتما گاندھی کی اس تحریک میں چرخا دراصل ایک علامت تھا جس کے ذریعہ وہ ہندستان میں انگریزوں کے صنعتی نفوذ کو روکنا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندستانی لوگ برطانی مال کا بائیکاٹ کریں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ ملک میں مشینی کلچر کے بجائے دست کاری کلچر کو فروغ دیں۔

یہ تحریک یقینی طور پر ایک سیاسی مقصد کے تحت چلائی گئی، نہ کہ حقیقتاً اقتصادی مقصد کے تحت۔ میں یوپی کے ایک دور افتادہ گاؤں میں پیدا ہوا مگر مہاتما گاندھی کی تحریک اس طرح ملک گیر سطح پر پھیل گئی تھی کہ میرے چھوٹے سے آبائی گاؤں میں بھی یہ ہوا کہ مانچسٹر اور لنکا شائر کی ملوں میں بنے ہوئے کپڑے گھروں سے نکلوائے گئے اور پھر باہر کے ایک میدان میں ڈھیر کر کے تالیوں کے شور میں ان کو جلا دیا گیا۔

مہاتما گاندھی کی یہ تحریک بظاہر بدیشی مال کے بائیکاٹ کی تحریک تھی مگر عملاً وہ بدیشی ٹکنالوجی سے بائیکاٹ کے ہم معنی تھی۔ اس تحریک نے ملک کو ایک نا قابل تلافی نقصان پہنچایا۔ انگریز، اگر چہ اپنے انٹرسٹ کے تحت مگر ملک میں ایک نہایت اہم انقلاب لا رہے تھے، اور وہ تھا ملک کا انڈسٹرلائیزیشن۔ یعنی ملک میں مشینی صنعت کو فروغ دینا۔ مگر مہاتما گاندھی کی سودیشی تحریک نے اس عمل کو لمبے عرصہ تک کے لئے روک دیا۔

مہاتما گاندھی کا یہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے آزادی کی جدوجہد کو تشدد کے راستے سے ہٹایا اور پرامن جدوجہد کے راستے پر ڈالا۔ اس طرح انھوں نے ہندستانیوں کو جان و مال کے نقصان سے بچالیا جو متشددانہ طریق کار کے نتیجہ میں پیش آ رہا تھا۔ مگر طریق کار کے اس فرق کے باوجود ایک چیز پھر بھی مہاتما گاندھی کو درکار تھی اور وہ تھی ''طاقت''۔ کیوں کہ آزادی کی تحریک کسی نہ کسی طاقت ہی کے زور پر چل سکتی تھی۔ یہاں مہاتما گاندھی نے یہ کیا کہ عوامی مظاہروں کو طاقت کے طور پر استعمال کیا۔ وہ عوام کو ہر گوشے سے نکال کر سڑکوں اور میدانوں میں لے آئے۔

یہ کوئی سادہ عمل نہ تھا۔ اس کے لئے مہاتما گاندھی اور ان کے ساتھیوں کو روایت کو توڑنا پڑا۔ ہر سماجی ڈھانچے کو بکھیرنا پڑا۔ حتی کہ قانون شکنی کو بھی ایک جائز بلکہ پرفخر عمل کی صورت میں پیش کرنا پڑا۔

اس تدبیر کے نتیجہ میں مہاتما گاندھی کی تحریک کو عوامی بھیڑ تو مل گئی جس کے ذریعہ برٹش راج کو موثر طور پر چیلنج کیا جا سکے۔ مگر اس کا دوسرا نقصان یہ ہوا کہ ملک میں صدیوں سے قائم شدہ روایات کا احترام ختم ہو گیا۔ ان کا یہ عمل اپنے نتیجے کے اعتبار سے پوری سوسائٹی کو ڈی اسٹبلائز کرنے کے ہم معنی تھا۔ آزادی سے پہلے میں نے اپنی نوجوانی کی عمر میں ہندستان میں اخلاقی اقدار اور انسانی روایات کے اعتبار سے ایک مستحکم سماج دیکھا تھا مگر آزادی کے بعد میں ایک غیر مستحکم سماج (de-stabilised society) میں جینے کے لئے مجبور ہو گیا۔

کسی قوم کے ترقیاتی سفر میں اس قسم کی خلل اندازی تباہ کن حد تک مہلک ثابت ہوتی ہے۔ اور یہی ہمارے ملک میں پیش آیا۔ آزادی سے پہلے وسیع برٹش امپائر میں ہندستان سب سے زیادہ تیزی

سے ترقی کرنے والا ملک بنا ہوا تھا۔ مگر آزادی کے بعد دنیا کے ملکوں میں ترقی کے اعتبار سے وہ بہت زیادہ پچھڑ گیا اور اس پچھڑے پن کا واحد سب سے بڑا سبب مہاتما گاندھی اور ان کے ساتھیوں کی یہی غیر حقیقت پسندانہ سودیشی تحریک تھی۔ ہندستان کے صنعتی عمل میں اس نام نہاد سودیشی تحریک نے اگر یہ خلل نہ ڈالا ہوتا تو تقریباً یقین کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ انڈیا آج دنیا کے نقشہ پر ایک صنعتی دیو (industrial giant) کے روپ میں دکھائی دیتا۔

سوشلزم کا ناکام تجربہ

آزادی کے بعد ہندستان کی سیاسی باگ ڈور جواہر لال نہرو کے ہاتھ میں آئی ــــ اگر ان کے سیاسی رفیقوں کو شامل کرلیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ جواہر لال نہرو کی قیادت پورے چالیس سال تک ملک کی قسمت کی مالک بنی رہی۔ آزادی کے بعد ملک کے سیاسی اور اقتصادی اور سماجی ڈھانچہ کی تشکیل تمام تر نہرو اور ان کے گروپ نے انجام دی۔

جواہر لال نہرو کی بنیادی خامی یہ تھی کہ وہ ایک رومانی مفکر (romantic thinker) تھے۔ ان کے اس مزاج کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی ابتدائی عمر ہی میں سوشلسٹ بن گئے۔ انھوں نے ۱۹۳۶ء میں چھپنے والے اپنے آٹو بایوگرافی میں لکھا تھا کہ ــــ مسئلے کا کوئی حل اشتراکی نظام (socialist order) کے سوا نہیں۔ پہلے قومی دائرہ کے اندر اور پھر ساری دنیا میں جس میں دولت کی پیدائش اور تقسیم ریاست کی نگرانی میں مفاد عامہ کے لحاظ سے کی جائے۔ (صفحہ ۵۲۳)

یہ نظریہ سو سال پہلے بظاہر خوبصورت معلوم ہوتا تھا مگر اب تمام فکری اور عملی حقائق یہ ثابت کر چکے ہیں کہ یہ سوچ رومانی خوش خیالی کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ اس کا خارجی ثبوت یہ ہے کہ سوویت یونین کے تحت قائم ہونے والا سوشلسٹ ایمپائر پچھتر سال کے تجربہ کے بعد ۱۹۹۱ء میں اس طرح ڈھہ پڑا جیسے کہ وہ ریت کا ایک محل تھا جس کی سرے سے کوئی بنیاد ہی نہ ہو۔ دوسری طرف ہندستان میں بلند بانگ دعووں کے ساتھ قائم کیا جانے والا ہمالیائی پبلک سیکٹر کاغذی راون کی طرح دھڑام سے گر پڑا۔ یہاں تک کہ اس صنعتی ملبہ کو ٹھکانے لگانے کے لئے ڈس انوسٹمنٹ (dis-investment) کی مستقل وزارت مرکزی کابینہ میں قائم کرنی پڑی۔

سوشلسٹ نظام کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ وہ ایک غیر فطری نظام ہے، اور اس دنیا میں کسی ایسے نظام کا چلنا ممکن نہیں جو فطرت کی نفی پر قائم کیا گیا ہو۔

انسان کو مسلسل سرگرم رکھنے کے لئے فطرت نے جو نظام قائم کیا ہے وہ مسابقت (competition) کا نظام ہے۔ فطرت نے ہر انسان کے اندر ذاتی انٹرسٹ کا جذبہ رکھا ہے۔ اس جذبہ کے تحت ہر آدمی ترقی کی طرف دوڑنا چاہتا ہے۔ جب ایک ہی وقت میں سماج کے بہت سے لوگ ترقی کی دوڑ لگا رہے ہوں تو ان میں ہر ایک دوسرے کے لئے چیلنج بن جاتا ہے۔ یہ چیلنج ہر آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے امکانات کو زیادہ سے زیادہ بہتر طور پر استعمال کرے اور اس طرح زیادہ بہتر کارکردگی کا ثبوت دے کر دوسروں کے مقابلہ میں نہ صرف وہ زندہ رہے بلکہ ان سے آگے بڑھ جائے۔ یہی وہ عمل ہے جس کو مشہور مؤرخ آرنلڈ ٹوائن بی نے چیلنج رسپانس میکنزم (challenge-response mechanism) کے عمل کا نام دیا ہے۔

یہ نظام کسی نام نہاد استحصالی طبقہ کا قائم کیا ہوا نہیں ہے۔ وہ فطرت کے اٹل قوانین پر مبنی ہے۔ یہ خود فطرت ہے جس نے انسانی ترقی کے لئے عمل کا یہ کورس مقرر کیا ہے۔ کوئی شخص اس کورس کو مصنوعی طور پر معطل کر کے اپنے لئے خودکشی کا سامان تو کر سکتا ہے، جیسا کہ کمیونسٹ روس میں کلی طور پر اور سوشلسٹ انڈیا میں جزئی طور پر پیش آیا۔ مگر کسی کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ انسانی ترقی کے عمل کا کوئی دوسرا کورس مقرر کر سکے۔

آزادی کے بعد جواہر لال نہرو کی قیادت میں ہندستان میں سوشلزم اور پلاننگ اور پبلک سیکٹر اور اقتصادی کنٹرول کا جو نظام بنایا گیا وہ براہ راست طور پر ہندستان کی موجودہ تباہی کا ذمہ دار ہے۔ یہ نظام جس کو زیادہ بہتر طور پر اسٹیٹ ازم یا اسٹیٹ اکانومی کا نظام کہا جا سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پوری قوم کو ایسے افسروں اور ملازموں اور کارکنوں میں تبدیل کر دیا جائے جو سرکاری طور پر مراعات یافتہ ہوں اور جن کو ہر معاملہ میں سرکاری سرپرستی حاصل ہو۔

اس نظام نے عین اپنی فطرت کے مطابق، لوگوں سے عمل کا جذبہ (incentive) چھین لیا۔

لوگ یہ سمجھنے لگے کہ خواہ وہ کام کریں یا نہ کریں انھیں مہینہ کے آخر میں بہر حال ان کی مقرر تنخواہ مل جائے گی۔ اس مزاج نے پوری قوم کو کاہل (lethargic) بنا دیا۔

اس نام نہاد سوشلسٹ نظام کا دوسرا نقصان یہ ہوا کہ ہر معاملہ وزیروں اور افسروں کی اجازت پر منحصر ہو گیا، جب تک یہ سرکاری لوگ اپنا دستخط ثبت نہ کریں اس وقت تک کوئی بھی کام وقوع میں نہیں لایا جا سکتا تھا۔ یہی وہ چیز ہے جس نے موجودہ ہندستانی معاشرہ کو بھرشٹا چار اور بدعنوانیوں سے بھر دیا۔

سماجی علوم کے ماہر لارڈ ایکٹن نے درست طور پر کہا تھا کہ ــــ اقتدار بگاڑتا ہے، اور کامل اقتدار بالکل بگاڑ دیتا ہے:

Power corrupts, and absolute power corrupts absolutly.

جن لوگوں کے پاس اقتدار ہو، وہ فطری طور پر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ میں جو چاہوں کروں، میں دوسروں کے ہاتھ پکڑ سکتا ہوں مگر میرا ہاتھ کوئی پکڑنے والا نہیں۔ یہ مزاج آدمی کو ہمیشہ استحصال (exploitation) کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ چاہنے لگتا ہے کہ اپنی مقتدر حیثیت کی زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرے۔ یہی کرپشن کی اصل جڑ ہے۔ اسی سے رشوت اور افسر شاہی اور دوسری تمام بدعنوانیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس حقیقت کو سامنے رکھئے تو یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ سوشلسٹ سماج ایک ایسے بدعنوان سماج کا خوبصورت نام ہے جس میں سماج کے سب سے زیادہ کرپٹ طبقہ کو قومی اقتصادیات کا انچارج بنا دیا گیا ہو۔

کٹّر وادی طبقہ

ملک کے موجودہ بگاڑ کی تیسری ذمہ داری ان لوگوں پر ہے جن کو سنگھ پریوار کہا جاتا ہے۔ یہ کٹر وادی پریوار مختلف ہندو مفکرین کے اثر کے تحت بنا ہے۔ کسی ایک ہندو مفکر کے ساتھ اس کو منسوب کرنا شاید ممکن نہیں۔

سنگھ پریوار دراصل ہندو احیاء پرستی کے تحت بننے والے گروہوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ یہ ماضی پرست مفکرین ہندو دھرم اور ہندو کلچر سے گہرے طور پر متاثر تھے۔ وہ اس کو ملک کی پرفخر وراثت

سمجھتے تھے۔ اس کے تحت ان کے اندر یہ سوچ بنی کہ ملک کی ترقی کا واحد راز یہ ہے کہ ہندو سنسکرتی کو یہاں رائج کیا جائے۔ اور ہندو کلچر پر مبنی قومیت (cultural nationalism) کو ملک کی قومیت کی بنیاد قرار دیا جائے۔ اس نظریہ کے تحت انڈیا ہندو انڈیا کا دوسرا نام تھا۔ اس کے اعتبار سے مسلمان ہندو دھرم یا ہندو سنسکرتی کا محمدی سکٹ تھے اور عیسائی اس کا مسیحی سکٹ۔

ہندو احیاء کا یہ ذہن بیسویں صدی کے آغاز میں پیدا ہوا۔ عجیب بات ہے کہ عین اسی زمانہ میں مغربی تعلیم کے نتیجہ میں ہندوؤں میں بڑے پیمانہ پر موڈرنزم کا ذہن بھی پیدا ہو گیا۔ اس طرح ہندو سماج بیک وقت قدامت پسندی اور جدت پسندی کا متضاد مجموعہ بن گیا۔ اسی عجیب صورتحال کا ذکر مولانا اقبال احمد سہیل نے اپنے اس شعر میں کیا ہے:

آگے ہے قدم پیچھے ہے نظر، جانا ہے کہاں جاتے ہیں کدھر
مبہم ہے یہاں خود سمت سفر، نیرنگ زمانہ کیا کہئے

سنگھ پریوار کی اصل مشکل یہ ہے کہ اس کی آئیڈیالوجی ملک کے صرف ایک چھوٹے سے طبقہ کے لئے قابل قبول ہو سکتی ہے۔ زیادہ بڑا طبقہ وہ ہے جو اس آئیڈیالوجی کو سرے سے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ مسلمان اور عیسائی اس کو قبول کرنے پر اس لئے راضی نہیں ہو سکتے کہ یہ ان کے نزدیک ان کی مذہبی شناخت کو مٹانے کے ہم معنٰی ہے جو انھیں کسی بھی حال میں قبول نہیں ہو سکتی۔ ہندوؤں کے دلت اور ہریجن بھی اس کو قبول نہیں کر سکتے کیوں کہ اس قسم کی آئیڈیالوجی ان کے نزدیک نیچی ذات کے اوپر اعلیٰ ذات والوں کا تسلط قائم کرنے کے ہم معنیٰ ہے۔ ہندوؤں کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی اس کو قبول نہیں کر سکتا کیوں کہ وہ اس طرح کی کسی اسکیم کو اپنی ترقی میں کھلی رکاوٹ سمجھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ سنگھ پریوار ہندو سنسکرتی پر مبنی جو سماج قائم کرنا چاہتا ہے، خود ملکی سماج کا تقریباً ۷۵ فیصد حصہ اس کو قبول کرنے پر راضی نہیں۔

ہندستانی سماج کی مذکورہ صورت حال کی بنا پر عملاً جو ہوا وہ یہ تھا کہ سنگھ پریوار ملک میں ایک قسم کا عقب لشکر (rear-guard) بن گیا۔ اس کا پورا کردار منفی کردار ہو کر رہ گیا۔ تھوڑے سے قدامت پسند

ہندوؤں کو جذباتی خوراک دے کر انھوں نے ضرور اکٹھا کرلیا مگر ملک کی بہت بڑی اکثریت، جن میں ہندو بھی شامل ہیں ان سے سخت بیزار ہوگئی۔ اس طرح ملک میں ایک ایسی کشاکش برپا ہوگئی جس نے پورے ملک کو نفرت اور عصبیت اور تشدد سے بھر دیا۔ چنانچہ سنگھ پریوار کے لوگوں نے کوئی مثبت کام نہیں کیا۔ ان کا رول اول سے آخر تک صرف منفی رہا۔

کچھ دانشوروں کا یہ کہنا شاید کسی مبالغہ کے بغیر درست ہے کہ سنگھ پریوار کے لوگوں نے ملک میں صرف تین کارنامے انجام دئے ہیں — اول، ۱۹۴۸ء میں مہاتما گاندھی کو قتل کرنا۔ دوم، ۱۹۹۲ء میں ایودھیا کی تاریخی بابری مسجد کو ڈھانا۔ سوم، ۱۹۹۸ء میں ایٹمی دھماکہ کرکے برصغیر ہند میں ایٹمی جنگ کا خطرہ کھڑا کرنا۔

مجھے اس سے بحث نہیں کہ سنگھ پریوار کی ہندو آئیڈیالوجی اصولی طور پر درست ہے یا نادرست، مگر یہ یقینی ہے کہ زور اور زبردستی کے ذریعہ اس قسم کی آئیڈیالوجی کو سارے ملک پر مسلط کرنا ہلاکت خیز حد تک غلط ہے۔ جب ملک کی بڑی اکثریت بیزاری کی حد تک آپ کی آئیڈیالوجی کے خلاف ہو تو ایسی صورت میں اس کو برپا کرنے کی کوشش کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ لوگوں کے اندر جھنجھلاہٹ پیدا ہو جائے گی۔ لوگ ایک دوسرے کو غلط ثابت کرنے کے لئے جھوٹا پروپیگنڈہ کریں گے۔ اپنے موقف کو جائز بتانے کے لئے خود ساختہ تاریخ لکھی جائے گی۔ ان ساری کوششوں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک میں نفرت اور کٹّر پن کا جنگل اگے گا جو آخر کار تشدد تک پہنچ جائے گا۔ سارے لوگوں کو ''ہندو'' بنانے کی کوشش کا عملی نتیجہ یہ نکلے گا کہ غیر ہندو تو درکنار خود سنجیدہ اور تعلیم یافتہ ہندو بھی اس غیر فطری اسکیم سے سخت بیزار ہو جائیں گے۔

یہ نقصان صرف ان لوگوں کے حصہ میں نہیں آئے گا جو سنگھ پریوار سے باہر ہیں، خود سنگھ پریوار کو بھی اس کا شدید ترین نقصان اٹھانا پڑے گا۔ وہ یہ کہ سنگھ پریوار کے لوگوں میں بہت بڑے پیمانہ پر منافقت (hypocrisy) پیدا ہو جائے گی۔ یہ ایک مسلّمہ اصول ہے کہ جب بھی کوئی شخص یا گروہ ایک ایسا نظریہ بنائے جو فطرت کے قانون کے مطابق قابل عمل نہ ہو تو ساری کوشش کے بعد

آخر کار اس کے لئے دو میں سے ایک کا انتخاب (choice) رہتا ہے— یا تو وہ صاف لفظوں میں یہ اعلان کرے کہ وہ غلطی پر تھا یا پھر حالات سے مجبور ہو کر وہ منافقانہ روش اختیار کرلے۔ یعنی اپنے دل میں تو خفیہ ایجنڈا (hidden agenda) کے طور پر وہ پچھلے نظریہ ہی کو لئے رہے مگر خارجی دباؤ کے تحت وہ اس کے بالکل برعکس روش اختیار کرلے۔ یہ ایک اٹل فطری قانون ہے۔ اور سنگھ پریوار کا کیس یقینی طور پر اس معاملہ میں کوئی مستثنیٰ کیس نہیں۔

انڈیا کی موجودہ صورت حال میں یہاں صرف ایک ہی طریقہ قابل عمل ہے۔ اور وہ یہ کہ سیاست اور مذہب کو ایک دوسرے سے الگ رکھا جائے، نظری طور پر نہیں بلکہ عملی طور پر۔ یعنی لوگ اپنے ذاتی دائرہ میں خواہ جو بھی عقیدہ رکھیں مگر سیاسی نوعیت کے عملی معاملات کو انھیں مشترک مفادات کی بنیاد پر قائم کرنا چاہئے۔ سیاست اور مذہب کے درمیان اسی عملی علیٰحدگی، نہ کہ نظری علیٰحدگی کو سیکولرزم کہا جاتا ہے۔ سنگھ پریوار نے اگر اب تک نہیں جانا تھا تو اب اس کو بخوبی طور پر جان لینا چاہئے کہ انڈیا کے موجودہ حالات میں یہاں کا سیاسی نظام صرف سیکولرزم کی بنیاد پر قائم کیا جاسکتا ہے۔ ہندوتو کی بنیاد پر ملک میں ایک اجتماعی نظام کو قائم کرنے کا منصوبہ ایک مہلک قسم کا فناٹسزم (fanaticism) ہے نہ کہ کوئی حقیقی اسکیم۔

ہندستان کا مستقبل

یہ سوال اکثر کیا جاتا ہے کہ ہندستان کا مستقبل کیا ہے۔ اس قسم کے سوالات ہمیشہ کسی ''اگر'' پر موقوف ہوتے ہیں۔ یہاں بھی اس سوال کا جواب اسی قسم کے ایک اگر پر موقوف ہے۔

یہ اگر کیا ہے۔ وہ اگر یہ ہے کہ ہندستان کے رہنما اور دانشور قومی عمل کا منصوبہ حقائق (realities) کی بنیاد پر بنائیں گے یا خود ساختہ نظریات کی بنیاد پر۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، جواہر لال نہرو کی قیادت میں کانگریس نے ایک خود ساختہ نظریہ پر ملک کو چلانا چاہا جو سراسر ناکام ہو گیا۔ اب دوبارہ سنگھ پریوار کے لوگ بھی ایک اور خود ساختہ نظریہ پر ملک کے سماج کی تشکیل کرنا چاہتے ہیں۔ کانگریس کا خود ساختہ نظریہ اگر سماج واد تھا تو سنگھ پریوار کا خود ساختہ نظریہ ہندوواد ہے جس کو وہ بطور خود کلچرل نیشنلزم

کا نام دیتے ہیں۔ مگر یہ دونوں ہی نظریے یکساں طور پر ناقابل عمل ہیں کیوں کہ وہ فطرت کے قوانین سے مطابقت نہیں رکھتے۔

انگریزی میں ایک بہت بامعنیٰ مقولہ ہے ـــــ سیاست ممکن کا فن ہے۔

Politics is the art of the possible.

ملک کی تمام پارٹیوں، خواہ وہ دائیں بازو کی ہوں یا بائیں بازو کی یا کسی اور بازو کی، سب کو میرا یہ مشورہ ہے کہ وہ فطرت سے نہ لڑیں۔ وہ ناممکن کے میدان میں اپنی طاقت ضائع کرنے کے بجائے ممکن کے میدان میں اپنا عمل کریں اور پھر ایک ہی نسل میں وہ ہندستان وجود میں آئے گا جس کا ہم سب لوگ لمبی مدت سے خواب دیکھ رہے ہیں۔

انسان خود اپنی فطرت کے زور پر عمل کرنا چاہتا ہے۔ کسی ملک کے سسٹم کا کام صرف یہ ہے کہ وہ بہترین انفراسٹرکچر ملک میں فراہم کردے اور پھر ہر آدمی ہیرو بن کر ملک کی تعمیر میں اپنا حصہ ادا کرنے لگے گا۔

جب بارش ہوتی ہے تو زمین پر گرنے والا پانی اپنے آپ بہنا شروع ہو جاتا ہے، پانی رکنا نہیں جانتا۔ اسی طرح انسان خود اپنی فطرت کے لحاظ سے آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ انسان کی فطرت رکنا نہیں ہے بلکہ چلنا ہے۔ ایسی حالت میں کسی انسانی معاشرہ کی ترقی کے لئے اصل ضرورت یہ ہے کہ اس کے سفر میں رکاوٹیں نہ ڈالی جائیں بلکہ راستہ کو ہموار کردیا جائے۔ اس کے بعد انسان اپنے آپ اپنا سفر شروع کردے گا۔

ہندستان میں لمبی مدت گزرنے کے باوجود ترقی نہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ ۱۹۴۷ کے بعد جو پارٹیاں اقتدار میں آئیں وہ اپنے خود ساختہ نظریات لئے ہوئے تھیں۔ انھوں نے سماج کو انھیں نظریات پر چلانا چاہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ لوگ صرف ترقی کے راستہ میں رکاوٹ بن کر رہ گئے۔

یہ ملک کی خوش قسمتی تھی کہ سماج کا ایک طبقہ پھر بھی آزاد رہا۔ وہ اپنی فطرت کے زور پر عمل کرتا رہا۔ یہ وہی طبقہ ہے جس کو عام طور پر ''پرائیویٹ سیکٹر'' کہا جاتا ہے۔ ملک میں اس وقت جو کچھ بھی ترقی نظر آتی ہے وہ اسی پرائیویٹ سیکٹر کی کارکردگی کا نتیجہ ہے۔ مثال کے طور پر انفارمیشن ٹکنالوجی میں

ہندستان آج ترقی یافتہ ملکوں میں شمار ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ آج یہ حالت ہے کہ ہندستان مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں کو اپنے تیار کردہ سامان اور اپنے تربیت یافتہ افراد فراہم کرنے کی پوزیشن میں ہے۔ اسی طرح ہمارے قومی خزانے میں جوزرمبادلہ ہے اس کا بڑا حصہ پرائیویٹ سیکٹر کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ ان ترقیوں میں سرکاری سیکٹر یا پبلک سیکٹر کا کوئی حصہ نہیں۔

پاکستان کا معاملہ

اب پاکستان کو لیجئے۔ پاکستان ۱۹۴۷ میں بنا۔ اس کے فکری خالق ڈاکٹر محمد اقبال تھے۔ انھوں نے ۱۹۳۰ میں مسلم لیگ کے اجلاس (الٰہ آباد) میں یہ نظریہ پیش کیا کہ ہندستان کا ایک حصہ، جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اس کو تقسیم کر کے ایک علیٰحدہ مسلم لینڈ بنا دیا جائے۔ یہ اسکیم بعد کو پاکستان کے نام سے مشہور ہوئی اور مسٹر محمد علی جناح نے مسلمانان ہند کی عمومی حمایت سے اس کو عملی واقعہ بنایا۔

اسلام ایک دعوتی مذہب ہے۔ اس کا مزاج یہ ہے کہ ساری انسانیت کو خدا کے سایۂ رحمت میں لایا جائے۔ ایک ایسے دین میں جغرافی تقسیم کا تصور سراسر اجنبی ہے۔ اسلام کی چودہ سوسالہ تاریخ میں مسلمانوں پر ہر قسم کے احوال پیش آئے۔ مگر مسلمانوں نے کبھی بھی جغرافی تقسیم کے فارمولے کو اختیار نہیں کیا۔

یہ کہنا کہ اقبال نے پاکستان کی تجویز اس لئے پیش کی تھی کہ وہاں اسلامی ریاست قائم کی جائے۔ یہ اور بھی زیادہ ناقابل فہم ہے۔ اسلامی ریاست قائم کرنے کا عمل انسان پر کیا جاتا ہے، نہ کہ کسی زمینی ٹکڑے پر۔ پہلے لینڈ حاصل کرنا اور پھر وہاں اسلامستان بنانا عین وہی الٹی تدبیر ہے جس کو ایک انگریزی مثل میں گھوڑے کے آگے گاڑی باندھنا کہا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں جس چیز کو اسلامی بنایا جاتا ہے وہ انسان ہے نہ کہ کوئی جغرافی خطہ، اس لئے اسلامائیزیشن آف لینڈ سرے سے کوئی نظریہ نہیں۔ اسلامائیزیشن آف مین کا عمل ہر ملک میں کیا جاسکتا ہے، اس کے لئے یہ ضرورت نہیں کہ پہلے ایک تقسیم شدہ ملک حاصل کیا جائے، پھر اس کو اسلامی بنایا جائے۔

اصل یہ ہے کہ اقبال، اسلام کے نام سے جس چیز کو جانتے تھے وہ صرف اسلام کی پرفخر تاریخ

تھی نہ کہ حقیقتاً سلام۔ موجودہ زمانہ کے بہت سے دوسرے مسلمانوں کی طرح اقبال بھی بعد کو بننے والی مسلم تاریخ میں گم رہے، وہ اصل اسلام تک نہ پہنچ سکے۔ وہ اسلام کی تاریخی عظمت (historical glory) میں جیتے تھے۔ اقبال کا اردو اور فارسی کلام مسلم تاریخ کی عظمت اور فخر کے تذکروں سے بھرا ہوا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ قرطبہ اور غرناطہ کے درودیوار تو انھیں قابل زیارت نظر آئے مگر مکہ کا حرم اور مدینہ کی مسجد ان کے لئے اتنی پرکشش ثابت نہ ہوسکی کہ وہ اس کی زیارت کے لئے شدّ رحال کریں۔ تاریخی عظمت کے ساتھ ان کی مسحوریت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ مسلم اسپین کے کھنڈروں کو دیکھ کر انھوں نے سمجھا کہ یہ صرف ایک سیاسی تاریخ کا مزار نہیں ہے بلکہ خدانخواستہ وہ خود اسلام کا مزار ہے۔ چنانچہ انھوں نے کہا:

رولے اب دل کھول کر اے دیدۂ خوں نابہ بار　　وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار

پاکستان کے لئے اقبال کا خواب دراصل اسلام کی اسی تاریخی عظمت کی ایک تعبیر تھی۔ وہ پاکستان کی صورت میں ایک ایسی سرزمین چاہتے تھے جہاں وہ مسلمانوں کے فخر اور عظمت کا سیاسی گنبد تعمیر کرسکیں۔ یہ الگ بات ہے کہ فخر وعظمت کا سیاسی گنبد اس طرح نہیں بنتا جس طرح اقبال نے اپنے شاعرانہ تخیل کے تحت اس کو بنانا چاہا تھا۔

ایک مغربی پروفیسر نے ایک بار مجھ سے کہا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا کیس پیرانوئیا (paranoia) کا کیس ہے۔ پیرانوئیا کا لفظ اسی نفسیات کے لئے بولا جاتا ہے جس کو فارسی میں پدرم سلطان بود کہتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی نفسیات کا یہ ایک صحیح ترین بیان ہے۔

میرے نزدیک اقبال کا واحد کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کو پدرم سلطان بود کی نفسیات میں مبتلا کردیا۔ وہ مسلمانوں کو عظمت ماضی کی لوریاں دیتے رہے یہاں تک کہ پوری قوم جذباتیت کی حد تک فخر ماضی میں جینے لگی۔ یہی غیر حقیقت پسندانہ نفسیات ہے جس نے تحریک پاکستان جیسی جذباتی تحریک کے لئے زمین فراہم کی۔ اگر برصغیر ہند کے مسلمان اس بڑھی ہوئی جذباتیت کے شکار نہ ہوتے تو وہ کبھی بھی ایسا نہ کرتے کہ وہ پاکستان جیسی تحریک تقسیم کے گرد دیوانہ وار اکٹھا ہوجائیں۔

پاکستان اس لئے بنایا گیا تھا کہ مسلمان ہندوؤں کے خطرے سے محفوظ رہیں۔ اقبال کے اندر حقیقی معنوں میں بصیرت (vision) موجود ہوتی تو وہ جانتے کہ پاکستان ایک ایسی اسکیم ہے جو اپنے عملی نتیجہ کے اعتبار سے کاونٹر پروڈکٹیو (counter productive) ثابت ہونے والی ہے۔ صاحب بصیرت آدمی پیشگی طور پر اس انجام کو دیکھ سکتا تھا۔ اب تو ہر اندھے آدمی کو معلوم ہے کہ پاکستان نے جو کارنامہ انجام دیا وہ صرف یہ تھا کہ اپنی 'حریف' قوم (ہندو) کو ایک واحد ملک کی صورت دے کر اس کو قوی تر بنادیا اور دوسری طرف مسلمانوں کو چار حصوں (پاکستان، بنگلہ دیش، ہندستانی مسلمان، کشمیر) میں تقسیم کر کے ان کو ضعیف سے ضعیف تر بنا دیا۔ مزید یہ کہ انتہائی بے دانشی کی بنا پر کشمیر کی صورت میں دونوں ریاستوں کے درمیان ہلاکت خیز حد تک ایک ایسا پیچیدہ مسئلہ رکھ دیا جس پر دونوں قومیں ہمیشہ لڑتی رہیں اور وہ کبھی ترقی نہ کر سکیں۔

قائد پاکستان

اب مسٹر محمد علی جناح کو لیجئے۔ مجھے جناح صاحب کی نیت یا ان کی دین داری سے کوئی بحث نہیں، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ جناح صاحب نے تحریک پاکستان کا قائد بن کر ایک ایسی ذمہ داری کو سنبھالا جس کے لئے وہ ہرگز اہل (competent) نہ تھے۔ وہ زیادہ سے زیادہ ایک قانونی وکیل تھے، جب کہ برصغیر ہند میں مسلمانوں کو باعزت مقام دینے کے لئے ایک دور اندیش اور اعلیٰ بصیرت والے انسان کی ضرورت تھی، اس کے لئے قانونی نکتوں کا ماہر درکار نہ تھا بلکہ وہ مدبّرانہ دماغ درکار تھا جو تاریخی حقائق پر نظر رکھتا ہے، جو مستقبل کو حال میں دیکھتا ہے۔ قوموں کی رہنمائی کا کام مستقبل بینی کا کام ہے نہ کہ قانونی نکتہ بینی کا کام۔

بدقسمتی سے اس وقت کے مسلمان اپنی بڑھی ہوئی جذباتیت کی بنا پر وکیل اور مدبر کے فرق کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ وہ اس بات کا شعور نہیں رکھتے تھے کہ قانون داں کیا ہوتا ہے اور تاریخ داں کیا۔ مسلمانوں کی یہی حد سے بڑھی ہوئی بے شعوری تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جناح صاحب جیسا آدمی ان کا قائداعظم بن گیا۔ مسلمان اگر ان کو عدالت کے مقدمات کے لئے وکیل اعظم بناتے تو ان کا ایسا کرنا

غلط نہ ہوتا مگر قومی مستقبل کی تشکیل کے لئے ان کو قائداعظم بنانا بلاشبہہ ایک ایسا غلط فیصلہ تھا جس کی بھاری قیمت مسلمان نصف صدی سے ادا کر رہے ہیں اور شاید ابھی مزید کئی صدیوں تک ادا کرتے رہیں گے۔

پاکستان کے قیام سے جو ملّی اور اسلامی فائدے بتائے جاتے تھے، ان میں سے کوئی بھی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ پاکستان کا قیام برصغیر ہند کے مسلمانوں کے مسائل میں صرف اضافہ کا سبب بنا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کو آج تمام لوگ حتیٰ کہ خود پاکستانی دانشور بھی تسلیم کرتے ہیں۔ البتہ یہ حضرات اس المیہ کا ذمہ دار ہندو لیڈرشپ کو قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ تمام تر ہندوؤں کی سازش تھی جس نے پاکستان کے حسین خواب کو شرمندۂ تعبیر نہ ہونے دیا۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ توجیہہ انتہائی حد تک بے بنیاد ہے۔ یہ عقل کے بھی خلاف ہے، نیز وہ قرآن کے تصورِ تاریخ کی تردید کے ہم معنیٰ ہے۔ قرآن میں واضح طور پر یہ اعلان کیا گیا ہے کہ کسی گروہ کی قومی حالت اس وقت تک نہیں بدلتی جب تک کہ اس نے خود اپنی داخلی حالت کو نہ بدل ڈالا ہو (الرعد ۱۱)۔ اسی طرح قرآن میں مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے فطرت کے اٹل قانون کا اعلان ان الفاظ میں کیا گیا ہے: **وما اصابکم من مصیبة فبما کسبت ایدیکم** (الشوریٰ ۳۰) یعنی اور جو مصیبت تم کو پہنچی ہے تو وہ تمھارے اپنے ہاتھوں کے کئے ہوئے کاموں ہی سے ہے۔

پاکستان کے لوگ اپنے ملک میں قرآن کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس عمل کا آغاز انھیں سب سے پہلے یہاں سے کرنا چاہئے کہ وہ اعلان کریں کہ پاکستان کے مسائل کا ذمہ دار ہندو کو قرار دینا قرآن سے فکری بغاوت کی حد تک غلط تھا۔ اب ہم اپنے ان الفاظ کو واپس لیتے ہیں اور یہ اعتراف کرتے ہیں کہ خود پاکستانیوں کے سوا کوئی بھی نہیں جو پاکستان کے مسائل کا ذمہ دار ہو۔

جناح صاحب کے بارے میں یہاں ایک حوالہ قابل ذکر ہے، پاکستان کے ایک اردو ماہنامہ سے لے کر یہ حوالہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

’’پیر سید جماعت علی شاہؒ کے کسی مرید نے ان سے کہا کہ حضرت آپ اتنی بڑی روحانی، علمی،

اور دینی شخصیت ہیں اور آپ نے ایک داڑھی منڈے کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ ان کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی ہے۔ اصل میں میرا ایک مقدمہ ہے جس کی حیثیت قومی مقدمہ کی ہے۔ یہ ہندو قوم کے خلاف مسلمان قوم کا مقدمہ ہے، مجھے مسلمانوں کے اس قومی مقدمے کے لئے ایک وکیل چاہئے، لیکن وہ وکیل ایک ماہر قانون ہونا چاہئے۔ اس میں یہ صلاحیت ہونی چاہئے کہ اپنے دلائل کو وہ موثر طور پر پیش کر سکے، اور مجھے ایسی شخصیت قائداعظم کی صورت میں ملی ہے، لہذا میں نے اپنا قومی مقدمہ ان کے حوالہ کر دیا ہے۔ ان کی حیثیت ہندستان کے مسلمانوں کے وکیل کی ہے''۔
(ماہنامہ میثاق، لاہور، ستمبر ۲۰۰۰، صفحہ ۳۹)

جماعت علی شاہ کا مذکورہ قول ایک غلط قسم کی ثنائیت (dichotomy) پر مبنی ہے۔ انھوں نے سمجھا کہ ان کے لئے جن دو کے درمیان انتخاب کا مسئلہ ہے وہ ماہر وکیل اور غیر ماہر وکیل کے درمیان کا مسئلہ ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس دو قسمی ذہن کے تحت غیر ماہر وکیل کو چھوڑ کر ماہر وکیل کو لے لیا۔ مگر اس قومی معاملہ میں یہ ثنائیت بذات خود درست نہیں۔ اس معاملہ میں ان کے لئے جن دو کے درمیان انتخاب کا مسئلہ تھا وہ وکیل اور مدبر کے درمیان تھا نہ کہ ایک وکیل اور دوسرے وکیل کے درمیان۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستانی تحریک کی قیادت کے لئے مسلمانوں کو ایک مدبر کی ضرورت تھی، نہ کہ ایک وکیل کی۔ یہ کسی عدالت میں ایک قانونی مقدمہ جیتنے کا معاملہ نہ تھا بلکہ وہ برصغیر ہند کے مسلمانوں کے مستقبل کی تعمیر کا معاملہ تھا۔ اس معاملہ میں کامیاب رہنمائی کے لئے صرف یہ لیاقت کافی نہ تھی کہ آدمی اسمبلیوں میں وضع کی ہوئی قانونی دفعات کا ماہر ہو۔ بلکہ اس کے لئے اس انسان کی ضرورت تھی جو تاریخ اور انسانی علوم میں گہری بصیرت رکھتا ہو۔ جو یہ جانتا ہو کہ حال میں اس کا اٹھایا ہوا قدم مستقبل میں کس قسم کے نتائج پیدا کرنے والا ثابت ہوگا۔

اس سلسلہ میں میں صرف ایک معاملہ کی مثال دوں گا جس کو پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ سمجھا جاتا ہے۔ یعنی کشمیر کا مسئلہ۔ پاکستان کے دانشور اپنے خیال کے مطابق، کشمیر کے مسئلہ کی ذمہ داری

تمام تر ''بھارت'' کے اوپر ڈالے ہوئے ہیں۔ لیکن غیر جانب دار تجزیہ میں اس کی ذمہ داری برعکس طور پر پاکستان کے قائد اور معمار مسٹر محمد علی جناح پر عائد ہوتی ہے۔

آزادئ ہند کے دستاویزات بتاتے ہیں کہ انگریزوں نے اس ملک کو دو حصوں میں بانٹ رکھا تھا۔ برٹش انڈیا اور اسٹیٹ انڈیا۔ اس کے مطابق انھوں نے یہ کیا کہ برٹش انڈیا کو آبادی کے اصول پر تقسیم کر دیا۔ لیکن ریاستوں کے معاملہ کو انھوں نے خود ریاستوں پر چھوڑ دیا کہ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں جو فیصلہ چاہیں کریں۔

آزادئ ہند کی دستاویزات بتاتی ہیں کہ اس معاملہ میں کانگریس کے لیڈروں کا یہ کہنا تھا کہ جس اصول پر برٹش انڈیا کی تقسیم ہوئی، اسی اصول پر اسٹیٹ انڈیا کو بھی تقسیم کر دیا جائے۔ یعنی جس اسٹیٹ میں ہندوؤں کی آبادی زیادہ ہو اس کو انڈیا سے ملحق کر دیا جائے اور جس ریاست کی آبادی میں مسلمان زیادہ ہوں وہ پاکستان کا حصہ قرار پائے۔ مگر یہ مسلم لیگ کی اعلیٰ قیادت تھی جس نے اس معاملہ میں کانگریس کی تجویز کو نہیں مانا۔ چنانچہ تقسیم کے وقت ریاستوں کے مستقبل کا معاملہ غیر واضح حالت میں پڑا رہا۔

مسلم لیگ کی قیادت عظمیٰ کا یہ رویہ کیوں تھا۔ اس کا سبب غالباً وہی چیز تھی جس کو مذکورہ پیر صاحب نے ''قانونی مہارت'' کہا ہے۔ اس قیادت کی ذہنی تربیت عدالتوں کے ماحول میں ہوئی تھی جہاں قانونی نکتوں پر معاملات کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ اپنے اس ذہن کی بنا پر اس نے سمجھا کہ وہ نکتوں کے زور پر اس معاملہ کا فیصلہ اپنے حق میں کر لیں گے۔

برصغیر ہند میں ریاستوں کی تعداد تقریباً پانچ سو تھی۔ مگر یہ سب زیادہ تر چھوٹی ریاستیں تھیں جو اس حیثیت میں نہ تھیں کہ وہ کوئی حقیقی مسئلہ بن سکیں۔ اصل قابل لحاظ مسئلہ صرف دو بڑی ریاستوں کا تھا۔ کشمیر اور حیدر آباد۔ دونوں میں یہ فرق تھا کہ کشمیر میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ تھی مگر وہاں کا حکمراں ایک ہندو تھا۔ اس کے برعکس حیدر آباد میں ہندوؤں کی آبادی زیادہ تھی، جب کہ وہاں کا حکمراں ایک مسلمان تھا۔

وکیل کا ذہن اپنی مخصوص تربیت کی بنا پر یہ بن جاتا ہے کہ وہ یہ نہیں دیکھتا کہ کسی معاملہ میں حق

کیا ہے اور ناحق کیا۔ اس کا ذہن یہ ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح وہ معاملہ کا فیصلہ اپنے موافق کرالے۔ اپنے اس مخصوص مزاج کی بنا پر وکیل کا ذہن ہمیشہ قانونی نکتوں پر چلتا ہے، نہ کہ حقائق واقعی پر۔ مسلم لیگ کی قیادت نے اپنے اسی مخصوص مزاج کی بنا پر ایسا نکتہ دریافت کرلیا جس کے ذریعہ وہ بیک وقت دونوں کو پاکستان کے خانہ میں ڈال دے، کشمیر کو بھی اور حیدرآباد کو بھی۔

مگر مسلم لیگ کی قیادت اس اہم پہلو کو بھول گئی کہ اس طرح کے قومی معاملات کا فیصلہ لفظی نکتوں کی بنیاد پر نہیں ہوتا بلکہ حقائق اور واقعات کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ چنانچہ لفظی نکتہ پر حقائق کی منطق غالب آئی اور مسلم لیگ کی قیادت کے ساتھ وہ واقعہ پیش آیا جو ایک جاپانی کہاوت میں اس طرح بیان کیا گیا ہے ـــــ جو آدمی دو خرگوش کے پیچھے دوڑے وہ ایک کو بھی نہیں پکڑ سکتا۔

یہ بات بھی دستاویز کے ذریعہ ثابت ہوتی ہے کہ تقسیم (۱۹۴۷) کے بعد بھی کانگریس کی لیڈر شپ اس معاملہ میں باہمی ایڈجسٹمنٹ کے لئے تیار تھی۔ یعنی وہ اس پر راضی تھی کہ اس معاملہ کو دونوں ملکوں کے درمیان نزاع کا معاملہ نہ بننے دیا جائے بلکہ اس کو اس طرح حل کرلیا جائے کہ پاکستان حیدرآباد پر ہندستان کا حق تسلیم کرلے، اور اس طرح ہندستان کشمیر کے اوپر پاکستان کے حق کو مان لے۔

اس معاملہ میں یہاں میں خود پاکستان کی ایک ذمہ دار شخصیت کا حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ چودھری محمد علی جو مسلم لیگ میں اعلیٰ عہدے پر تھے اور بعد کو وہ پاکستان کے وزیر اعظم (۱۹۵۵۔۱۹۵۶) بنے۔ ان کی ایک انگریزی کتاب چھپی ہے جس کا نام ایمرجنس آف پاکستان (Emergence of Pakistan) ہے۔ اس کتاب میں ریاستوں کے الحاق کے بارے میں ایک تفصیلی باب ہے۔ جوناگڑھ ایک سرحدی ریاست تھی جس کا نواب مسلمان تھا مگر اس کی آبادی زیادہ تر ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ آزادی کے بعد جوناگڑھ کے نواب نے غیر حکیمانہ طور پر پاکستان سے الحاق کر لیا، اور پاکستان کی حکومت نے بھی اس غیر حقیقت پسندانہ اقدام کی توثیق کرتے ہوئے اس الحاق کو تسلیم کرلیا۔ مگر ہندستان نے پولیس ایکشن کرکے اس کو انڈیا میں شامل کرلیا۔

اس کے بعد حکومت پاکستان کی درخواست پر دہلی میں اعلیٰ سطح کی میٹنگ ہوئی۔ اس میٹنگ میں

ہندستان کی طرف سے جواہرلال نہرو اور سردار پٹیل شریک تھے۔ اور پاکستان کی طرف سے نواب لیاقت علی خاں اور چودھری محمد علی نمائندگی کر رہے تھے۔ چودھری محمد علی نے اپنی مذکورہ کتاب میں لکھا ہے کہ جب میٹنگ منعقد ہوئی تو لیاقت علی خاں (وزیر اعظم پاکستان) نے اپنی لمبی تقریر شروع کی۔ اس تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ جوناگڑھ نے جب پاکستان سے الحاق کر لیا تھا تو آپ نے وہاں پولیس ایکشن کیوں کیا۔ وہ یہ کہہ رہے تھے کہ انڈیا اگر کشمیر کے الحاق کو مانتا ہے تو وہ جوناگڑھ کے الحاق کو کیوں نہیں مانتا۔

چودھری محمد علی نے لکھا ہے کہ سردار پٹیل (وزیر داخلہ ہندستان) اگرچہ متعصب تھے، مگر وہ حقیقت پسند (realist) تھے۔ چنانچہ سردار پٹیل نے جوناگڑھ کی بحث کو نظر انداز کرتے ہوئے لیاقت علی خاں کی نہ ختم ہونے والی تقریر میں مداخلت کی اور کہا کہ آپ جوناگڑھ کا مقابلہ کشمیر سے کیوں کرتے ہیں۔ حیدرآباد اور کشمیر کی بات کرو اور ہم ایک تصفیہ تک پہنچ سکتے ہیں:

"Why do you compare Junagarh with Kashmir? Talk of Hyderabad and Kashmir, and we could reach an agreement". (P 300)

چودھری محمد علی کا بیان ہے کہ وزیر اعظم پاکستان لیاقت علی خاں نے سردار پٹیل کی اس پیشکش کو کوئی اہمیت نہ دی۔ انھوں نے جوناگڑھ کے بارے میں اپنی تقریر کو بدستور جاری رکھا یہاں تک کہ نئی دہلی کی اعلیٰ سطحی میٹنگ کسی فیصلے تک پہنچے بغیر ختم ہوگئی۔ پاکستان کے سابق وزیر اعظم کے مطابق، ۱۹۴۸ میں کشمیر کا مسئلہ پر امن بات چیت کے ذریعہ میز پر حل ہو رہا تھا مگر پاکستان کی قیادت کی ناقابل فہم دانشمندی کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ بدستور باقی رہا، یہاں تک کہ وہ اپنی موجودہ سنگین حالت تک پہنچ گیا — نہ ملنے والی چیز کی خاطر پاکستانی قیادت نے ملنے والی چیز کو بھی کھو دیا۔

ایسا کیوں ہوا۔ اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ برصغیر ہند کے مسلمانوں نے اپنے معاملہ کی قیادت کے لئے ایسے لوگوں پر بھروسہ کیا جو عدالتی قوانین کے تو ماہر تھے مگر وہ تاریخی قوانین کی مہارت نہ رکھتے تھے۔ یہی واحد وجہ ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان کے ساتھ اول روز ہی سے کشمیر کی صورت میں ایک ایسا المیہ شامل ہو گیا جس نے خود پاکستان کی نفی کر دی، پاکستان کا خواب منتشر ہو کر رہ گیا۔

پاکستان کی تعمیر

پاکستانی تحریک کے قائد اعلیٰ مسٹر محمد علی جناح بظاہر ایک سیکولر آدمی تھے۔ مگر انھوں نے پاکستان کی تحریک کو اسلام کے نعروں کی بنیاد پر چلایا تھا۔ اس سلسلہ میں یہاں ایک دلچسپ حوالہ (مطبوعہ میثاق ستمبر ۲۰۰۰، صفحہ ۵۱) قابل ذکر ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے ۱۹۴۶ میں برٹش پارلیامنٹ کا ایک وفد انڈیا آیا۔ اس وفد میں برٹش پارلیامنٹ کے دس ممبران شامل تھے۔ اس وفد کے لیڈر مسٹر رابرٹ رچرڈ (Robert Richard) تھے۔ اس وفد کے ایک ممبر مسٹر سورنسن (Sorenson) نے واپسی کے بعد ایک کتاب بھی لکھی جس کا نام تھا: انڈیا کے بارے میں میرا تاثر (My Impression in India)۔ اس کے مصنف نے لکھا تھا کہ ۱۰ جنوری ۱۹۴۶ کو میری ملاقات محمد علی جناح سے ہوئی۔ جناح صاحب کے بارے میں برٹش مصنف لکھتا ہے کہ وہ اسلام کی ایک تلوار ہیں جو کہ سیکولرزم کی میان میں رکھی ہوئی ہے:

"He is a sword of Islam resting in a secular scabbard sheath"

مسٹر محمد علی جناح نے ۱۹۳۴ میں مسلم لیگ کی قیادت سنبھالی۔ انھوں نے پاکستان بننے تک اپنی پوری تحریک اسلام کے نام پر چلائی مگر جب پاکستان بن گیا اور وہ اس کے پہلے گورنر جنرل مقرر ہوئے تو انھوں نے ۱۱ر اگست ۱۹۴۷ کو پاکستان کی اسمبلی (کراچی) میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کا ریاستی نظام سیکولرزم کی بنیاد پر قائم ہوگا (نہ کہ اسلام کی بنیاد پر)۔ انھوں نے اپنی اس تقریر میں واضح طور پر کہا کہ پاکستان کی اس ریاست میں یہاں کے شہری کی حیثیت سے آپ اپنے مندر میں جانے کے لئے آزاد ہیں، آپ اپنی مسجد میں جانے کے لئے آزاد ہیں یا کسی اور عبادت گاہ میں۔ آپ پائیں گے کہ وقت گزرنے پر ہندو ہندو نہ رہیں گے اور مسلم مسلم نہ رہیں گے، مذہبی مفہوم میں نہیں، کیوں کہ وہ ہر فرد کے ذاتی عقیدہ کی بات ہے، بلکہ سیاسی مفہوم میں:

You are free to go to your temples, you are free to go to your mosques or to any other places of worship in this state of Pakistan........and you will find that in course of time Hindus would cease to be Hindus and Muslims would cease to be Muslims, not in

the religious sense , because that is the personal faith of each individual, but in the political sense as citizens of the state.

مسٹر محمد علی جناح کے عام نظریات سے مجھے اتفاق نہیں۔ ان کی ٹینشن تھیوری، ان کا تقسیم ملک کا نظریہ، ان کا یہ کہنا کہ اگر ہم پاکستان کے لئے اپنی جدو جہد میں کامیاب نہ ہوئے تو خود مسلمان اور اسلام کا نشان انڈیا سے مٹا دیا جائے گا:

If we do not succeed in our struggle for Pakistan the very trace of Muslims and Islam will be obliterated from the face of India.

یہ سب باتیں ایسی ہیں جن سے مجھے ایک فی صد بھی اتفاق نہیں۔ لیکن ۱۱/اگست ۱۹۴۷ کو پاکستان کی قومی اسمبلی میں انھوں نے جو تقریر کی اس سے مجھے بنیادی طور پر اتفاق ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام کے نعرہ پر ایک خطۂ زمین حاصل کرنے سے وہاں اسلام قائم نہیں ہوسکتا۔ اس قسم کا نظریہ کسی شاعر یا ادیب کے ذہن میں جگہ پا سکتا ہے، مگر حقیقت کی دنیا میں وہ کبھی واقعہ نہیں بن سکتا۔ اسلام ایک اسلامی معاشرہ میں قائم ہوتا ہے، نہ کہ اسلامی نعرہ پر حاصل کئے ہوئے کسی خطۂ زمین میں۔

پاکستان بننے کے بعد جو صورت حال تھی وہ یہ تھی کہ وہاں کا معاشرہ اسلامی ریاست کے اعتبار سے کوئی تیار معاشرہ (prepared society) نہ تھا۔ اس لئے اسلامی ریاست کے قیام سے پہلے یہ ضروری تھا کہ وہاں بسنے والے لوگوں میں اسلام کی حقیقی اسپرٹ کو جگایا جائے۔ ان کے اندر اسلامی احکام کی قبولیت کا مادہ پیدا کیا جائے۔ اس کے بغیر اسلامی ریاست کا قیام سرے سے ممکن ہی نہیں، نہ پاکستان میں اور نہ کسی غیر پاکستان میں۔ مزید یہ کہ فرد اور معاشرہ کی تیاری دعوت اور اصلاح جیسے پرامن ذرائع سے ہوتی ہے، نہ کہ حکومت اور قانون کے زور پر۔

ایسی حالت میں پاکستان میں صحیح طریق کار وہی تھا جس کا اشارہ مسٹر محمد علی جناح کی تقریر (۱۱/اگست ۱۹۴۷) میں ملتا ہے۔ میرے نزدیک وہ طریقِ کار یہ تھا کہ حکومت کے نظام کو سیکولرزم کی بنیاد پر قائم رکھا جائے، نظری اور اعتقادی طور پر نہیں بلکہ وقتی اور عملی وقفہ کے طور پر۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سیاستِ ملکی کے مشترک معاملات تو سیکولرزم (بالفاظ دیگر دنیاوی مصالح) کی بنیاد پر ہوں اور جہاں

تک مذہب کا تعلق ہے، لوگوں کو پوری آزادی دے دی جائے کہ وہ اپنے عقیدہ کے مطابق غیر سیاسی دائرہ میں اپنی زندگی کی تعمیر کریں۔

سیکولرزم دراصل وقتی صورت حال اور ابدی تقاضے کے درمیان ہم آہنگی (اڈجسٹمنٹ) قائم کرنے کا دوسرا نام ہے۔ سیکولرزم نہ مذہب کی طرح مقدس ہے اور نہ کوئی کامل نظریہ۔ وہ صرف ایک مصالحانہ اسکیم ہے۔ اس کا مدعا صرف یہ ہے کہ جو معاشرہ ابھی اس کے لئے تیار نہ ہو کہ مذہب کے اصولوں پر اس کی ریاست کا نظام بنایا جائے وہاں ریاستی معاملات کو، غیر اختلافی قسم کے دنیاوی امور کو سیکولرزم کی بنیاد پر چلایا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ وقت آجائے کہ معاشرہ میں یہ مادۂ قبولیت پیدا ہو جائے کہ وہ مذہب پر مبنی اجتماعی نظام کا تحمل کر سکے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے مکہ اور مدینہ میں عین اسی حکمت کو اختیار فرمایا تھا، یعنی صورت موجودہ کو قبول کرتے ہوئے دونوں کے اندر اجتماعی احکام کے حق میں آمادگی پیدا کرنا اور پھر اس کے بعد ان پر اسلامی احکام کو نافذ کرنا۔ اس پیغمبرانہ حکمت کو حضرت عائشہ کی ایک روایت میں دیکھا جا سکتا ہے جس کو البخاری نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے (صحیح البخاری، کتاب الفضائل، باب تالیف القرآن)

مسٹر محمد علی جناح کے مذکورہ سیکولر اصول کو اگر پاکستان میں اختیار کر لیا جاتا تو اس کے زبردست فائدے حاصل ہوتے۔ اس کے بعد یہ ہوتا کہ پاکستان کا حکمراں طبقہ ملک کو سیاسی اور اقتصادی اور انتظامی اعتبار سے مستحکم کرنے میں لگ جاتا۔ اور دوسری طرف وہاں کا مذہبی طبقہ یکسوئی کے ساتھ اس جدوجہد میں مشغول ہو جاتا کہ قوم کو مذہبی، اخلاقی، تعلیمی اور معاشرتی اعتبار سے ترقی دے اور اس کو حقیقی معنوں میں ایک صالح معاشرہ بنائے۔ یہ گویا حالات کے اعتبار سے ایک قسم کا تقسیم عمل ہوتا جو آخر کار اس نوبت کو پہنچتا کہ دونوں طبقوں کے درمیان امتزاج پیدا ہو جائے اور دونوں ہم آہنگ ہو کر پاکستان میں ہمہ گیر معنوں میں دور جدید کا اسلامی نظام بنا سکیں۔

اسلام پسند طبقہ

اس کے بعد پاکستان میں دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ یہ دوران لوگوں نے شروع کیا جو عام

طور پر اسلام پسند کہے جاتے ہیں۔ اس گروہ کے رہنماؤں میں بہت سے علماء اور دانشوروں کے نام ہیں۔ مگر ہم موجودہ بحث میں علامتی طور پر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو شمار کریں گے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی پاکستان کے قیام کی تحریک میں براہ راست طور پر شریک نہ تھے۔ تاہم جب پاکستان وجود میں آ گیا تو ان کو نظر آیا کہ یہ ایک ایسا ملک ہے جہاں وہ اپنے سیاسی نظریہ کو واقعہ بنا سکتے ہیں۔ انھوں نے پاکستان کو اسلامی ریاست میں تبدیل کرنے کے لئے ایک سادہ فارمولا وضع کیا— پاکستان اسلام کے نام پر بنا، پاکستان اسلام کے نام الاٹ ہو چکا ہے، اس لئے پاکستان میں اسلامی حکومت کے سوا اور کوئی حکومت نہیں بن سکتی۔

اب انھوں نے پاکستان میں ایک پرشور تحریک شروع کردی۔ غلاف کعبہ اور شوکت اسلام جیسے عنوانات پر جلوس نکال کر انھوں نے عوام کو موبلائز کرنا چاہا۔ انھوں نے تحریک قادیانیت اور تحریک جمہوری کے ذریعہ پاکستان کے سیکولر حکمرانوں کو زیر کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح بہت سے سیاسی اور جذباتی ہنگاموں کے ذریعہ انھوں نے چاہا کہ سیکولر حکمرانوں کو بے دخل کر کے اپنی پسند کی حکومت ملک میں قائم کریں۔ انھوں نے کئی بار ملک کے انتخابات میں بھی حصہ لیا یہاں تک کہ اپنے مفروضہ دشمن ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دلانے میں بھی وہ بالواسطہ طور پر شریک ہو گئے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کے اسلام پسند گروپ کی اس اکھیڑ پچھاڑ کا یہ منفی نتیجہ تو ہوا کہ پاکستان میں تمام سماجی روایتیں ٹوٹ گئیں۔ مسلمان دو طبقوں (حکمراں اور غیر حکمراں) میں بٹ کر ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار ہو گئے۔ سیاسی ہنگامہ آرائیوں کی بنا پر وہ تعمیری کام درہم برہم ہو گیا جسے مذہب اور اخلاق اور تعلیم اور اصلاح معاشرہ کے میدان میں انجام پانا تھا۔

تمام ہنگامہ آرائیوں کے باوجود اس اسلام پسند گروہ کے لئے یہ تو ممکن نہ ہو سکا کہ وہ اپنے الفاظ میں ''اقتدار کی کنجیوں'' پر خود قبضہ حاصل کر لے، البتہ بعض اتفاقات کے نتیجہ میں اس کو یہ خوش قسمتی حاصل ہوئی کہ ان کی پسند کا ایک شخص اقتدار پر قابض ہو جائے۔ یہ جنرل ضیاء الحق تھے جن کو پاکستان کے اسلام پسند گروہ کی نیز برصغیر کے مذہبی طبقہ بلکہ شاید پوری مسلم دنیا کی عمومی حمایت حاصل ہو گئی۔

جنرل ضیاء الحق اس اعلان کے ساتھ اقتدار میں آئے تھے کہ وہ پاکستان میں اسلامی نظام قائم کریں گے۔ خوش قسمتی سے انھیں گیارہ سال تک پاکستان میں مکمل اقتدار حاصل رہا مگر وہ ایسا نہ کر سکے کہ پاکستان میں اپنے دعوے کے مطابق اسلامی نظام قائم کر دیں۔

کئی سال کے انتظار کے بعد پاکستان کے علماء اور اسلام پسند لوگوں کا ایک وفد جنرل ضیاء الحق سے ملا اور ان کا وعدہ یاد دلاتے ہوئے ان سے کہا کہ آپ فوراً پاکستان میں اسلامی نظام قائم کر کے اپنا وعدہ پورا کریں۔ جنرل ضیاء الحق نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا کہ میں پاکستان میں اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے تیار ہوں البتہ مجھے اس کام کے لئے دو سو قابل اعتماد افسروں کی ضرورت ہے، آپ لوگ مجھے ایسے دو سو افراد دے دیں جن کے اخلاص و دیانت پر مکمل اعتماد کیا جا سکتا ہو تو میں فوراً اس کی کارروائی شروع کر دوں گا۔ مذکورہ اسلامی وفد نے جواب دیا کہ ایسے دو سو افراد تو ہمارے پاس بھی نہیں۔ اس کے بعد ایک مسکراہٹ کے ساتھ مجلس برخاست ہو گئی۔

اس واقعہ پر مجھے ایک پٹھان کا لطیفہ یاد آتا ہے۔ اس پٹھان نے ایک ''کافر'' کو پکڑا اور اس کو پٹخ کر اس کے سینہ پر چڑھ گیا اور چھرا نکال کر بولا کلمہ پڑھ، ورنہ میں تجھ کو مار ڈالوں گا۔ کافر بے چارا گھبرا گیا۔ اس نے کہا کہ ٹھیک ہے، تم کہتے ہو تو میں کلمہ پڑھ دوں گا۔ اب بتاؤ کہ کلمہ کیا ہے۔ پٹھان نے جواب دیا کہ وہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔

پاکستان کے نام نہاد اسلام پسند طبقہ نے اسی قسم کا ایک مضحکہ خیز کام زیادہ بڑے پیمانہ پر انجام دیا۔ انھوں نے پاکستان میں ''اسلامی نظام قائم کرو'' کا نعرہ لے کر سارے ملک میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ انھوں نے اپنے اس پر جوش عمل کے دوران تمام سماجی روایات کو توڑ ڈالا، انھوں نے اس ہنگامہ آرائی کے ذریعہ ملک کے امن کو درہم برہم کر دیا، اور جب سب کچھ تباہ ہو چکا تو آخر میں یہ معلوم ہوا کہ پاکستان کا معاشرہ اسلامی نظام کو قبول کرنے کے لئے تیار ہی نہیں۔ یہاں کے افراد میں حقیقی اسلامی اسپرٹ موجود نہیں، یہاں کے مختلف گروہوں میں اتحاد کا مزاج نہیں، یہاں کے لوگوں میں یہ حوصلہ نہیں کہ وہ ذاتی مفاد پر ملی مفاد کو ترجیح دیں، یہاں کے لوگوں میں یہ شعور نہیں کہ وہ حقیقی رہنما اور

استحصالی رہنما کے فرق کو سمجھیں، یہاں تک کہ اس وسیع ملک میں چند سو ایسے دیانت دار افراد بھی نہیں جن کے ہاتھ میں پر اعتماد طور پر حکومت کا انتظام سونپا جاسکے۔ چنانچہ اسلام کے نام پر چلنے والی اس پُرشور تحریک نے پاکستان میں اسلام کے مواقع کو برباد تو ضرور کیا مگر وہاں اسلام کے مواقع پیدا کرنے کے معاملہ میں وہ مجرمانہ حد تک ناکام رہے۔

مثبت نشانہ کی ضرورت

پاکستان کو اپنے قیام کے بعد کوئی مثبت نشانہ نہیں ملا۔ اس محرومی کا سب سے بڑا سبب پاکستانیوں کی انتقامی نفسیات ہے۔ پاکستان کے لوگ ''بھارت'' کے خلاف انتقام کی نفسیات میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ پاکستان کی تمام مجالس، پاکستان کا پورا میڈیا حتیٰ کہ وہاں کی درسیات، براہ راست یا بالواسطہ طور پر سب اسی منفی جذبہ کا مظہر ہیں۔ اس سلسلہ میں یہاں ایک پاکستانی حوالہ نقل کیا جاتا ہے۔ ایک پاکستانی بزرگ لکھتے ہیں: ''ہندوؤں کے تعصب کا اندازہ کرنے کے لئے آپ ذرا یاد کیجئے۔ ۱۹۷۱ء میں جب سقوط ڈھاکہ ہوا ہے تو موتی لال نہرو کی پوتی، جواہر لال نہرو کی بیٹی اندرا گاندھی کہہ رہی ہے کہ:

We have avenged our thousand years defeat.

> ''ہم نے اپنی ہزار سالہ شکست کا بدلہ چکا دیا''۔ اس سے ذرا اندازہ کریں کہ ہندو مہا سبھا کے عزائم کیا ہوں گے، آر ایس ایس کے عزائم کیا ہوں گے۔ اور کانگریس کے اندر بھی جو ذرا کٹّر قسم کے ہندو تھے، مثلاً سردار ولبھ بھائی پٹیل وغیرہ، ان کے عزائم کیا ہوں گے''۔ (ماہانہ میثاق، لاہور، ستمبر ۲۰۰۰، صفحہ ۴۰)

پاکستان کے بارے میں یہ مقولہ پوری طرح صادق آتا ہے کہ: ''میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی''۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستانی تحریک کا آغاز اول دن سے منفی ذہن کے تحت ہوا، یعنی ہندوؤں کے مفروضہ خطرہ سے بچاؤ کرنا۔ پاکستان بننے کے بعد یہ ذہن مزید شدت کے ساتھ ابھر آیا۔ اب پاکستان کے تمام لکھنے اور بولنے والے لوگوں کا یہ نظریہ ہوگیا کہ پاکستانیوں کے اندر جتنا زیادہ

بھارت مخالف جذبہ ابھارا جائے گا اتنا ہی زیادہ پاکستان کی بنیاد مستحکم ہوگی۔ یہ منفی اور غیر واقعی نظریہ پاکستان کی تعمیر کے لئے ہلاکت خیز حد تک مضر ثابت ہوا، کیوں کہ کسی قوم کی تعمیر ہمیشہ مثبت تصور پر ہوتی ہے نہ کہ منفی تصور پر۔

انڈیا کی سابق وزیر اعظم اندرا گاندھی کی طرف مذکورہ قول کی نسبت اگر بالفرض درست ہو تب بھی میں کہوں گا کہ پاکستان کے علماء اور دانشور مثبت طرز فکر سے آشنا ہوتے تو وہ اندرا گاندھی یا دوسرے ہندو لیڈروں کے ان اقوال میں پاکستان کے لئے ایک عظیم امکان کو دریافت کر لیتے۔

میں ذاتی طور پر ہندوؤں کو اسلام کا یا پاکستان کا دشمن نہیں سمجھتا۔ تاہم جو لوگ ہندوؤں کو اسلام یا پاکستان کا دشمن سمجھتے ہیں ان کو تاریخ کے ایک عالمی قانون سے بے خبر نہ ہونا چاہئے۔ وہ یہ کہ دشمن جب یہ سمجھ لے کہ اس نے اپنے حریف سے انتقام لے لیا تو یہ بہترین وقت ہے کہ دشمن کے ساتھ مثبت معاملہ کر کے اس کو اپنا دوست بنا لیا جائے۔ انتقامی نفسیات سے خالی ہونے کے بعد ہر مسٹر دشمن مسٹر نارمل بن جاتا ہے، اور جب کوئی فرد یا قوم اس طرح اعتدال کی سطح پر آجائے تو یہ موزوں ترین وقت ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ اور مثبت معاملہ کر کے اس کو اپنا دوست بنالیا جائے۔ یہ فطرت کا ایک قانون ہے۔ اور فطرت کے اس قانون کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **"فاذا الذی بینك و بینه عداوة کأنه ولی حمیم"** (حم السجدہ ۳۴)

فطرت کے اس انقلابی قانون کی متعدد مثالیں اسلام کی طویل تاریخ میں موجود ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ خراسان کے مسلم حکمراں خوارزم شاہ نے چنگیز خاں کے سفیر کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد چنگیز خاں کے دل میں انتقام کی زبردست آگ بھڑک اٹھی۔ اس انتقامی جوش کے تحت اس نے وحشی قبائل کے افراد پر مشتمل ایک عظیم لشکر تیار کیا اور اپنے تمام انتقامی جذبات کے ساتھ مسلم دنیا پر ٹوٹ پڑا۔ درمیان میں ایک حادثہ میں اس کی وفات ہوگئی تو اس نے اپنی اولاد کو وصیت کی کہ تم میرے عہد کو پورا کئے بغیر نہ رہنا۔ چنانچہ اس کے پوتے ہلاکو خاں کی قیادت میں تاتاریوں نے سمرقند سے لے کر حلب تک مسلم سلطنت کو تباہ و برباد کر دیا، مسجدوں کو ڈھایا، کتب خانوں کو جلایا، مسلمانوں کو

قتل کیا، مسلمانوں کے مردوں اور عورتوں کو غلام اور باندی بنالیا، وغیرہ۔

تیرہویں صدی عیسوی میں یہ حادثہ ہندو لیڈروں کے جدید واقعہ سے ہزاروں گنا زیادہ بھیانک تھا۔ مگر اس کے بعد کیا ہوا۔ انھوں نے جب مسلم دنیا کو تاراج کر دیا اور آخری عباسی خلیفہ کو اپنے گھوڑے کی ٹاپوں کے نیچے روند ڈالا تو اس کے بعد ان کا انتقامی جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ ان کے دل کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ بجھ گئی۔ اب یہی ہوا کہ ہر تاتاری جو پہلے مسٹر دشمن تھا، اب وہ مسٹر فطرت بن گیا۔

خوش قسمتی سے اس وقت کے مسلمان اس پوزیشن میں نہ تھے کہ وہ دوبارہ اپنی طرف سے مخالفانہ کارروائیاں کر کے تاتاریوں کے انتقام کو زندہ رکھیں۔ چنانچہ انتقامی جوش کے ٹھنڈا ہوتے ہی مسلمانوں اور تاتاریوں کے درمیان ایک نیا عمل شروع ہوگیا، یہ پرامن دعوت کا عمل تھا۔ مسلمان اور تاتاری جو پہلے ایک دوسرے کے حریف بنے ہوئے تھے، اب وہ ایک دوسرے کے لئے داعی اور مدعو بن گئے۔

یہ کسی سوچے سمجھے فیصلہ کے تحت نہ تھا۔ مگر جب وہاں عملاً ایسی صورت حال قائم ہوگئی تو خود فطری قانون کے تحت اس کے مثبت نتائج ظاہر ہونا شروع ہوئے۔ اسلام کی فطری تعلیمات تاتاریوں کو مسخر کرنے لگیں۔ یہاں تک کہ نصف صدی کے اندر یہ معجزہ پیش آیا کہ تاتاریوں کی اکثریت اسلام کے حلقہ میں داخل ہوگئی۔ جو لوگ بظاہر اسلام کے دشمن بنے ہوئے تھے، وہ اسلام کے خادم اور سپاہی بن گئے۔ اقبال نے اپنے ایک شعر میں اسی تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے:

ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے　　پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

اقبال نے ۱۹۳۰ میں اپنے الٰہ آباد کے خطبۂ صدارت میں مسلمانوں کو جو رہنمائی دی تھی، اس کو تو میں ایک غلط رہنمائی سمجھتا ہوں، لیکن ان کے اس شعر میں اسلام کے جس تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اس میں بلاشبہہ پاکستانی مسلمانوں کے لئے صحیح ترین رہنمائی ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا، میں اس مفروضہ کو نہیں مانتا کہ ہندو اسلام کا یا مسلمانوں کا دشمن ہے۔ تاہم بالفرض اگر وہ دشمن ہو تب بھی اپنے انتقامی جذبات کی تسکین حاصل کر لینے کے بعد ہندو

پاکستانی مسلمانوں کے لئے بہترین مدعو کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ اگر پاکستانی مسلمان یہ کریں کہ وہ اپنی تمام سیاسی اور غیر سیاسی شکایتوں کو بھلا کر اپنے سینے کو ہندو نفرت سے پاک کر لیں اور پاکستان کا میڈیا بھارت مخالف پروپیگنڈہ کو یکسر ختم کر دے۔ حتیٰ کہ بھارت کے مخالفِ پاکستان پروپیگنڈے کا جواب بھی ''ادفع بالتی ھی أحسن'' (المومنون ۹۶) کے اصول پر مثبت انداز میں دے۔ وہ ماضی کی تلخیوں کو بھلا کر بھارت کے ساتھ اپنی تمام خارجہ پالیسیوں میں یک طرفہ طور پر اعتدال کا انداز اختیار کر لے۔

اسی کے ساتھ دوسرا عمل یہ کیا جائے کہ ہندستان اور پاکستان کی سرحدوں کو اسی طرح آزادانہ طور پر کھول دیا جائے جس طرح عرب ملکوں کی سرحدیں یا یورپی ملکوں کی سرحدیں عملاً کھلی ہوئی ہیں۔ اس کے بعد فطری طور پر یہ ہوگا کہ دونوں ملکوں کے لوگوں میں بڑے پیمانہ پر آزادانہ اختلاط ہو جائے گا۔ دونوں کے درمیان اخبارات، رسالے اور کتابیں آنے جانے لگیں گی۔ دونوں کے درمیان بڑے پیمانہ پر اجتماعات منعقد کئے جانے لگیں گے۔ دونوں کے درمیان ایک دوسرے کو از سر نو سمجھنے اور جاننے کا سلسلہ شروع ہو جائے گا اور معتدل ماحول میں اسی قسم کے عمل کا نام دعوتی عمل ہے۔ اور تاریخ بتاتی ہے کہ جب بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان معتدل حالات میں دعوتی عمل جاری ہوا تو اس کا عملی نتیجہ ہمیشہ اسلام کے حق میں نکلا۔ اور بھارت بہر حال اس عام تاریخی قانون سے مستثنیٰ نہیں۔

مثبت فکر کی ضرورت

موجودہ زمانہ میں ہندستان میں اور مسلم ملکوں میں بے شمار ہنگاموں کے باوجود کوئی حقیقی ترقی نہ ہو سکی۔ اس کا واحد سبب یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے یہ ''انقلابی'' رہنما مثبت فکر سے کم و بیش خالی تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے اپنی قوموں کو منفی رہنمائی دی۔ ان کی اپنی فکر ردّ عمل کے تحت بنی اور اسی پر انھوں نے اپنی قوموں کو دوڑا دیا۔

برصغیر ہند میں رہنمائی کے اعتبار سے سب سے بڑا نام مہاتما گاندھی کا ہے۔ انھوں نے

اپنے بارہ میں لکھا ہے کہ قانون کی ڈگری لینے کے بعد میں ساؤتھ افریقہ گیا تاکہ وہاں پیسہ کماؤں (to make some money)۔ اُس وقت وہاں سفید فام انگریزوں کی حکومت تھی۔

ساؤتھ افریقہ میں گاندھی کے ساتھ یہ واقعہ ہوا کہ ایک بار وہ ٹرین کے فرسٹ کلاس میں سفر کر رہے تھے۔ سفید فام گارڈ چیکنگ کے لئے آیا تو اس کو ناپسند ہوا کہ ایک بلیک آدمی فرسٹ کلاس میں سفر کرے۔ اس نے گاندھی کو کمپارٹمنٹ سے نکال کر باہر کر دیا۔ گاندھی خود کہتے ہیں کہ اس واقعہ نے میری زندگی کا رخ بدل دیا:

This experience changed the course of my life.

ٹھیک یہی معاملہ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں کے ساتھ پیش آیا ہے۔ سید جمال الدین افغانی، حسن البنا، سید قطب، آیت اللہ خمینی، سید ابوالاعلیٰ مودودی، وغیرہ ہر ایک کی یہی کہانی ہے۔ یہ دراصل مغربی استعمار کا مسلم دنیا پر حملہ تھا جس کے براہ راست یا بالواسطہ تجربہ نے موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں کی زندگی کا کورس متعین کیا۔ ان میں سے شاید کوئی بھی نہیں جس کا فکر حقائق کے مطالعہ سے بنا ہو۔ ہر ایک کا معاملہ یہ تھا کہ اس کا فکر اصلاً مغربی استعمار کے زیر اثر بنا۔ اور جب ان کے ذہن کا ایک خاص سانچہ بن گیا تو قرآن اور حدیث کی باتیں بھی ان کے ذہن میں اسی فکری سانچہ کے مطابق ڈھلتی چلی گئیں۔

مہاتما گاندھی کا اینٹی برٹش ذہن ساؤتھ افریقہ کے مذکورہ واقعہ سے بنا تھا۔ اور اسی کے زیرِ اثر انھوں نے ہندستان میں اپنی سیاسی تحریک چلائی۔ مگر اس کو مذہبی رنگ دینے کے لئے انھوں نے کہا کہ بھاگوت گیتا میرا فکری ماخذ (intellectual mother) ہے۔ ٹھیک یہی معاملہ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں کا ہوا۔ ان کا ''انقلابی'' ذہن اصلاً مغربی استعمار کے خلاف غم وغصہ کے تحت بنا تھا۔ مگر اس کے بعد انھوں نے کچھ آیتوں اور حدیثوں کی سیاسی تفسیر کرکے اپنے اس فکر کو اسلامائز کر لیا۔

منفی سوچ اور مثبت سوچ میں کیا فرق ہے۔ دونوں کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ منفی سوچ والا آدمی شعوری یا غیر شعوری طور پر اس واحد تجربہ کی روشنی میں سوچتا ہے، جو اس پر شخصی یا قومی اعتبار سے گزرا۔ یہ تجربہ عام طور پر کسی نہ کسی شکایت (grievance) یا محرومی کی بنیاد پر ہوتا

ہے۔اس لئے منفی سوچ والے آدمی کی ساری فکر اسی شکایت یا محرومی کے واقعہ پر مرتکز ہو جاتی ہے۔ وہ صرف یہ سوچتا ہے کہ مجھ سے کیا چھینا گیا ہے، وہ اس سے بے خبر رہتا ہے کہ چھننے کے بعد بھی اس کو کیا کچھ حاصل ہے۔قرآن کے لفظوں میں، وہ صرف اپنے عسر کو جانتا ہے، وہ اپنے یسر سے بالکل بے خبر رہتا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ منفی سوچ والے آدمی کی ساری مہم خارج رخی ہو جاتی ہے۔وہ کسی خارجی طاقت کو تمام مسائل ومصائب کا ذمہ دار سمجھ لیتا ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی ساری کوشش، قرآن کے لفظوں میں، حبط اعمال کا شکار ہو جاتی ہے۔اس دنیا میں نتیجہ خیز عمل صرف وہ ہے جو داخل رخی ہو۔اسی کو ایک حدیث میں قلب پر مبنی عمل کہا گیا ہے۔

مثبت طرز فکر کی کامیابی کی مثال میرے ایک عزیز کی زندگی میں ملتی ہے۔چند سال پہلے ان کے ایک تجارتی پارٹنر نے ان کو لاکھوں روپئے کا نقصان پہنچایا۔اس کے بعد اگر ان کے اندر منفی سوچ جاگتی تو وہ مذکورہ شخص کے خلاف مقدمہ بازی میں لگ جاتے یا اس کو جوابی نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے۔ان کی اس قسم کی کوشش ان کو کوئی مفید نتیجہ تو نہ دیتی، البتہ وہ ان کے نقصان میں مزید اضافہ کا سبب بن جاتی۔مگر انھوں نے مذکورہ معاملہ کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے باقی ماندہ وسائل کے استعمال پر اپنی ساری توجہ لگا دی۔اس کا انجام یہ ہوا کہ ماشاءاللہ آج وہ پہلے سے بھی زیادہ بہتر اقتصادی حالت میں ہیں۔یہ انفرادی سطح پر مثبت سوچ کی ایک مثال ہے۔

قومی سطح پر موجودہ زمانہ میں مثبت سوچ کی ایک مثال یہ ہے کہ دوسری عالمی جنگ کے زمانہ میں امریکا نے جاپان کے اوپر ایٹم بم گرایا۔اس کے نتیجہ میں اس کی صنعتی طاقت تباہ ہوگئی۔اب جاپانیوں کے اندر سخت قسم کا انتقامی ذہن ابھرا، انھوں نے کہا کہ ہم امریکا سے بدلہ لیں گے۔مگر جاپان کے مدبرین نے اپنی قوم کو یہ کہہ کر ٹھنڈا کر دیا کہ امریکا نے اگر ۱۹۴۵ میں ہمارے ہیروشیما پر بم گرا کر اس کو تباہ کیا ہے تو اس سے پہلے ہم بھی ۱۹۴۱ میں ان کے پرل ہاربر کو بم باری کر کے تباہ کر چکے تھے۔اس لئے معاملہ برابر ہو گیا۔اب تم لوگ نئے مستقبل کی تعمیر میں لگ جاؤ۔اسی مثبت سوچ کا یہ نتیجہ ہے کہ

۱۹۴۵ میں تباہ شدہ جاپان آج اقتصادی سپر پاور کے روپ میں ابھرا ہے۔

اس کے برعکس مثال پاکستان کی ہے۔ ۱۹۷۱ میں پاکستان سے ٹوٹ کر بنگلہ دیش بنا۔ اس عمل میں ہندستان نے بنگلہ دیش کی علیٰحدگی کی تحریک کا ساتھ دیا۔ اس واقعہ کے بعد پاکستانی لوگ ہندستان سے سخت برہم ہوگئے۔ انھوں نے ہندستان کے خلاف نفرت اور تشدد کی جنگ چھیڑ دی۔ اس انتقامی کارروائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود پاکستان ایک تباہ شدہ ملک بن گیا۔ اس کے برعکس اگر پاکستان کے رہنما اپنی قوم کو یہ سبق دیتے کہ ہندستان نے اگر ۱۹۷۱ میں ہمارے ملک کو دو ٹکڑے کیا ہے تو ہم بھی اس سے پہلے ۱۹۴۷ میں ان کے ملک کے دو ٹکڑے کر چکے تھے، اس لئے معاملہ برابر ہو گیا۔ اب تم لوگ نئے مستقبل کی تعمیر میں لگ جاؤ۔ پاکستان کے رہنما اگر اپنی قوم کو اس قسم کی مثبت رہنمائی دیتے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ آج پاکستان پورے ویسٹ ایشیا کا سب سے زیادہ اہم ملک ہوتا۔

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں میں مغربی استعمار کی بنا پر جو منفی سوچ آئی اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ انھوں نے ایک ''عسر'' کے غم میں بہت بڑے ''یسر'' کو کھو دیا، اور اس کی سادہ سی وجہ یہ تھی کہ منفی فکر کے غلبہ (obsession) کی بنا پر وہ اس ''یسر'' سے واقف ہی نہ ہو سکے۔ یہ واقعہ ہے کہ مغربی استعمار نے موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے لئے کچھ سیاسی اور تہذیبی مسئلے پیدا کئے مگر اس سے بھی زیادہ بڑا واقعہ یہ تھا کہ انھیں مغربی قوموں نے دنیا میں وہ جدید انقلاب برپا کیا جس نے مسلمانوں کے لئے اعلیٰ ترین دعوتی مواقع کھول دئے، ایسے مواقع جو اس سے پہلے کبھی تاریخ میں موجود نہ تھے۔

مذہبی آزادی، کمیونی کیشن کے وسیع ذرائع، کھلے مطالعہ کا رجحان، بہت بڑے پیمانہ پر انسانوں کا اختلاط، قرآن کی تائید کرنے والی سائنسی دریافتیں، تلاش وجستجو کا عمومی ذہن، اقتصادی وسائل کی فراوانی، وغیرہ اس قسم کی بہت سی چیزیں ہیں جنھوں نے ہمارے لئے یہ امکان پیدا کر دیا تھا کہ ہم نئی طاقت اور نئی وسعت کے ساتھ اسلام کی اشاعت عالمی سطح پر کر سکیں، مگر اپنے منفی ذہن کی بنا پر تمام رہنما مفروضہ سازشوں اور مفروضہ دشمنوں کے خلاف جنگ لڑتے رہے۔ کوئی لفظی جنگ کرتا رہا، کوئی سیاسی

جنگ اور کوئی متشددانہ جنگ۔ تمام لوگ بس اسی قسم کی بے نتیجہ سرگرمیوں میں مشغول رہے۔ اور جدید مواقع کو اسلامی دعوت کے لئے استعمال کرنے کا کام انجام نہ پاسکا۔

پازیٹیو تھنکنگ کا معاملہ کوئی سادہ معاملہ نہیں۔ اس کا تعلق تمام انسانی خوبیوں سے ہے۔ اس سے صحت فکر پیدا ہوتی ہے۔ اس سے ذہنی ارتقاء ہوتا ہے۔ وہ صحیح منصوبہ بندی میں مددگار ہے۔ پازیٹیو تھنکنگ آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ اپنی محرومی کو یافت میں تبدیل کر سکے۔ وہ اپنے مائنس کو اپنے لئے پلس بنالے۔

تعمیرِ ہند

ایک علمی اور تاریخی جائزہ

تاریخ کو انتظار ہے

ہندوؤں کا ایک طبقہ ہندستانی مسلمانوں کو ملک کے لئے اثاثہ (asset) کے روپ میں نہیں دیکھ پاتا۔ اس کے بجائے وہ ان کو ایک بوجھ (liability) کے روپ میں دیکھتا ہے۔ یہ نظریہ قانون فطرت کے خلاف ہے۔ یہ کسی اقلیت کے اس فطری کردار کی نفی ہے جو اس کے لئے فطرت کے اٹل قانون کے تحت مقدر ہے۔

انگریز مؤرخ آرنلڈ ٹوائن بی نے اپنی مشہور کتاب اسٹڈی آف ہسٹری میں تاریخی شواہد کے ساتھ بتایا ہے کہ یہ اقلیتیں ہی ہیں جو ہمیشہ کسی ملک میں کوئی انقلابی کردار ادا کرتی ہیں۔ اور ہندستان کی مسلم اقلیت بلاشبہ اس معاملہ میں کوئی استثناء نہیں۔

امام النسائی کی روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی ایک پیشین گوئی میں فرمایا کہ میری امت کے دو گروہ ایسے ہیں جن کو اللہ نے آگ کے عذاب سے محفوظ کر دیا ہے۔ ایک گروہ وہ جو ہند میں غزوہ کرے گا۔ اور دوسرا گروہ وہ جو عیسیٰ بن مریم کے ساتھ ہوگا: **عصابتان من امتی احرزهما الله من النار: عصابة تغزو الهند وعصابة تكون مع عيسىٰ ابن مريم۔ (جامع الاصول فی احادیث الرسول، جلد ۹، صفحہ ۲۰۲)۔**

میرے نزدیک اس حدیث میں یہ پیشین گوئی کی گئی ہے کہ ایک زمانہ آئے گا جب کہ ہندستان کے مسلمان اس ملک میں ایک اہم تعمیری کردار ادا کریں گے۔ وہ اس ملک کو حقیقی عظمت اور ترقی کا مقام دلانے کا ذریعہ ثابت ہوں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ وقت اب آخری طور پر آ گیا ہے۔

اس پیغمبرانہ پیشین گوئی کی تکمیل کے لئے ہندستانی مسلمانوں کو کیا کرنا ہے۔ انھیں صرف یہ کرنا ہے کہ وہ اس ملک میں احتجاجی گروہ کے طور پر رہنے کا انداز چھوڑیں اور تخلیقی گروہ (creative group) بن کر رہنا سیکھیں۔ وہ لینے والے گروہ نہ رہیں بلکہ وہ اس ملک میں دینے والے گروہ بن جائیں۔ اور یہی اسلام کا تقاضا ہے۔ اس کے بعد ملک میں ایک نیا دور آ جائے گا، جب کہ ہندستان

ایک ترقی یافتہ ملک کے روپ میں ابھرے گا اور دنیا کے نقشہ میں اپنا وہ مقام حاصل کرلے گا جو اس کے لئے مقدر ہے۔

سوامی وویکا نند نے ۱۸۹۸ میں کہا تھا کہ مستقبل کا ہندستان ایک پر عظمت ہندستان (glorious India) ہوگا اور اس پر عظمت ہندستان کی تعمیر ہندو اور مسلمان دونوں مل کر کریں گے۔ یہ بات بلاشبہہ درست ہے مگر ہندو اور مسلمان دونوں کو یہ تاریخی کردار ادا کرنے کے لئے اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کرنا ہوگا۔ ضروری اہلیت کے بغیر دونوں میں سے کسی کے لئے بھی اس تاریخی کردار کو انجام دینا ممکن نہیں۔

ہندوؤں میں سے کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ملک ان کے نام الاٹ کر دیا گیا ہے۔ یہ ایک خطرناک قسم کی غلط فہمی ہے۔ اس ذہن کے ساتھ ان کے لئے اپنا مطلوب کردار ادا کرنا ممکن نہیں۔ ہندو بلاشبہہ اس ملک میں اکثریتی فرقہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر ہر اکثریت آخر کار فطرت کے اٹل قانون کے تحت ہے نہ کہ اس سے آزاد۔ اس دنیا میں ہر اکثریت اسی طرح فطرت کے قانون کے تابع ہے جس طرح کوئی اقلیت۔

ہندوؤں کو یہ کرنا ہوگا کہ مسلمانوں کو وہ سادہ طور پر محض عددی تناسب کے نقطۂ نظر سے نہ دیکھیں بلکہ وہ انھیں اپنا فطری شریک کار سمجھیں۔ وہ مسلمانوں کو ہندستانی گاڑی کے دوسرے پہیہ کی حیثیت سے قبول کریں۔ اس کے بغیر ملک میں کوئی حقیقی ترقیاتی عمل شروع نہیں ہوسکتا۔

اسی طرح مسلمانوں کو بھی چاہئے کہ وہ اس حقیقت کو سمجھیں کہ مذکورہ حدیث رسول کے مطابق، اس ملک میں انھیں جو تعمیری رول ادا کرنا ہے اس کی لازمی شرط بھی یہی اہلیت ہے۔

مسلمان اس اہم کردار کی ادائیگی کے اہل صرف اس وقت بن سکتے ہیں جب کہ وہ اپنے آپ میں وہ ضروری لیاقت پیدا کریں جس کو تخلیقیت (creativity) کہا جاتا ہے۔

تخلیقی گروہ وہ ہے جو منفی طرز فکر سے پاک ہو اور معاملات کو صرف مثبت انداز سے دیکھے۔ جو دوسروں کے ساتھ تعلقات میں بلند نظری کا طریقہ اختیار کرے نہ کہ تنگ نظری کا طریقہ۔ جو اپنے

حقوق سے زیادہ اپنی ڈیوٹی پر نظر رکھتا ہو۔ جو اپنے جذبات سے زیادہ دوسروں کے جذبات کا احترام کرنا جانتا ہو۔ جو اشو اور نان اشو میں فرق کرے اور صرف ان چیزوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے جو تعمیر وترقی کے عمل کے لئے حقیقی اشو کی حیثیت رکھتی ہیں۔

تخلیقی گروہ وہ ہے جو گروہی ذہنیت سے پاک ہو اور معاملات کو انسانیت کے نقطۂ نظر سے دیکھے، جس کے دل میں دوسروں کے لئے خیر خواہی ہو نہ کہ نفرت وحقارت، جس کے تحمل کا مزاج اس کو اتنا اوپر اٹھا دے کہ وہ اشتعال انگیز چیزوں پر بھی مشتعل نہ ہو، جو اعلیٰ مقصد کے لئے جینے والا ہو نہ کہ محض ذاتی مفاد کے لئے جینے والا۔

تخلیقی گروہ وہ ہے جو اپنی اعلیٰ صفات کی بنا پر اس پوزیشن میں ہوتا ہے کہ وہ مسلسل طور پر ذہنی اور فکری ترقی کرتا رہے۔ وہ اس قابل ہو کہ مسائل کا نیا اور برتر حل دریافت کرلے۔ وہ زندگی کے ہر بند دروازہ کو کھولتا ہوا آخری منزل تک پہنچ جائے۔ کوئی بھی چیز اس کے سفر کو روکنے والی ثابت نہ ہو۔

یہی وہ صفات ہیں جن کو قرآن میں خلق عظیم (القلم ۴) کہا گیا ہے۔ یعنی بلند نظری اور بلند کرداری۔ بلند نظر اور بلند کردار لوگ ہی اس دنیا میں کوئی بڑا کام کرتے ہیں۔ اس دنیا کے لئے فطرت کا قانون یہ ہے کہ چھوٹے کردار کے لوگ چھوٹا کام انجام دیں اور بڑے کردار کے لوگ بڑا کام۔

اہل اسلام کو دین کی صورت میں جو نعمت ملی ہے وہ کسی ایک گروہ کی وراثت نہیں۔ وہ ساری انسانیت کا مشترک سرمایہ ہے۔ دوسرے انسانوں تک اس سرمایہ کو پہنچانا ایک خدائی امانت کی ادائیگی کا معاملہ ہے۔ اور صرف اسی جذبہ کے تحت اس کو صحیح طور پر انجام دیا جا سکتا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ قدیم زمانہ کا انسان ہزاروں سال تک کوئی بھی علمی یا تہذیبی یا تمدنی ترقی نہ کرسکا۔ تمام قابل ذکر ترقیاں اسلام کے ظہور کے بعد شروع ہوئیں۔

اس وقت کی دنیا مخلوقات کی پرستش میں پھنسی ہوئی تھی، اہل اسلام نے اس کو مخلوقات کی پرستش سے اوپر اٹھا کر خالق کی پرستش کا راستہ دکھایا۔ لوگ فطرت کے مظاہر کو مقدس مان کر اس کے سامنے صرف اظہار عقیدت کرنا جانتے تھے، اہل اسلام نے اس کے بجائے ان کے اوپر فطرت کی

تسخیر کا دروازہ کھولا۔ لوگ دولت اور اقتدار کو معبود کا درجہ دے کر اسی کو اپنا سب کچھ سمجھے ہوئے تھے، اہل اسلام نے دولت اور اقتدار کو ضرورت اور خدمت کے خانے میں ڈال کر انسان کو عظمت کا درجہ عطا کیا۔ لوگ اپنے مفروضہ عقائد کی بنا پر طرح طرح کے توہمات (superstitions) میں مبتلا تھے، اہل اسلام نے ان کو مفروضات اور توہمات سے نکال کر حقائق کی سطح پر سوچنے والا بنایا۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب ''اسلام دور جدید کا خالق'')

فکر انسانی میں یہ انقلاب پہلی بار اہل اسلام یا اہل توحید کے ذریعہ وقوع میں آیا۔ اس فکری انقلاب نے انسانیت کے اوپر تعمیر وترقی کا وہ دروازہ کھول دیا جو ہزاروں سال سے اس کے اوپر بند پڑا ہوا تھا۔

قدیم زمانہ کا انسان مشرکانہ افکار میں جیتا تھا۔ زندگی کا ہر شعبہ شرک کے ماتحت ہو گیا تھا۔ شرک اپنی حقیقت کے اعتبار سے توہم پرستی کا نام ہے۔ اور توہم پرستانہ مزاج، بالفاظ دیگر غیر سائنٹفک مزاج، کے ساتھ کبھی کوئی حقیقی ترقی نہیں ہوسکتی۔ اہل اسلام کی صورت میں دنیا کو پہلی بار ایک ایسا انسانی گروہ ملا جس کا فکر خالص توحید پر مبنی تھا، وہ شرک اور توہم پرستی سے پوری طرح آزاد تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کے ذریعہ دنیا کو پہلی بار حقیقت پسندی کا سبق ملا۔ لوگوں کے لئے یہ ممکن ہوا کہ وہ توہمات سے آزاد ہو کر فطری قوانین کی بنیاد پر اپنی زندگی کی تشکیل کریں۔ اسلام کا یہی وہ خاص عطیہ ہے جس نے انسانیت کی تاریخ کو ترقی کے نئے دور میں داخل کر دیا۔

ہندستان کی جدید تاریخ بھی اہل اسلام کے اسی توحیدی رول کا انتظار کر رہی ہے۔ اس ملک کی ترقی ٹھیک اسی مقام پر رکی ہوئی ہے جہاں بقیہ دنیا کی ترقی ماضی میں رکی ہوئی تھی۔ اس ملک میں ترقی کا نیا عمل عین اسی مقام سے شروع ہوگا جہاں سے وہ بقیہ دنیا میں پچھلے ہزاروں سال کے دوران شروع ہوا تھا۔ ہندستان میں بھی بقیہ دنیا کی تاریخ کا اعادہ ہونا ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی دوسری چیز اس ملک کو حقیقی ترقی کی طرف لے جانے والی نہیں۔

ہندو۔مسلم اتحاد

ہندستان کی قومی جدوجہد کے دو دور ہیں۔ پہلا دور ۱۹۴۷ سے پہلے کا ہے اور دوسرا دور ۱۹۴۷ کے بعد کا۔ پہلے دور میں سیاسی آزادی کا نشانہ تھا جو ۱۵؍اگست ۱۹۴۷ کو پورا ہوا۔ دوسرے دور میں ملک کی تعمیر نو کا نشانہ تھا جس کو سیاسی آزادی کے بعد انجام پانا تھا۔ عجیب بات ہے کہ پہلے دور کا نشانہ مکمل طور پر پورا ہوا لیکن دوسرے دور کا نشانہ اتنا زیادہ ناکام رہا کہ ۵۰ سال گزرنے کے بعد بھی اس کی منزل دکھائی نہیں دیتی۔

پہلے دور کا نشانہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ جدوجہد کے ذریعہ پورا ہوا تھا۔ اسی طرح دوسرے دور کے نشانہ کی تکمیل کے لئے بھی ضروری تھا کہ ہندو اور مسلمان مل کر اس کے لئے جدوجہد کریں۔ اس معاملہ کی اہمیت کو مہاتما گاندھی پوری طرح سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۵؍اگست ۱۹۴۷ کی رات کو تمام لیڈر دہلی میں اکٹھا ہو کر یہ انتظار کر رہے تھے کہ کب گھڑی کی سوئی ۱۲ پر پہنچے، کیونکہ ۱۲ بج کر ایک منٹ پر انگریز وائسرائے آل انڈیا ریڈیو پر ہندستان کی آزادی کا اعلان کرنے والا تھا۔ لیکن گاندھی واحد لیڈر تھے جو اس وقت دہلی میں موجود نہ تھے، وہ ہندو مسلم اتحاد کے لئے گاؤں گاؤں کا دورہ کر رہے تھے۔ گاندھی کی نظر مستقبل پر تھی، اور بقیہ لیڈروں کی نظر صرف آج پر۔

مہاتما گاندھی اس فرقہ وارانہ اتحاد کو اتنا زیادہ اہمیت دیتے تھے کہ لوئی فشر کے بیان کے مطابق، انھوں نے اعلان کیا کہ —— ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو یہ سیکھنا ہوگا کہ وہ کس طرح امن اور میل ملاپ کے ساتھ رہیں۔ ورنہ میں اسی کوشش میں اپنی جان دے دوں گا:

> Hindus and Musalmans should learn to live together in peace and amity otherwise I should die in the attempt (p.449)

مہاتما گاندھی کا یہ مشن ابھی پورا نہیں ہوا تھا کہ آزادی کے بعد بہت جلد انھیں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ یہ واقعہ ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ کو ہوا۔ اس وقت میں اعظم گڑھ میں تھا۔ ہمارے گھر کے سامنے

مسٹر کلد یپ سنگھ (پرنسپل ڈی اے وی کالج) رہتے تھے۔ اگلی صبح کو وہ ہمارے یہاں آئے اور کہا کہ آج میں نے بہت سے اخباروں میں مہاتما گاندھی کے قتل کی رپورٹ پڑھی۔ اس واقعہ کی سب سے بہتر سرخی وہ ہے جو امرت بازار پتریکا (الٰہ باد) نے لگائی ہے۔ اس کی سرخی یہ تھی۔ گاندھی مذہبی جنون کے ہاتھوں ہلاک:

Gandhi sacrificed by fanaticism.

جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہی واقعہ ہندستانی تاریخ کے دونوں دوروں کے درمیان حد فاصل بن گیا۔

۱۹۴۷ سے پہلے ملکی آزادی کی جدوجہد کو ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ کوشش نے کامیاب بنایا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں ایک طرف مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو جیسے بہت سے ہندو لیڈر ہیں جو آزادی کی تحریک میں بھرپور طور پر شامل ہیں۔ دوسری طرف مسلمانوں کی بڑی بڑی شخصیتیں بھی اس تحریک کی اگلی صف میں شریک ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، خان عبدالغفار خاں، وغیرہ۔ آزادی کی پوری جدوجہد میں ہندو مسلمان دونوں اسی طرح مل کر قربانیاں دیتے رہے۔ یہاں تک کہ یہ جدوجہد اپنی تکمیل تک پہنچ گئی۔

مگر آزادی (۱۹۴۷) کے بعد اچانک ایک بالکل مختلف منظر دکھائی دیتا ہے۔ اب ملک کے سامنے قومی تعمیر کے لئے جدوجہد کرنے کا مسئلہ تھا۔ مگر اس دوسرے مرحلہ میں مسلمان اچانک الگ تھلگ دکھائی دیتے ہیں۔ آزادی کے بعد ملکی تعمیر کے لئے دوبارہ ایک لمبی اور متحدہ کوشش درکار تھی مگر یہ متحدہ کوشش وجود میں نہ آسکی۔ آزادی سے پہلے جو ہندو اور مسلمان باہم مل کر کام کر رہے تھے وہ آزادی کے بعد نہ صرف الگ ہوئے بلکہ ان کے درمیان وہ تباہ کن سلسلہ شروع ہو گیا جس کو فرقہ وارانہ فساد کہا جاتا ہے۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں، ہماری قومی جدوجہد کے دوسرے مرحلہ کا ناکام رہنا سب سے زیادہ اسی بنا پر ہوا ہے۔ نئے دور کی تعمیری جدوجہد کے لئے دوبارہ متحدہ کوشش درکار تھی۔ چونکہ اس دوسرے

مرحلہ میں متحدہ کوشش وجود میں نہ آسکی اس لئے قدرتی طور پر وہ ناکام بھی رہی۔

یہ المیہ کیوں پیش آیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ غالباً یہ ہے کہ ۱۹۴۷ سے پہلے جو مشترک جدوجہد جاری ہوئی اس میں ہندوؤں کی طرف سے زیادہ تر سیکولر لوگ شریک تھے۔ یہ ہندو اپنے مزاج کی بنا پر اپنے مذہب یا اپنے مخصوص مذہبی رسوم کو اجتماعی معاملات میں داخل نہیں کرتے تھے۔ اس بنا پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی اجنبیت حائل نہیں ہوتی تھی۔ دونوں کھلے دل کے ساتھ ایک دوسرے سے ملتے تھے اور کسی توحش کے بغیر مل کر کام کرتے تھے۔ یہ ''سیکولر کلچر'' بنیادی طور پر دونوں فرقوں کے درمیان اتحاد کی طاقتور کڑی بنا رہا۔

آزادی کے بعد جب مہاتما گاندھی کو قتل کر دیا گیا تو اس کے بعد ہندوؤں کا وہ طبقہ ابھرنا شروع ہو گیا جو سیکولرزم کے بجائے ہندتو میں یقین رکھتا تھا۔ یہ لوگ ابتدا میں اتنے محدود تھے کہ آزادی کے بعد جب پہلی پارلیمنٹ بنی تو اس میں ان کے صرف دو ممبر شامل ہو سکے جو جن سنگھ کے ٹکٹ پر کامیاب ہو کر آئے تھے۔ یہ تعداد دھیرے دھیرے بڑھتی رہی یہاں تک کہ ۱۹۹۸ میں وہ اس پوزیشن میں ہو گئے کہ نئی دہلی کی مرکزی حکومت پر قبضہ حاصل کر لیں۔ ابتدا میں یہ لوگ صرف محدود دائرہ میں اپنا اثر رکھتے تھے مگر دھیرے دھیرے ان کے اثرات ہندو سماج کے بڑے طبقہ تک پھیل گئے۔

۱۹۴۷ سے پہلے جب ہندو اور مسلمان اجتماعی مواقع پر ملتے تھے تو دونوں سیکولر آداب کے تحت ملتے تھے۔ اس بنا پر دونوں کے درمیان کوئی کشیدگی پیدا نہیں ہوتی تھی۔ اب دوسرے دور میں یہ ہوا کہ مسلمان اگر کسی اجتماعی پروگرام میں جاتے تو وہاں ان کو ملاقات کے وقت مصافحہ کرنے کے بجائے دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کرنے کا ماحول ملتا تھا۔ پروگرام کا آغاز وندے ماترم کے گیت یا سرسوتی دیوی کی وندنا سے ہوتا تھا۔ اسی طرح پروگرام کے شروع میں ہندو رسم کے مطابق دیا جلا کر اس کا شبھ آرمبھ کیا جاتا تھا یا سنسکرت اشلوک پڑھے جاتے تھے۔ اس طرح کی بہت سی چیزیں ہیں جو نئے دور کے اجتماعی مواقع پر بھارتیہ سنسکرتی کے نام پر شامل کر دی گئیں۔

اس قسم کی تمام چیزیں خواہ دھرم کے نام پر کی جائیں یا سنسکرتی کے نام پر، ہر حال میں وہ

مسلمانوں کے لئے صرف دوری کا سبب بن سکتی تھیں اور واقعہ میں ایسا ہی ہوا۔ اس قسم کے تمام رسوم یا اس طرح کے تمام کلمات قدیم مشرکانہ عقائد پر مبنی ہیں۔ خواہ ان کا کوئی بھی خوبصورت نام دیا جائے مگر ان کے مبنی بر شرک ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مسلمان چونکہ ایک خدا کو مانتے ہیں، اس لئے ان کا موحدانہ مزاج اس قسم کے پروگراموں میں شرکت کے لئے ایک مستقل روک بن گیا۔ ان کے لئے ناممکن ہو گیا کہ وہ ایسے اجتماعی مواقع پر کھلے دل سے شریک ہو سکیں جن میں بھارتیہ سنسکرتی کے نام پر ان مشرکانہ رسوم کو ادا کیا جا رہا ہو۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آزادی سے پہلے قومی جدوجہد کی جو گاڑی اپنے دو پہیوں (ہندو اور مسلمان) کے ذریعہ چل رہی تھی، وہ اب بڑی حد تک صرف ایک پہیہ (ہندو) کے ذریعہ چلنے لگی۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے، کوئی گاڑی جس کے دو پہیوں میں سے ایک پہیہ نکال دیا جائے وہ کھڑی تو ہو سکتی ہے مگر اپنے راستہ پر تیز رفتاری کے ساتھ چل نہیں سکتی۔ چنانچہ قانون فطرت کے تحت ہماری قومی تعمیر کی گاڑی بھی چلتے چلتے اچانک ٹھہر گئی۔ قومی تعمیر کا سارا منصوبہ ناکام ہو کر رہ گیا۔

اب بیسویں صدی کے خاتمہ پر آخری طور پر وہ وقت آ گیا ہے جب کہ ہندتو لیڈر شپ یہ جان لے کہ دونوں فرقوں کی متحدہ کوشش کے بغیر ملک کی حقیقی تعمیر ممکن نہیں۔ ملکی تعمیر کے معاملہ میں ان حضرات کے سامنے جن دو کے درمیان انتخاب (option) ہے وہ یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ جدوجہد یا مسلمانوں کے بغیر جدوجہد۔ بلکہ ان کے لئے اصل انتخاب دوسری دو صورتوں کے درمیان ہے، اور وہ ہے — مسلمان کے ساتھ جدوجہد یا سرے سے جدوجہد ہی نہیں۔

اس پیچیدہ مسئلہ کا حل کیا ہے۔ وہ حل یہ ہے کہ برادران وطن کی ہندتو لیڈر شپ بھی اسی طریقہ کو اختیار کرے جس کو اس سے پہلے ان کی سیکولر لیڈر شپ نے اختیار کیا تھا۔ یعنی وہ چیز جس کو وہ بھارتیہ سنسکرتی کہتے ہیں، اس کو مکمل طور پر اجتماعی پروگراموں اور سرگرمیوں سے الگ کر دیا جائے۔ اگر وہ چاہیں تو اپنے ذاتی دائرہ میں اس کو اختیار کر سکتے ہیں مگر اجتماعی دائرہ کے تمام مواقع سے مکمل طور پر اس کو حذف کر دیا جائے۔ یہی واحد تدبیر ہے جس کے ذریعہ دوبارہ اس ہندو مسلم مشترک جدوجہد کو زندہ

کیا جا سکتا ہے جس نے پہلے مرحلہ میں ہماری قومی جدو جہد کو کامیاب کیا تھا اور جو دوسرے مرحلہ میں بھی ہماری قومی جدو جہد کی کامیابی کی واحد ضمانت ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی بھی سماج میں اتحاد ہی تمام ترقیوں کا واحد ضامن ہے۔ جب سماج کے تمام طبقات مل کر کام کرتے ہیں اسی وقت یہ ممکن ہوتا ہے کہ ان کے درمیان وہ متحدہ کوشش وجود میں آئے جو کسی بھی بڑے کام کے لئے ضروری ہے۔

یہ فطرت کا قانون ہے، یہ تاریخ کا فیصلہ ہے۔ اور ہم جتنی جلد اس حقیقت کو جان لیں اتنا ہی اچھا ہے۔ اس حقیقت سے بے خبری یا اس کا عدم اعتراف ایک ایسی تباہ کن غلطی ہوگی جس کو ہماری اگلی نسلیں کبھی معاف نہیں کریں گی۔

اس بات کی وضاحت کے لئے یہاں میں ایک چھوٹی سی مثال دیتا ہوں۔ دہلی میں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو ہیں۔ وہ لمبی مدت تک ایک بڑی کمپنی میں بزنس مینیجر کے طور پر کام کرتے رہے۔ اپنے پچیس سالہ تجربہ اور مطالعہ کی بنیاد پر انھوں نے بزنس مینجمنٹ کے موضوع پر ایک کتاب (۳۱۶ صفحات) انگریزی میں لکھی جس کا نام انتظامی افکار (Management Thoughts) تھا۔ میں نے یہ کتاب دیکھی ہے۔ وہ بلا شبہ ایک کامیاب کتاب ہے اور ہر قسم کے لوگوں کے لئے بہترین تجارتی گائڈ ہے، خواہ وہ کسی بھی مذہب یا فرقہ سے تعلق رکھتے ہوں۔

یہ کتاب پہلی بار ۱۹۹۱ میں چھپی۔ مصنف نے اس کو دہلی کی بک فیئر میں رکھا مگر وہاں وہ بہت کم تعداد میں فروخت ہو سکی۔ اتنی کامیاب اور قابل مطالعہ کتاب بک فیئر میں ناکام کیوں رہی، اس کی وجہ صرف ایک تھی۔ وہ یہ کہ انھوں نے ٹائٹل پر کتاب کے نام کے نیچے ہندو دیوتا گنیش کی رنگین تصویر بنائی۔ یہ تصویر ٹائٹل کے تقریباً تین چوتھائی حصہ پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو شخص بھی ان کے اسٹال پر آتا وہ کتاب کا ٹائٹل دیکھ کر آگے بڑھ جاتا۔ گنیش جی کی تصویر کو دیکھ کر وہ یہ سمجھتا کہ یہ شاید ہندو مائتھالوجی سے متعلق کوئی کتاب ہے۔ اس بنا پر چند مذہبی ہندو ہی اس کتاب سے دلچسپی لے سکے، بقیہ لوگ اس کے ظاہر کو دیکھ کر ہی اس سے بے رغبت ہو گئے اور اس کو چھوڑ کر چلے گئے۔

اس واقعہ کا علم مذکورہ ہندو کے ایک مسلمان دوست کو ہوا۔ مسلمان نے اس مسئلہ پر غور کیا اور مذکورہ ہندو مصنف کو یہ مشورہ دیا کہ آپ مجھے اجازت دیں کہ میں کتاب کے اس ٹائٹل (گرد پوش) کو بدل دوں۔ ہندو مصنف نے اجازت دے دی۔ اس کے بعد مذکورہ مسلمان پبلشر نے صرف یہ کیا کہ اس مجلد کتاب کے لئے ایک نیا گرد پوش چھپوایا۔ اس نئے گرد پوش پر صرف کتاب کا نام (Management Thoughts) جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا۔ اس کے نیچے حسب قاعدہ مصنف کا نام تھا۔ گرد پوش کے بقیہ حصہ پر انھوں نے کچھ تجارتی اقوال لکھ دیئے جو اسی کتاب سے لئے گئے تھے۔ مثال کے طور پر:

Our attitude determines our altitude.

اگلے سال یہ کتاب دوبارہ دہلی کی بک فیئر میں رکھی گئی۔ کتاب وہی تھی، صرف اس کا ٹائٹل بدل دیا گیا تھا۔ اس تبدیلی کا نتیجہ نہایت شاندار نکلا۔ لوگ آتے اور کتاب کو ہاتھ میں لے کر اس کو الٹتے پلٹتے اور پھر شوق کے ساتھ اس کو خرید لیتے۔ یہ بک فیئر ایک بین اقوامی نمائش تھی چنانچہ دوسرے ملکوں کے لوگ بھی یہاں آئے ہوئے تھے۔ مصنف نے بتایا کہ اب نہ صرف ہندستانیوں نے اس کتاب کو خریدا بلکہ پاکستان اور عرب اور دوسرے ملکوں سے آئے ہوئے لوگوں نے بھی نہایت شوق کے ساتھ اس کو حاصل کیا۔ بک فیئر کی مدت ختم ہونے سے پہلے ہی کتاب کا پورا اسٹاک ختم ہو چکا تھا۔

اب مذکورہ ہندو اور مسلمان دونوں نے مزید کتابیں چھاپی ہیں اور وہ مل کر یہ کام کر رہے ہیں۔ ان کا یہ کتابی بزنس پہلے کے مقابلہ میں بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ وہ نہ صرف ملکی مارکیٹ میں کامیاب ہیں بلکہ وہ بیرونی ملکوں میں بھی اپنی کتابوں کو بڑی تعداد میں اکسپورٹ کر رہے ہیں۔

اس واقعہ پر غور کیجئے تو یہ اہم نکتہ معلوم ہوگا کہ اتحاد کس طرح ترقی کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندو مصنف کے پاس تجارتی معلومات کا ذخیرہ تھا مگر اپنے مخصوص مذہبی ذہن کی بنا پر وہ ایک محدودیت کا شکار ہو گئے۔ وہ اس راز کو سمجھ نہ سکے کہ وہ اپنے مخصوص ذہن کی بنا پر گنیش جی کو خود تو مشکل کشائی کا دیوتا سمجھتے ہیں مگر دوسری قوموں اور دنیا کے بیش تر لوگوں کے نزدیک گنیش جی

صرف ایک دیو مالائی شخصیت ہیں، نہ کہ کوئی حقیقی شخصیت۔

مذکورہ مسلمان اپنے اسلامی ذہن کی بنا پر اس نفسیاتی پیچیدگی سے خالی تھا۔ اس کے نزدیک مشکل کشائی یا تجارتی کامیابی کا تعلق کسی دیوی یا دیوتا سے نہ تھا۔ اس بنا پر وہ اس پوزیشن میں تھا کہ معاملہ پر کھلے ذہن کے ساتھ سوچے، وہ اس کے بارے میں حقیقت پسندانہ رائے قائم کر سکے۔ چنانچہ اس نے ہندو مصنف کو ایک ایسا مشورہ دیا جو مکمل طور پر حقیقت پر مبنی تھا۔ اور اس دنیا کے لئے فطرت کا قانون یہ ہے کہ حقیقت پر مبنی منصوبہ کامیاب ہو اور تخیلات پر مبنی منصوبہ ناکام ہو کر رہ جائے۔

ضرورت ہے کہ اس انفرادی مثال کو پورے ملک میں قومی سطح پر دہرا یا جائے۔ یہاں کے ہر پروگرام اور ہر اجتماعی سرگرمی کو سیکولر بنیادوں پر قائم کیا جائے۔ خواہ تعلیمی ادارے ہوں یا تجارتی ادارے، کوئی جلسہ ہو یا تقریب، کوئی سرکاری معاملہ ہو یا غیر سرکاری معاملہ، ہر جگہ سیکولرزم کے اصول کو اختیار کیا جائے۔ ہندتو یا بھارتیہ سنسکرتی کو صرف ذاتی دائرہ میں محدود کر دیا جائے۔ اجتماعی عمل کے مواقع سے اس کو مکمل طور پر دور رکھا جائے۔

موجودہ دنیا میں جس ملک نے بھی کوئی بڑی ترقی کی ہے، اس نے اسی سیکولر اصول کو اختیار کر کے ترقی کی ہے۔ ہندستان کے لئے بھی کامیابی کا یہی واحد راستہ ہے۔ یہ معاملہ اتنا زیادہ حتمی ہے کہ اگر ہماری موجودہ نسل نے اس کو خوشی کے ساتھ قبول نہ کیا تو ہماری اگلی نسل بغاوت کر کے اس کو اختیار کرے گی۔ جو مذہب یا سنسکرتی ترقی کے عمل میں عقب لشکر (rear-guard) کا کام انجام دے اس کو ماڈرن انسان کبھی قبول نہیں کر سکتا۔ اس سنگین حقیقت کو جس قدر جلد سمجھ لیا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔

ہندتو لیڈر شپ نے پہلے بھارتیہ سنسکرتی کو آداب و رسوم کی سطح پر ملکی زندگی میں داخل کرنے کی کوشش کی۔ اس نے دیکھا کہ لوگ ان چیزوں میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہے ہیں حتیٰ کہ خود جدید تعلیم یافتہ ہندو بھی اس قسم کی رسوماتی چیزوں سے بیزار رہے ہے۔ اس کے بعد ہندتو لیڈر شپ نے ایک اور فیصلہ کیا جو پہلے سے بھی زیادہ تباہ کن تھا۔ وہ یہ کہ ـــــــ لوگ اگر بھارتیہ سنسکرتی سے دلچسپی نہیں لے رہے

ہیں تو لوگوں کے ذہن کو بدل کر انھیں ایسا بنایا جائے جو ان حضرات کی پسند کے مطابق ہو۔ یعنی جو انھیں کی طرح بھارتیہ سنسکرتی کو پسند کرنے لگے۔

اس مقصد کے لئے انھوں نے ایک طویل ایجنڈا بنایا ہے۔ بزعم خود وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ایجنڈا ملک کو ترقی کی طرف لے جانے والا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ وقوع میں آجائے تو وہ ملک کو پیچھے دھکیلنے کے سوا کوئی اور کارنامہ انجام دینے والا نہیں۔

یہ ہندتوا ایجنڈا اب کھل کر سامنے آچکا ہے ــــــ وہ ہے ملک کے تعلیمی نظام کو بھارتیہ سنسکرتی کے مطابق تشکیل دینا، ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعہ اس سنسکرتی کا پرچار کرنا، دستور اور قانون کو بھارتیہ سنسکرتی پر ڈھالنا، ملک کی تاریخ کو دوبارہ اپنی مرضی کے مطابق لکھنا، ملک سے ان تمام آثار کو مٹانا جو بھارتیہ سنسکرتی کی یاد نہ دلاتے ہوں، غرض پورے ملک پر اس عمل کو انجام دینا جس کو عام طور پر بھارتیہ کرن کہا جاتا ہے۔

جو صاحبان اس قسم کا خواب دیکھ رہے ہیں انھیں جاننا چاہئے کہ وہ تاریخ کے پہیہ کو الٹا گھمانا چاہتے ہیں۔ وہ فطرت کے قانون سے لڑ رہے ہیں۔ وہ گلوبل نیشنلزم کے زمانہ میں محدود نیشنلزم کا جزیرہ بنانا چاہتے ہیں۔ اس قسم کی کسی کوشش کے لئے پیشگی طور پر یہ مقدر ہے کہ وہ سرے سے وقوع ہی میں نہ آئے۔ اس قسم کا منصوبہ بلاشبہ حقائق کے خلاف ہے، اور حقائق کی چٹان سے سر ٹکرا کر کوئی شخص اپنے سر کو توڑ تو سکتا ہے مگر وہ حقائق کے رخ کو بدل نہیں سکتا۔

تباہ کُن ذہنیت

پندرہ سال پہلے ہندستانی ٹی وی پر رامائن اور مہابھارت کے سیریل تفصیل سے دکھائے گئے تھے۔اس زمانہ میں ایک ہندو تاجر نے مجھ سے کہا کہ یہ سیریل جو دکھائے جارہے ہیں وہ کوئی معمولی چیز نہیں۔اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ ہندستانی سماج میں ایک نیا تہذیبی انقلاب آگیا ہے۔

مگر نتیجہ بالکل برعکس نکلا۔ رامائن اور مہابھارت کے سیریل ختم ہونے کے بعد ہی عملی طور پر ایک بالکل مختلف منظر سامنے تھا۔ ملک کے قدیم کلچر کی طرف دعوت دینے والی اس رنگین فلم کو بظاہر لوگوں نے دلچسپی کے ساتھ دیکھا۔مگر اس کے بعد پورے ملک نے نہایت اطمینان کے ساتھ مغرب سے آنے والے جدید کلچر کو اختیار کرلیا ـــــــ ہندی زبان کے بجائے انگریزی زبان لوگوں کے ذہنوں پر چھاگئی۔نئی نسل نمستے اور نمسکار کے بجائے ہائے اور ہیلو کہنے لگی۔جل جیرہ کو چھوڑ کر لوگ کوکا کولا پر ٹوٹ پڑے۔دوردرشن سے زیادہ کیبل ٹی وی دیکھا جانے لگا۔ہر نوجوان یہ خواب دیکھنے لگا کہ وہ کسی نہ کسی طرح امریکا اور یورپ کے ملکوں میں پہنچ جائے،مغربی کمپنیوں کے لئے ملک کے دروازے کھول دئے گئے۔ بھارت کی روایتی تہذیب کی اہمیت لوگوں کی نظر میں گھٹ گئی۔اس کے بجائے وہ جدید مغربی تہذیب کو زیادہ بڑی چیز سمجھنے لگے،وغیرہ۔

ایسا کیوں ہوا۔اس کی وجہ خود میرے ساتھ پیش آنے والے ایک واقعہ سے معلوم ہوتی ہے۔ جس زمانہ میں رامائن سیریل دکھائے جارہے تھے میرے ایک پڑوسی ہندو نے مجھے اس کو دیکھنے کی ترغیب دی۔ میں نے کہا کہ میرے پاس ٹی وی نہیں ہے۔انھوں نے دعوت دی کہ میں ان کے گھر پر آؤں اور کم ازکم اس کا ایک سیریل دیکھوں۔

اس کے مطابق،میں ایک روز شام کو ان کے گھر پہنچا۔ٹی وی کھولا گیا اور ہم دونوں اس کے سامنے بیٹھ کر اس دن آنے والا سیریل دیکھنے لگے۔میں نے دیکھا کہ اس میں عجیب وغریب قسم کے خارق عادت مناظر دکھائے جارہے ہیں۔مثلاً ایک شخص کو کھڑا کر کے اس کی کمر کے پاس تلوار ماری

جاتی ہے۔تلوار اس کے جسم کو کاٹتی ہوئی دوسری طرف نکل جاتی ہے مگر اس کا جسم دوبارہ جڑ جاتا ہے اور وہ شخص بدستور زندہ کھڑا رہتا ہے۔

میرے ہندو میزبان جو ایک مغربی ملک سے اعلیٰ سائنسی تعلیم حاصل کرکے آئے تھے انھوں نے ان عجیب وغریب مناظر کی وضاحت کرتے ہوئے کسی قدر معذرت خواہانہ انداز میں کہا: مولانا صاحب، یہ مائتھالوجی ہے۔ یہ کوئی واقعی تاریخ نہیں۔

کسی سماج کی ذہن سازی یا کردار سازی حقیقی کیریکٹر کے ذریعہ ہوتی ہے نہ کہ افسانوی کیریکٹر کے ذریعہ۔ لوگ کسی افسانوی کہانی کو دلچسپی کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں یا اسکرین پر دیکھ کر اس سے وقتی طور پر محظوظ ہو سکتے ہیں۔ مگر اس کا یہ اثر نہیں ہوسکتا کہ اس سے ان کی سوچ بدل جائے یا ان کے عمل میں انقلاب آجائے۔ افسانوی کیریکٹر ایک خیالی کیریکٹر ہوتا ہے اور ایک خیالی کیریکٹر کسی کے لئے عملی سبق کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔

رامائن اور مہابھارت کے سیریل محض مائتھالوجی پر مبنی تھے۔ اس کے برعکس مغرب سے آنے والا کلچر ایک حقیقی واقعہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ لوگوں کے اوپر مائتھالوجی پر مبنی فلمی کہانی کا کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ حقیقت پر مبنی مغربی کلچر کی طرف ٹوٹ پڑے۔

ہندستان کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے کہا تھا کہ ہمارے ملک کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ لوگوں میں سائنسی مزاج (scientific temper) نہیں۔ پنڈت نہرو نے اپنے اس قول میں شاید انھیں لوگوں کی طرف اشارہ کیا تھا جو سائنسی دور میں مائتھالوجی کی بنیاد پر ملک کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ پنڈت نہرو نے درست طور پر یہ سمجھا تھا کہ اس قسم کی کوشش ہمارے ملک کو صرف پیچھے کی طرف لے جائے گی، وہ آگے کی طرف لے جانے والی نہیں۔ اس قسم کی کوشش گویا ایک خلاف زمانہ حرکت (anachronism) ہے۔ اور خلاف زمانہ حرکت کبھی کسی کو فائدہ نہیں دے سکتی۔ ہمارے ملک میں ایک طبقہ ہے جس کو یہ اصرار ہے کہ تمام اسکولوں میں سرسوتی دیوی کی تصویریں لگائی جائیں اور سرسوتی کی وندنا کی جائے۔ ان کا خیال ہے کہ سرسوتی کو چونکہ علم کی دیوی مانا جاتا ہے اس لئے ایسا کرنے سے

اسکولوں اور کالجوں میں علم کو فروغ حاصل ہوگا۔ مگر یہ سراسر خوش فہمی ہے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ۵۰ سال سے بھی زیادہ مدت سے سرسوتی دیوی کو اس مقصد کے لئے استعمال کیا جارہا ہے مگر ابھی تک ملک میں علمی ذوق یا سائنسی ذہن پیدا نہ ہوسکا۔ کوئی حقیقی ذوق صرف حقیقی کردار کے ذریعہ پیدا ہوسکتا ہے نہ کہ افسانوی کردار کے ذریعہ۔

اسی طرح اس طبقہ کے ہندوؤں نے سوچا کہ اگر اجودھیا میں بابری مسجد کو ڈھا کر وہاں رام مندر بنا دیا جائے تو ملک میں ایک انقلاب آجائے گا۔ ملک کی تاریخ صحیح رخ پر سفر کرنے لگے گی۔ مگر یہ بھی محض ایک خوش فہمی ہے۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

اجودھیا میں بابری مسجد کا بننا ایک تاریخی واقعہ ہے۔ ثابت شدہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ مغل بادشاہ بابر (وفات ۱۵۳۰) کے گورنر میر باقی نے ۱۵۲۸ میں اجودھیا کی یہ مسجد تعمیر کی۔ چونکہ وہ بابر کے زمانہ میں بنی تھی اس لئے وہ بابری مسجد کے نام سے مشہور ہوگئی۔ اس کے مقابلہ میں رام مسلمہ طور پر ایک افسانوی شخصیت ہیں۔ وہ کوئی تاریخی شخص (historical figure) نہیں۔ جب رام خود کوئی تاریخی شخصیت نہیں تو ان کی جنم بھومی بھی یقینی طور پر ایک غیر تاریخی قصہ ہے۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو یہ واقعہ ہوا کہ مذکورہ ذہن رکھنے والے لوگوں نے بابری مسجد کو ڈھا کر وہاں رام مندر کے نام پر ایک مندر بنا دیا۔ خالص علمی طور پر دیکھا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو ہندستان کی تاریخ کا وہ بدقسمت دن تھا جب کہ ایک افسانوی دلیل کے ذریعہ ایک تاریخی حقیقت کو رد کر دیا گیا۔

جن لوگوں نے ایسا کیا وہ اس کو تاریخ کی تصحیح کا نام دیتے ہیں مگر زیادہ درست طور پر وہ تاریخ کا قتل تھا۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو بظاہر پتھر کا ایک ڈھانچہ ڈھایا گیا مگر حقیقت کے اعتبار سے دیکھئے تو اس دن تاریخی مزاج اور سائنسی ذہن کو ڈھا دیا گیا۔ اور کسی ملک کے لئے یقینی طور پر اس سے زیادہ تباہ کن بات اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ اس کے عوام کے اندر سے تاریخی ذوق کا خاتمہ کر دیا جائے۔

اس معاملہ کا ایک اور پہلو ہے۔ یہ دوسرا پہلو مذکورہ پہلو سے کم اہم نہیں بلکہ اپنے نتائج کے اعتبار سے وہ غالباً مذکورہ پہلو سے بھی زیادہ سنگین ہے۔

ہندستان کا دستور مکمل طور پر ایک سیکولر دستور ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں کی نیشنل لائف کو مذہب سے الگ رکھا جائے گا۔ نیشنل سرگرمیوں کو سیکولر بنیادوں پر قائم کیا جائے گا۔ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے تو مذہب کے معاملہ میں ہر شخص یا گروہ کو آزادی ہوگی کہ وہ اپنے نجی دائرہ میں جس مذہب پر چاہے عمل کرے۔ ملک کے ابتدائی معماروں کا یہ فیصلہ نہایت درست تھا کہ ملک کے اجتماعی نظام کو سیکولر بنیادوں پر قائم کیا جائے۔ موجودہ حالات میں ہندستان کے لئے سیکولر نظام سے بہتر کوئی نظام نہیں ہوسکتا۔

مگر یہ دستور ہند کی اسپرٹ کے سراسر خلاف ہوگا کہ ''اقلیتوں'' کے مذہب کو تو ملک کی اجتماعی زندگی سے خارج کردیا جائے لیکن اکثریتی فرقہ کے مذہب کو کسی ایک یا دوسرے نام پر اجتماعی زندگی میں شامل رکھا جائے۔ اس قسم کی دہری روش ملک میں منافقانہ فضا پیدا کرے گی اور قانون کے احترام کا مزاج یکسر ختم کردے گی۔ قومی زندگی کو صالح بنیاد پر قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ دستور اور قانون میں جو طے کیا جائے اس پر جیسا ہے ویسا (as it is) عمل کیا جائے۔

ایک طرف سیکولرزم اور مساویانہ حقوق کا نام لینا اور دوسری طرف کسی ایک فرقہ کے مذہب کو نیا نام دے کر اس کو دوسرے فرقوں پر مسلط کرنا دوعملی کی روش ہے اور اس قسم کی روش پورے ملک میں لاقانونیت (lawlessness) کی ذہنیت پیدا کردے گی۔ ایسے حالات میں یہ ناممکن ہو جائے گا کہ ملک میں کوئی تعمیری معاشرہ قائم کیا جاسکے۔

ملک کے تمام سنجیدہ لوگ یہ مانتے ہیں کہ اس وقت ہماری سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ یہاں اقدار پر مبنی سماج (value based society) قائم ہو۔ اس قسم کے سماج کو بنانے کی پہلی شرط یہ ہے کہ ملک کے بااختیار لوگوں میں امانت داری (honesty) پائی جاتی ہو۔ دستور میں لفظی طور پر ایک بات لکھنا اور عملی زندگی میں بلا اعلان کسی اور بات کو رائج کرنا ایک کھلی ہوئی بددیانتی (dishonesty) ہے۔ جس سماج کے بااختیار طبقے میں بددیانتی کا مزاج ہو وہاں کبھی بھی اقدار پر مبنی سماج قائم نہیں کیا جاسکتا۔ اور جو سماج اخلاقی اقدار (moral values) سے خالی ہو وہ یقینی طور پر ہر دوسری بھلائی سے بھی خالی ہوگا۔

سفرِ بے منزل

یکم جنوری ۲۰۰۰ کو دنیا کے تمام ملک اکیسویں صدی میں داخل ہوجائیں گے۔ تاہم یہ داخلہ ہر ملک کے لئے یکساں نہ ہوگا۔ کچھ ملکوں کے لئے اکیسویں صدی میں داخلہ ترقیاتی دور میں داخلہ کے ہم معنٰی ہوگا۔ اور کچھ ملک وہ ہوں گے جن کے لئے یہ داخلہ صرف کیلنڈر بدلنے کے ہم معنٰی ہوگا۔ کاغذی اعتبار سے وہ اپنے یہاں اکیسویں صدی کی گنتی لکھیں گے مگر حقیقت کے اعتبار سے ابھی وہ صرف بیسویں صدی میں ہوں گے یا اس سے بھی پیچھے۔

بدقسمتی سے ہندستان ان ملکوں میں شامل ہوگا جو صرف کیلنڈر کے معنوں میں اکیسویں صدی میں داخل ہوں گے۔ ترقیاتی معیار کے اعتبار سے وہ اکیسویں صدی کے معیار سے بہت پیچھے ہوں گے۔ ۵۰ سال پہلے ہندستان میں جو بڑے بڑے لیڈر ابھرے انھوں نے کہا تھا کہ ہماری جدوجہد کا نشانہ ہر ہندستانی کی آنکھ کے آنسو پوچھنا ہے۔ مگر پرشور ہنگاموں کے باوجود آج ہم دیکھتے ہیں کہ نتیجہ بالکل برعکس نکلا۔ رونے والی آنکھوں میں اتنا زیادہ اضافہ ہوگیا ہے کہ اب ایسی آنکھ کو ڈھونڈ پانا مشکل ہے جو رونے سے بچی ہوئی ہو۔

اس بھیانک ناکامی کا راز کیا ہے۔ اس کا راز ایک لفظ میں صحیح سمت میں سفر نہ کرنا ہے۔ پچھلے طویل دور میں ہمارے لیڈر تعمیر وترقی کے نام پر پُرشور ہنگامے کرتے رہے۔ مگر شاید وہ حرکت (motion) اور سمت (direction) کا فرق نہیں سمجھتے تھے۔ انھوں نے خوبصورت ناموں سے کچھ سرگرمیاں جاری کرکے یہ سمجھ لیا کہ وہ اپنی منزل مقصود کی طرف سفر کر رہے ہیں۔ حالانکہ منزل کی طرف سفر صرف وہ ہے جو منزل کی سمت میں ہو۔ صحیح رخ کے بغیر حرکت، وقت اور طاقت کا ضائع کرنا ہے نہ کہ منزل کی طرف سفر کرنا۔

اب آخری وقت آگیا ہے کہ عمل کی صحیح سمت کا تعین کرکے صحیح رخ پر اپنی کوششوں کو جاری کیا جائے۔ اس کے بغیر کوئی کوشش نتیجہ خیز نہیں ہوسکتی۔

ہندستان کا سفر

ایک مسافر دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر ہے۔ اس کو کلکتہ جانا ہے۔ وہ پلیٹ فارم پر ایک گاڑی دیکھتا ہے اور وہ بلا تحقیق اس پر بیٹھ جاتا ہے۔ ٹرین روانہ ہوتی ہے۔ مسافر خوش ہے کہ وہ اپنی منزل کی طرف جا رہا ہے۔ مگر جب ٹرین اپنے آخری اسٹیشن پر پہنچتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ امرتسر کی طرف جانے والی ٹرین تھی نہ کہ کلکتہ کی طرف جانے والی ٹرین۔ اب مسافر پھر یہی کرتا ہے کہ وہ ضروری تحقیق کے بغیر ایک اور ٹرین پر بیٹھ جاتا ہے۔ مگر دوبارہ یہی ہوتا ہے کہ وہ ایک اور غیر مطلوب منزل پر پہنچ جاتا ہے کیوں کہ یہ ٹرین بمبئی کی طرف جا رہی تھی نہ کہ کلکتہ کی طرف۔

اس قسم کا سفر بظاہر سفر دکھائی دیتا ہے مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ سفر بے منزل ہوتا ہے۔ جو مسافر اس طرح سفر کرے وہ کبھی اپنی منزل پر نہیں پہنچے گا، خواہ وہ اپنی ساری عمر ٹرینوں میں گزارتا رہے۔

بدقسمتی سے ہندستان میں یہی صورت پیش آئی ہے۔ ۱۵/اگست ۱۹۴۷ کو ہندستان آزاد ہوا۔ اب ہم اس پوزیشن میں ہو گئے کہ ہم خود اپنے فیصلہ کے تحت ہندستان کی اعلیٰ تعمیر کر سکیں۔ مگر بدقسمتی سے ہمارے لیڈر قوم کو غلط ٹرینوں پر بٹھاتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پچاس سال سے زیادہ مدت تک سفر کرنے کے باوجود ہندستان اپنی مطلوب منزل تک نہ پہنچ سکا۔

آزادی کے بعد ہمارے لیڈروں نے قوم کو جس ٹرین پر بٹھایا اس کو ایک لفظ میں سوشلسٹ اکسپریس کہا جا سکتا ہے۔ اس مقصد کے لئے ملک کے پورے اقتصادی اور سماجی ڈھانچہ کو بدل دیا گیا۔ ملک کی تمام سرگرمیاں حکومتی عہدہ داروں کے کنٹرول میں دے دی گئیں۔

انگریزوں نے اپنی دوسوسالہ حکومت کے درمیان صرف پانچ سو قانون بنائے تھے۔ مگر ملکی حکمرانوں نے چالیس سال کے اندر پانچ ہزار سے زیادہ قانون بنا ڈالے۔ اس کے نتیجہ میں ملک میں وہ چیز قائم ہو گئی جس کو راج گوپال آچاریہ نے لائسنس پرمٹ راج کہا تھا۔

اس نئے نظام کے تحت ہماری آزادی ایک نئی اور شدید تر پابندی میں تبدیل ہو گئی۔ کسی کو ایک

کارخانہ لگانا ہے تو ضروری ہو گیا کہ وہ پچاس سرکاری کھڑکیوں پر کھڑا ہو اور کلیرنس کے لئے برسوں اس دفتر سے اس دفتر تک دوڑتا رہے۔ نام نہاد لیبر قوانین کا نتیجہ یہ ہوا کہ، جے آر ڈی ٹاٹا کے الفاظ میں، ایک صنعت کار اپنی بیوی کو طلاق دے سکتا ہے مگر وہ اپنے ایک ورکر کو نکال نہیں سکتا۔

اس نام نہاد سوشلسٹ نظام کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کی اقتصادی سرگرمیوں سے کامپٹیشن ختم ہو گیا۔ ملک کے بازار غیر معیاری سامانوں سے بھر گئے۔ سرکاری اہل کاروں کے بڑھے ہوئے اختیارات کی بنا پر کرپشن اتنا بڑھا کہ کوئی بھی چھوٹا یا بڑا کام رشوت کے بغیر انجام پانا ناممکن ہو گیا۔ نام نہاد نیشنلائزیشن کے نتیجہ میں سرکاری ملازموں کی ایک عظیم فوج تیار ہو گئی جس کو یہ یقین تھا کہ وہ کام کرے یا نہ کرے، مہینہ کے آخر میں بہر حال اس کو تنخواہ مل جائے گی۔ اس مصنوعی نظام نے، ایک سینئر صحافی کے الفاظ میں، پوری ہندستانی قوم کو کاہل (lethargic) بنا دیا، وغیرہ۔

آزادی کے بعد ہمارے لیڈروں نے قوم کو سوشلسٹ اکسپریس پر سوار کیا تھا۔ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ ملک تیزی سے اعلیٰ ترقی کی طرف جا رہا ہے۔ مگر چالیس سال کے بعد جب اس سفر کی منزل آئی تو یہ حالت ہوئی کہ ملک انگریزی دور سے بھی زیادہ برے حال میں مبتلا ہو چکا تھا۔ ہندستان اپنی آبادی اور اپنے رقبہ کے اعتبار سے دنیا کا تیسرا ملک ہے۔ مگر ترقی کے جدید معیار کے مطابق، آج وہ دنیا کا ۱۳۸ واں ملک شمار کیا جاتا ہے۔ جب کہ اسی مدت میں سنگاپور اور جنوبی کوریا جیسے چھوٹے چھوٹے ملک ہم سے بہت زیادہ آگے جا چکے ہیں۔

سوشلسٹ اکسپریس پر سفر کرنے کے بعد ہمارے لیڈروں کو محسوس ہوا کہ وہ غلط ٹرین پر بیٹھ گئے تھے۔ اب ملک میں ایک نئی لیڈرشپ زور پکڑنے لگی ہے۔ عرف عام کے مطابق، اس نئی لیڈرشپ کو ہندتو لیڈرشپ کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے زور وشور کے ساتھ یہ کہنا شروع کیا کہ آزادی کے بعد جن لیڈروں کے ہاتھ میں ملک کی قسمت آئی انھوں نے قوم کو غلط ٹرین پر بٹھا دیا۔ ہم کو ووٹ دو تا کہ ہم صحیح ٹرین کے ذریعہ تمہارے ترقیاتی سفر کو جاری کر سکیں۔ ان کے رتھ آندولن سے بہت سے لوگ متاثر ہو گئے۔ یہاں تک کہ ۱۹۹۸ کے آغاز میں انھیں یہ موقع ملا کہ وہ ملک کی سیاسی قیادت پر قبضہ کر لیں۔

ان نئے لیڈروں نے ہندستان کو جس نئی ٹرین پر سوار کیا اس کو ایک لفظ میں ہندتوا کسپریس کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے بڑے بڑے دعووں کے ساتھ قوم کو ہندتوا کسپریس پر بٹھایا اور اس کو فل اسپیڈ کے ساتھ چلا دیا۔ مگر صرف ایک سال کے تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ ہندتوا کسپریس کا سفر اس سے بھی زیادہ تباہ کن ہے جتنا کہ سوشلسٹ اکسپرس کا سفر ثابت ہوا تھا۔ سوشلسٹ اکسپریس کے سفر نے ملک کو اقتصادی اعتبار سے تباہ کیا تھا۔ ہندتوا کسپریس کے سفر میں مزید نقصان یہ ہوا کہ اعلیٰ انسانی قدریں (human values) بھی تباہ ہو کر رہ گئیں۔

یہ ہندتو لیڈرشپ 'راہ رو پشت بہ منزل' کی ایک مثال ہے۔ وہ آگے کی طرف سفر کے نام پر قوم کو پیچھے کی طرف دوڑانا چاہتی ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں اقبال احمد سہیل مرحوم نے کہا تھا:

آگے ہے قدم پیچھے ہے نظر، جانا ہے کہاں جاتے ہیں کدھر
مبہم ہے یہاں خود سمتِ سفر، نیرنگ زمانہ کیا کہیے

ہندتو لیڈرشپ کی سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ وہ اس کمزوری کی شکار ہے جس کو انگریزی میں کنڈیشنڈ تھنکنگ کہا جاتا ہے، یعنی لگے بندھے ذہن کے تحت سوچنا۔ تقریباً سو سال پہلے شری گرو گولوالکر اور ڈاکٹر ہیڈ گواڑ جیسے ماضی پرست لوگوں نے اپنے محدود ذہن کے تحت انھیں جو سبق دیا تھا وہی ان کو معلوم ہے۔ ان کی سوچ بس اسی کے دائرہ میں چلتی ہے۔ ایسے لوگ صرف یہی کر سکتے ہیں کہ ترقی کے نام پر وہ ملک کو پیچھے دھکیل دیں۔ بدقسمتی سے انھوں نے اپنے محدود اقتدار کے زمانہ میں یہی کارنامہ انجام دیا ہے۔

نام نہاد ہندتو ایجنڈا کیا ہے، وہ ملک کو ماضی کے اندھیرے میں دھکیلنے کا دوسرا نام ہے۔ وہ مفروضات یا توہّمات کے ذریعہ ملک کے ان مسائل کو حل کرنا ہے جن کے لئے سائنٹفک سوچ اور حقیقت پسندانہ جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر یہ ہندتو لیڈرشپ عجیب وغریب طور پر یہ سمجھتی ہے کہ اسکول کے بچے اگر وندے ماترم جیسے گیت روزانہ صبح کو گائیں یا ریڈیو اور ٹی وی پر ایک پیشہ ور گلوکار اس کو گا کر سنائے تو ملک

میں نیشنل اسپرٹ پیدا ہو جائے گی۔ حالانکہ یہ تصور خوش فہمی کی حد تک بے بنیاد ہے۔ صرف یہ ایک حقیقت اس مفروضہ کی تردید کے لئے کافی ہے کہ پچھلی نصف صدی سے یہ گانے اتنی زیادہ بار گائے گئے ہیں کہ شاید ملک کا کوئی بھی شخص نہیں جس کے کانوں تک یہ آواز نہ پہنچی ہو۔ اس کے باوجود نیشنل اسپرٹ کے اعتبار سے ہماری قوم دیوالیہ پن کی حد تک خالی ہو چکی ہے۔ وندے ماترم گانے والوں سے لے کر اس گیت کو سننے والوں تک تقریباً ہر ایک کی آج یہ حالت ہے کہ ذاتی مفاد اور ملک کے مفاد میں ٹکراؤ ہو تو وہ بلا تکلف ذاتی مفاد کی خاطر ملک کے مفاد کو نظر انداز کر دے گا۔ دیش بھکتی کے ان گیتوں نے عملاً قوم کو صرف خویش بھکت بنایا ہے، نہ کہ دیش بھکت۔

حقیقت یہ ہے کہ گیتوں اور بھاشنوں کے ذریعہ کبھی کسی قوم میں دیش بھکتی یا نیشنل اسپرٹ پیدا نہیں ہوتی۔ اس معاملہ میں عربی کا یہ مثل صادق آتا ہے کہ: **الناس علی دین ملوکهم** ۔ یعنی لیڈر لوگ جو روش اپناتے ہیں اسی روش کو عوام بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ ہمارے تقریباً تمام لیڈر کرپشن کلچر کو اپنائے ہوئے ہیں۔ ایسی حالت میں یہ ناممکن ہے کہ عوام محض گیتوں کی بنیاد پر اس کے علاوہ کسی اور کلچر کو اپنائیں۔ اس معاملہ میں سب سے پہلے خود مسٹر لیڈر کو حقیقی معنوں میں مسٹر کلین بننا پڑے گا۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ ملک میں صحت مند روایات قائم ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ صاف ستھرا ایڈمنسٹریشن ہی صاف ستھرا سماج بناتا ہے۔ جو لیڈر خود بھرشٹاچار میں ڈوبے ہوئے ہوں وہ بھرشٹاچار سے آزاد سماج کبھی نہیں بنا سکتے۔

اسی طرح ہندتو لیڈرشپ کے ایجنڈے میں اور جو چیزیں ہیں، وہ بھی ملکی تعمیر کے اصل مسئلہ سے غیر متعلق ہیں۔ انگریزی کی جگہ ہندی اور سنسکرت لانا، مسجد توڑنا اور مندر بنانا، دستور کی سیکولر دفعات کو ختم کرنا، علیحدہ پرسنل لا کی جگہ یکساں سول کوڈ نافذ کرنا، ہندستانیوں کے لئے انڈین کے بجائے ہندو کا لفظ رائج کرنا، وغیرہ۔ اس قسم کی تمام باتیں صرف کٹّر پن کی علامتیں ہیں۔ ان کا کوئی بھی تعلق ملک کے وسیع تر قومی مفاد سے نہیں۔

ہندتو ایجنڈے کے علم بردار ایک بے حد اہم حقیقت سے ناواقف ہیں۔ وہ یہ کہ ہندتو ایجنڈے

کے راستہ کی رکاوٹ ملک کا کوئی فرقہ یا گروہ نہیں ہے۔ بلکہ اس ایجنڈے کا اصل مخالف وقت کا عالمی سیلاب ہے۔ آج پوری کی پوری دنیا ہندتو سے مختلف ایک اور سماج کی طرف جارہی ہے۔ اس نئے عالمی سماج میں ہندتو کا کوئی مقام نہیں۔ حتیٰ کہ اگر نئے عالمی افکار کے نئے سیلاب کو نظر انداز کر کے اپنے ملک میں ایک علیٰحدہ جزیرہ بنانا چاہیں تو گلوبل ولیج کے اس دور میں وہ کبھی بننے والا نہیں۔ ایسی کوئی کوشش ایک چلتے ہوئے ہاتھی کی دم میں پتنگ باندھنے کے ہم معنیٰ ہے۔ اور یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ ایسی پتنگ کبھی ہاتھی کی دم میں نہیں بندھتی بلکہ وہ ہوا میں اڑ کر رہ جاتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ سوشلسٹ اکسپریس یا ہندتو اکسپریس دونوں میں سے کوئی بھی ملک کو اس کی منزل پر پہنچانے والی نہیں۔ ہم کو ہماری منزل مقصود تک جو ٹرین پہنچائے گی وہ صرف تعمیر اکسپریس ہے نہ کہ کوئی اور اکسپریس۔

تعمیر اکسپریس سے میری مراد یہ ہے کہ ملک میں تعلیم کو عام کیا جائے۔ فرقہ وارانہ نفرت کی باتیں ختم کی جائیں۔ سیاست میں ووٹ بینک بنانے کی پالیسی کو ترک کیا جائے۔ سرکاری دفتروں سے بھرشٹاچار کا خاتمہ ہو۔ حکومت اپنی پوری طاقت کو استعمال کر کے ملک میں بہترین انفراسٹرکچر وجود میں لائے۔ مذہب کو سیاست سے الگ رکھ کر لوگوں کو یہ موقع دیا جائے کہ وہ اپنے اپنے دائرہ میں جس مذہب کو چاہیں اختیار کریں، اور قومی پالیسی کو تمام تر سیکولرزم یا عمومی مفاد کی بنیاد پر قائم کیا جائے۔ دنیا کے جس ملک نے بھی ترقی کی ہے، اس نے اسی تعمیری منصوبہ کو اختیار کر کے ترقی کی ہے۔ ہندستان کو ایک ترقی یافتہ ملک بنانے کے لئے بھی اس کے سوا کوئی اور دوسرا طریقہ نہیں۔

تعمیرِ ہند

ہندستان اپنے رقبہ اور آبادی کے لحاظ سے دنیا کے ملکوں میں تیسرا سب سے بڑا ملک ہے۔ لیکن ترقی کے جدید معیار کے اعتبار سے وہ دنیا کے ملکوں میں ۱۳۸ ویں نمبر پر شمار کیا جاتا ہے۔ شہری سہولتوں کے اعتبار سے وہ دبئی اور سنگاپور جیسے انتہائی چھوٹے ملکوں سے بھی بہت پیچھے ہے۔ ہندستان کا یہ حال اس وقت ہے جب کہ اس کی آزادی پر ۵۰ سال سے بھی زیادہ مدت گزر چکی ہے۔

اس صورت حال کے بے شمار نقصانات ہیں۔ انھیں میں سے ایک بہت بڑا نقصان یہ ہے کہ ملک کے بہترین دماغ بڑی تعداد میں باہر چلے جارہے ہیں۔ ہر نوجوان یہ چاہنے لگا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح باہر کے ترقی یافتہ ملکوں میں پہنچ جائے کیوں کہ ہندستان میں رہ کر وہ ان ترقیاتی سہولتوں کو حاصل نہیں کرپاتا جو دور جدید کے ایک ترقی یافتہ ملک کے شہریوں کو حاصل ہیں۔

ترقی کی دوڑ میں ہندستان اس قدر پیچھے کیوں ہے۔ غالباً اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہندستان میں ابھی تک وہ چیز نہ آسکی جس کو جواہر لال نہرو نے نیشنل انٹگریشن کا نام دیا تھا۔ یعنی ملک کے مختلف گروہوں کے درمیان وہ اتحاد جو اس بات کو ممکن بناتا ہے کہ مختلف گروہ یکجہتی کے ساتھ باہم مل کر کام کریں۔

ہندستان کے مختلف گروہوں میں سے دو گروہ سب سے بڑے ہیں۔ ہندو اور مسلمان۔ انھیں دونوں گروہوں کے اتحاد پر ملک کے مجموعی اتحاد کا انحصار ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد ہو تو گویا کہ سارا ملک متحد ہو گیا۔ اور اگر ان دو بڑے گروہوں میں اتحاد نہ ہو تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک اختلاف اور انتشار کا شکار رہے گا، اور جو ملک اس طرح داخلی بے اتحادی کا شکار رہے وہ کبھی ترقی کے اعلیٰ درجہ تک نہیں پہنچ سکتا۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد کی اس اہمیت کو مہاتما گاندھی نے نہایت گہرائی کے ساتھ محسوس کیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۴۷ میں جب ملک آزاد ہوا تو انھوں نے اس کو اپنی زندگی کا واحد مشن بنا

لیا کہ ملک کے دونوں فرقے مل جل کر رہنے لگیں۔ اس وقت انھوں نے اپنے تاریخی الفاظ میں کہا تھا کہ اس ملک کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو امن کے ساتھ اور مل جل کر رہنا ہوگا ورنہ میں اس کوشش میں اپنی جان دے دوں گا:

Hindus and Musalmans should learn to live together in peace and amity. Otherwise, I should die in the attempt. (p. 449)

ہندستان کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے اسی خاص مقصد کے لئے نیشنل انٹگریشن کونسل بنائی۔ اس کے بعد اس مقصد کے لئے بے شمار کوششیں کی جاتی رہیں جن کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ مگر ۵۰ سال سے بھی زیادہ مدت گزرنے کے باوجود اس مقصد میں ابھی تک شاید ایک فی صد بھی کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ ہندو۔مسلم تعلقات کا معاملہ بدستور ایک بعید خواب بنا ہوا ہے اور اسی کے ساتھ ملک کی مطلوب ترقی بھی ایک بعید ترین خواب ہے۔

کیا وجہ ہے کہ اتنا زیادہ ضروری مقصد لمبی کوشش کے باوجود ابھی تک حاصل نہ کیا جاسکا۔ اس کی وجہ میرے نزدیک صرف ایک ہے، اور وہ ہے ایک ممکن چیز کو ناممکن طریقہ سے حاصل کرنے کی کوشش۔ ہوا سے آکسیجن کا حصول ہر آدمی کے لئے پوری طرح ممکن ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص آکسیجن کو اپنی ناک کے بجائے کان کے ذریعہ لینا چاہے تو یہ انتہائی ممکن چیز بھی اس کے لئے ناممکن ہو جائے گی۔

کوئی سماج، خواہ وہ ایک کلچر کا سماج ہو یا کئی کلچر کا سماج، اس میں ہمیشہ کچھ چیزیں لوگوں کے درمیان مشترک ہوتی ہیں اور کچھ چیزیں غیر مشترک۔ یہ فطرت کا ایک لازمی تقاضہ ہے۔ سماجی اتحاد در اصل انھیں دونوں تقاضوں کے درمیان ہم آہنگی کا فارمولا تلاش کرنے کا نام ہے۔ اسی فارمولے کے حصول یا عدم حصول پر اس معاملہ کا انحصار ہے۔

۱۹۴۷ سے لے کر اب تک اس رخ پر کی جانے والی کوششوں کی ناکامی کا اصل سبب یہی ہے کہ حقیقی اتحاد کا کوئی فارمولا ابھی تک دریافت نہ کیا جاسکا۔ اور جو فارمولا دریافت کیا گیا وہ سرے سے قابل عمل ہی نہ تھا۔

۱۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا فارمولا وہ ہے جس کی پشت پر مہاتما گاندھی، ڈاکٹر بھگوان داس،

ونوبا بھاوے جیسے بڑے بڑے لوگوں کے نام ہیں ۔اس فارمولے کو مختصر الفاظ میں مہاتما گاندھی نے اس طرح بیان کیا تھا: رام رحیم ایک ہے ۔ ان لوگوں نے یہ سمجھا کہ مذہبوں کا الگ الگ ہونا یہی علیٰحدگی کا ذہن پیدا کرتا ہے۔اس لئے اگر تمام مذہبوں کو ایک ثابت کردیا جائے تو یہ اختلاف اپنے آپ مٹ جائے گا۔اورلوگوں کے اندر وہ جذباتی ہم آہنگی پیدا ہوجائے گی جو مطلوب ہے۔

مگر یہ نظریہ اصل مسئلہ کا معصومانہ حد تک کمتر اندازہ تھا ۔ ان حضرات نے یہ کیا کہ مختلف مذاہب کی چند منتخب تعلیمات کو لے کر یہ سمجھ لیا کہ تمام مذاہب ایک ہیں ۔مگر مطالعہ کا یہ طریقہ یقینی طور پر غیر سائنٹفک ہے۔ کسی مذہب کے بارے میں کوئی رائے اس کی مجموعی تعلیمات کی روشنی میں قائم کی جائے گی نہ کہ صرف منتخب تعلیمات کی روشنی میں ۔اور جب مجموعی تعلیمات کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہندوازم اور اسلام میں کھلا ہوا اختلاف موجود ہے۔

مثلاً ہندو مذہب میں حقیقت اعلیٰ کے بارے میں وحدت وجود (monism) کا تصور ہے اور اسلام میں توحید (monotheism) کا۔ ہندوازم میں خدا کی تجسیم یا اوتار کا تصور ہے اور اسلام میں خدا کے فرستادہ پیغمبر کا تصور۔ ہندو مذہب میں انسانی زندگی کے بارے میں آواگمن کا تصور ہے اور اسلام میں پہلی ہی موت کے بعد جزا و سزا کا تصور، وغیرہ۔

اعتقادیات کا یہ فرق اتنا زیادہ بنیادی ہے کہ اگر مذکورہ فارمولے کو اتحاد کا وسیلہ سمجھا جائے تو مختلف مذہبی گروہوں کے درمیان کبھی بھی اتحاد ممکن نہ ہوگا۔ مہاتما گاندھی اور ان کے جیسے دوسرے لوگوں نے اتحاد کا جو فارمولا وضع کیا اس کو ایک لفظ میں باہمی اعتراف (mutual recognition) کا فارمولا کہا جاسکتا ہے۔مگر یہ فارمولا حقیقت پر مبنی نہیں، اس لئے وہ قابل عمل بھی نہیں۔

مذہب ایک مقدّس عقیدہ کا نام ہے، مذہب میں ترمیم ممکن نہیں ہوتی۔اس لئے ہمیں مذہب کو جیسا ہے ویسا (as it is) ہی ماننا ہوگا۔ ہمیں سماجی اتحاد کا ایک ایسا فارمولا دریافت کرنا ہوگا جو مذہبی تبدیلی کے بغیر قابل عمل اور قابل اختیار ہو۔

خوش قسمتی سے یہ قابل عمل فارمولا پیشگی طور پر ہمارے یہاں موجود ہے۔ اس دوسرے

فارمولے کو مختصر طور پر باہمی احترام (mutual respect) کا فارمولا کہا جاسکتا ہے۔ جن ترقی یافتہ ملکوں (مثلاً امریکا اور کناڈا) کے سماج میں اختلافات کے باوجود مذہبی جھگڑے نہیں ہیں وہاں اسی دوسرے فارمولے کو اختیار کرکے ان جھگڑوں کو ختم کیا گیا ہے۔ ان ملکوں میں بھی مختلف مذاہب کے لوگ موجود ہیں۔ مگر وہاں انھوں نے غیر ضروری طور پر یہ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی کہ میرا اور تمھارا مذہب ایک ہے۔ اس کے بجائے انھوں نے انگریزی مثل کے مطابق، اس اصول کو استعمال کیا کہ آؤ، ہم اس پر اتفاق کرلیں کہ ہمارے درمیان اختلاف ہے:

Let us agree to disagree

یہ فارمولا کوئی انوکھا فارمولا نہیں ۔ یہ فطرت کے اٹل اصول پر مبنی ہے ۔ وسیع تر مطالعہ بتاتا ہے کہ اس دنیا کے ہر شعبہ میں تعدد کا اصول ہے نہ کہ توحد کا ۔ اسی حقیقت کا اعتراف شری گروگولوالکر نے اپنے ایک انٹرویو میں ان الفاظ میں کیا تھا کہ فطرت یکسانیت سے نفرت کرتی ہے (Nature abhors uniformity)۔ سوامی وویکانند نے بھی اس حقیقت کا اعتراف اس طرح کیا کہ انھوں نے کہا کہ مذہبوں کے اختلاف کو مٹانا ممکن نہیں اس لئے تم کو ایسا کرنا چاہئے کہ ایک کی پیروی کرو اور کسی سے نفرت نہ کرو (follow one, and hate none)۔

اسی فطری اصول کو اہل مغرب نے اختیار کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے درمیان فوراً ہی سماجی اتحاد قائم ہوگیا اور وہ ترقی کی طرف تیزی سے سفر کرنے لگے۔ اگر وہ لوگوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے کہ میرا اور تمہارا مذہب ایک ہے تو اس کے بعد ان کے یہاں جو چیز آتی وہ باہمی اتحاد نہ ہوتا بلکہ وہ باہمی جھگڑا ہوتا۔ اور پھر وہ بھی اسی طرح ایک پس ماندہ ملک بنے رہتے جیسا کہ ہمارا ملک ہندستان ہے۔

اختلاف فطرت کا ایک اٹل اصول ہے۔ اختلافات کو ختم کرنا کسی کے لئے بھی ممکن نہیں۔ اس لئے سماجی اتحاد کا قابل عمل فارمولا صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے اختلاف کے باوجود اتحاد۔ جو لوگ اختلاف کو مٹا کر اتحاد قائم کرنا چاہتے ہیں وہ حقیقت سے لڑ رہے ہیں۔ اور حقیقت سے لڑ کر جیتنا کسی کے لئے بھی ممکن نہیں۔

۲۔اس سلسلہ میں دوسرا فارمولا وہ ہے جو گرو گولوالکر اوران کے ہم خیال لوگوں نے پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہندستان میں مختلف گروہوں کے درمیان اتحاد صرف اس وقت پیدا ہوسکتا ہے جب کہ ان کے اندر سچی حب الوطنی (patriotism) پیدا کی جائے۔ بجائے خود یہ بات درست ہے کہ حب الوطنی کا جذبہ کسی ملک کے باشندوں کے لئے اتحاد کا نہایت طاقتور ذریعہ ہے۔ لیکن حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے جو فارمولا گرو گولوالکر اوران کے جیسے لوگوں نے پیش کیا وہ دوبارہ ایک ناقابل عمل فارمولا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نصف صدی سے زیادہ مدت تک اس کی لفظی دھوم مچانے کے باوجود عملاً وہ کسی بھی درجہ میں کامیاب نہ ہوسکا۔

گرو گولوالکر اوران کے ہم خیال لوگوں کا کہنا ہے کہ سچا محبّ وطن صرف وہ ہوسکتا ہے جو ملک (بھارت) کو مقدّس سمجھے۔ ان کے نزدیک ہندو اس ملک کو مقدّس سمجھتے ہیں اس لئے وہی سچے محبّ وطن ہیں۔ مسلمان اپنے عقیدۂ توحید کی بنا پر کسی ملک کو مقدس نہیں سمجھتے اس لئے وہ سچے محبّ وطن نہیں بن سکتے۔ اس مسئلہ کا حل انھوں نے یہ بتایا کہ مسلمانوں کو بھی اسی معنی میں محبّ وطن بنایا جائے جس معنی میں ہندو محبّ وطن ہیں۔ اس کے بغیر ملک میں حب الوطنی کی صحیح فضا پیدا نہیں ہوسکتی۔

یہ نظریہ سراسر بے بنیاد ہے۔ وہ ایک خودساختہ مفروضہ پر قائم ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص کہے کہ اپنی ماں سے محبت صرف ہندو کرسکتا ہے۔ کیوں کہ وہ اپنی ماں کو ایک مقدّس دیوی کے روپ میں دیکھتا ہے۔ مسلمان چونکہ اپنی ماں کو مقدّس دیوی نہیں سمجھتا اس لئے وہ ماں سے محبت بھی نہیں کرسکتا۔ یہ بات بلاشبہ غلط ہے۔ اس لئے کہ ماں سے محبت ایک فطری جذبہ ہے جو ہر انسان کے اندر لازمی طور پر ہوتا ہے، خواہ وہ ایک مذہب کو ماننے والا ہو یا دوسرے مذہب کو ماننے والا۔ ماں سے محبت پیدا کرنے کے لئے اس کی ضرورت نہیں کہ کوئی شخص اس کے بیٹے اور بیٹی کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرے کہ تمھاری ماں ایک مقدس دیوی ہے۔ تم جب تک اس کو مقدّس دیوی نہیں مانو گے، تم اس سے محبت بھی نہیں کرسکو گے۔

ٹھیک یہی معاملہ وطن کا ہے۔ وطن سے محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو ہر انسان میں لازمی طور پر

ہوتا ہے۔ کسی آدمی کا نظریہ، یا مذہب خواہ کچھ بھی ہو وہ پیدائشی طور پر مجبور ہے کہ جہاں وہ پیدا ہوا اور جہاں وہ پلا بڑھا ہے، اس سے وہ محبت کرے۔ یہ محبت اپنے آپ آدمی کے دل میں ہوتی ہے، اس کے لئے کسی بیرونی کوشش کی ضرورت نہیں۔

دنیا میں تقریباً دو سو ملک پائے جاتے ہیں۔ ہر ملک کے لوگ اپنے ملک سے محبت کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب ذاتی انٹرسٹ اور ملکی انٹرسٹ میں ٹکراؤ ہو تو وہ اپنے انٹرسٹ کو پیچھے رکھتے ہیں اور ملکی انٹرسٹ کو آگے۔ حالانکہ ان میں سے کسی بھی ملک کے باشندے اپنے ملک کو دیوی دیوتا کا درجہ نہیں دیتے۔ یہی حبّ الوطنی کا عالمی اصول ہے۔ ہمیں بھی اسی اصول کو اختیار کرنا چاہئے۔ ہندستان میں ہم حبّ الوطنی کا کوئی الگ جزیرہ نہیں بنا سکتے۔ اس قسم کی غیر حقیقی کوشش ملک کو تباہ تو کرسکتی ہے مگر ملک کی ترقی میں وہ ہرگز معاون نہیں ہوسکتی۔

۳۔ اسی نظریہ کو کچھ لوگوں نے ایک خوبصورت نام دیا ہے جس کو وہ کلچرل نیشنلزم کہتے ہیں۔ یہ لوگ ہندستان کے اکثریتی فرقہ کے کلچر کو ملکی کلچر بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ملک کے تمام باشندوں کے لئے ضروری ہے کہ اس کلچر کو اختیار کریں ورنہ ملک میں نیشنل اسپرٹ پیدا نہیں ہو سکے گی۔

یہ نظریہ بھی سراسر غیر علمی اور غیر فطری ہے۔ وہ دنیا میں کہیں بھی رائج نہیں اور نہ ہندستان میں اس کو قائم کیا جا سکتا ہے۔

قومیت یا نیشن ہڈ کا تعلق صرف ہندستان سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق تمام ملکوں سے ہے۔ اس کا ایک متفقہ عالمی نظریہ ہے۔ ہمیں بھی اس معاملہ میں وہی اصول اختیار کرنا ہے جو عالمی سطح پر رائج ہے۔ اس معاملہ میں ہم خود ساختہ طور پر کوئی علیٰحدہ اصول اختیار نہیں کر سکتے۔

تمام قوموں کے متفقہ اصول کے مطابق، قومیت یا نیشن ہڈ کی بنیاد وطن (motherland) پر ہے۔ اسی اصول پر تمام دوسرے ملکوں میں قومیت کی تشکیل ہوئی ہے۔ ان ملکوں کے باشندوں میں نیشنل اسپرٹ پوری طرح موجود ہے۔ حتیٰ کہ شاید ہندستانیوں سے بہت زیادہ۔ گلوبل ولیج اور اقوام متحدہ کے اس دور میں ہم اپنا کوئی علیٰحدہ سیاسی گھروندا نہیں بنا سکتے۔ اور اگر بنانے کی کوشش کی گئی تو اس

کے لئے پیشگی طور پر مقدر ہے کہ وہ ناکام ہوکر رہ جائے۔ اس نظریہ کے ماننے والوں کی کوشش یہ ہے کہ وہ ملک کے تمام باشندوں کو سرسوتی دیوی کی وندنا کرائیں اور اسکول کے تمام طلبہ کو وندے ماترم کے گیت میں شامل کریں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح اس کلچرل نیشنلزم کو لانے میں مدد ملے گی جس کے بغیر ان کے نزدیک ہندستان میں قومیت کی تشکیل ممکن نہیں۔

یہ بھی بلاشبہہ ایک بے بنیاد مفروضہ ہے۔ مثال کے طور پر سرسوتی کو علم کی دیوی سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ سرسوتی کی وندنا سے علم اور تعلیم کو فروغ حاصل ہوگا۔ مگر واقعات اس کی کامل تردید کرتے ہیں۔ ہندستان میں سرسوتی کا گیت پچاس سال سے بھی زیادہ مدت سے گایا جارہا ہے۔ مگر یہاں ابھی تک کوئی قابل لحاظ علمی ترقی نہ ہوسکی۔ اس کے برعکس دور جدید کے وہ ممالک جن کو ترقی یافتہ ممالک کہا جاتا ہے وہاں کے اسکولوں اور تعلیم گاہوں میں کسی علم کی دیوی کا گانا نہیں گایا جاتا۔ پھر بھی وہ ہم سے اتنا زیادہ آگے ہیں کہ ہم شاید ان کے پیچھے بھی نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ سرسوتی یا وندے ماترم مذہبی عقیدہ کی چیزیں ہیں۔ ان کا دنیوی شعبوں سے کوئی تعلق نہیں۔ کوئی شخص یا گروہ ذاتی عقیدہ کے طور پر ان کو اختیار کرسکتا ہے مگر وسیع تر اجتماعی زندگی میں ان کو داخل کرنا اور تمام لوگوں پر ان کو نافذ کرنے کی کوشش کرنا غیر فطری بھی ہے اور ناممکن بھی۔ اس طرح کی کوشش کا کوئی فائدہ تو نہیں ہوگا، البتہ جھگڑوں میں اضافہ کرکے اصل مطلوب مقصد کا حصول مزید دشوار ہوجائے گا۔

اگر ہم ہندستان کو ایک ترقی یافتہ ملک بنانا چاہتے ہیں تو اس کی واحد صورت یہ ہے کہ مذہبی عقیدہ کو لوگوں کا انفرادی معاملہ قرار دے کر ہر ایک کو اس کی آزادی دے دی جائے۔ اور جہاں تک اجتماعی معاملات کا تعلق ہے اس کو سیکولر بنیاد پر قائم کیا جائے۔ دوسرے ترقی یافتہ ملکوں نے اسی اصول کو اختیار کرکے ترقی کی ہے۔ ہندستان بھی اسی اصول کی بنیاد پر ترقی کرسکتا ہے۔ اس کے سوا دوسرا کوئی بھی راستہ مفید یا قابل عمل نہیں۔

وندے ماترم، سرسوتی کا گیت یا اس طرح کی اور چیزیں کسی مذہب کے خلاف ہوں یا نہ ہوں،

مگر یہ یقینی ہے کہ وہ ترقی کے خلاف ہیں۔وہ مستقبل کی مطلوب تعمیر میں فیصلہ کن رکاوٹ ہیں۔ ہمارے موجودہ لیڈروں کے لئے عقل مندی یہ ہے کہ وہ اس قسم کی چیزوں کو اپنے ذاتی عقیدہ تک محدود رکھیں۔ان کو ملک کی قومی زندگی یا اجتماعی شعبوں میں داخل کرنے پر اصرار نہ کریں۔اگر انھوں نے خود سے ایسا نہ کیا تو ملک کی اگلی نسلیں جبراً ان چیزوں کو پیچھے دھکیل دیں گی۔وہ ان کو چھوڑ کر خالص سیکولر بنیاد پر ملک کی تعمیر کریں گی۔کیونکہ ترقی اس ملک کے ہر انسان کا سب سے بڑا مطلوب ہے۔اور ایسی مطلوب چیز کے بارے میں انسان کبھی سمجھوتہ کرنے پر راضی نہیں ہوتا۔

یہ واقعہ مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں میں ہو چکا ہے۔وہاں کا مذہبی طبقہ پہلے اپنے مذہبی رسومات وعقائد کو سیکولر شعبوں سے جوڑے ہوئے تھا۔اس کے نتیجے میں ان کی ترقی صدیوں تک رُکی رہی یہاں تک کہ وہاں کے عوام نے بغاوت کر کے ان مذہبی زنجیروں کو توڑ دیا۔اس کے بعد ترقی کی طرف ان کا سفر بے روک ٹوک شروع ہو گیا۔

یہ باغیانہ تحریک ہندستان میں بھی شروع ہو چکی ہے۔اس کی ایک علامتی مثال یہ ہے کہ ہماری نئی نسل جو اسکولوں اور کالجوں میں پڑھ رہی ہے وہ نمستے یا نمسکار کہنے کے بجائے ہائے اور ہیلو کہنے لگی ہے۔ایسی حالت میں ہندستانی لیڈروں کو چاہیے کہ وہ اس تبدیلی کو اختیارانہ طور پر قبول کر لیں جس کو انھیں مستقبل میں مجبورانہ طور پر قبول کرنا پڑے گا، کیونکہ عوامی بغاوت کا مقابلہ کرنے کی طاقت کسی کے اندر بھی نہیں۔

آخری بات

۱۹۴۷ سے پہلے ہندستان کی سیاسی آزادی کی جو پر جوش تحریک اٹھی، اس کے ساتھ کس قسم کی بڑی بڑی امیدیں شامل تھیں اور کیسے رومانی خیالات کے سایہ میں وہ آگے بڑھ رہی تھی، اس کا اندازہ ایک شعر سے ہوتا ہے۔ایک شاعرِ انقلاب کا یہ شعر اس زمانہ میں ہر گاؤں اور ہر شہر میں گونج رہا تھا:

آج ہمالیہ کی چوٹی سے پھر ہم نے للکارا ہے   دور ہٹو اے دنیا والو ہندستان ہمارا ہے

مگر آزادی ملنے کے بعد جلد ہی یہ سارا جوش وخروش جاتا رہا۔آج ملک کے اہل فکر عام طور پر

یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہماری ہمالیائی تحریک نے ملک سے بیرونی قوم کے سیاسی غلبہ کو تو ختم کیا مگر اس کے جلد ہی بعد بیرونی قومیں اپنی تہذیبی برتری اور اقتصادی طاقت کی بنا پر دوبارہ ہندستان میں داخل ہوگئیں۔ آج ہر شعبہ میں دوبارہ انھیں کا غلبہ قائم ہوگیا ہے۔ دستوری اعتبار سے ملک کی قومی زبان ہندی ہے مگر عملی طور پر ملک میں جس زبان کا رواج ہے وہ ہندی نہیں ہے بلکہ انگریزی ہے۔

اسی طرح آج ہندستان کے سماج میں مغربی کلچر تیزی سے چھاتا جارہا ہے۔ یہاں کی مارکیٹ پر بیرونی کمپنیاں اپنی برتر حیثیت کے ساتھ داخل ہوگئی ہیں۔ یہاں کا پریس اور یہاں کا میڈیا ان کا خادم بنتا جارہا ہے۔ حتیٰ کہ یہاں کی سیاست بھی بالواسطہ طور پر انھیں کے زیر اثر کام کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

یہ المناک واقعہ ہندستانی لیڈر شپ کی ایک عظیم کوتاہی کو بتاتا ہے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے یہ لوگ ملک کے مسئلہ کو ہندستانی ورسس انگریز (ہندستانی بمقابلہ انگریز) کا مسئلہ سمجھ رہے تھے۔ وہ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ انگریزوں کے سیاسی اقتدار کا خاتمہ ملک کی عظمت کو قائم کرنے کے ہم معنٰی ہوگا۔ مگر اصل حقیقت کے اعتبار سے یہ مسئلہ ہندستان ورسس برٹش راج نہ تھا بلکہ وہ ہندستان ورسس عالمی سیلاب تھا۔ پہلے تصور کے تحت یہ مسئلہ بظاہر طاقتور ہندستان کے مقابلہ میں کمزور انگریز کا مسئلہ تھا۔ مگر دوسرے پہلو سے یہ مسئلہ کمزور ہندستان بمقابلہ طاقتور عالمی سیلاب بن گیا۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ۱۹۴۷ میں نشانہ کے مطابق، سیاسی آزادی حاصل کرنے کے باوجود ہندستان بدستور بیرونی طاقتوں کے مقابلہ میں مغلوب بنا ہوا ہے۔

یہی معاملہ اس مسئلہ کا بھی ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا۔ قدیم مسئلہ کو ایک لفظ میں آزادی سے تعبیر کیا گیا تھا، اب جدید مسئلہ کو ایک لفظ میں ہندتو سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ مگر ہندتو آندولن کی لیڈر شپ دوبارہ وہی غلطی کررہی ہے جو آزادی آندولن کی لیڈر شپ نے کی تھی۔

ہماری قدیم لیڈر شپ نے معاملہ کو دو ایسے فریقوں کے درمیان کا معاملہ فرض کرلیا تھا جس میں وہ بظاہر طاقتور دکھائی دے رہے تھے اور فریق ثانی کمزور نظر آتا تھا، جب کہ معاملہ اس کے برعکس

تھا۔اسی طرح ہندتو لیڈرشپ اپنے معاملہ کو ہندو ورسس مسلم معاملہ سمجھ رہی ہے۔

اس تقسیم میں اس کو یہ سارا معاملہ اکثریتی فرقہ اور اقلیتی فرقہ کے درمیان کا معاملہ نظر آتا ہے۔ اس تقسیم کے تحت وہ سمجھتے ہیں کہ ہم طاقتور پوزیشن میں ہیں اور ہماری کامیابی یقینی ہے۔ مگر اصل واقعہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ دوبارہ ہندستان ورسس عالمی زمانی سیلاب کا ہے۔ یعنی یہ ہندستان کے قدیم کلچر اور جدید سائنٹفک کلچر کے درمیان کا معاملہ ہے۔ اس معاملہ میں یقینی طور پر ہندتو آندولن فریق ثانی کے مقابلہ میں بے حد کمزور ہے۔ اس معاملہ میں عالمی دھارے کی حیثیت اگر سیلاب کی ہے تو ہندتو دھارے کی حیثیت محض ایک تنکے کی۔ یہ یقینی ہے کہ اس جدید مقابلہ میں ہندتو لیڈرشپ اس سے بھی زیادہ کمزور ثابت ہوگی جتنا کہ قدیم مقابلہ میں آزادی کی لیڈرشپ ثابت ہوئی تھی۔

یہ تاریخ کا فیصلہ ہے، اور تاریخ کے فیصلہ کو بدلنا کسی بھی شخص کے لئے ممکن نہیں، خواہ وہ کوئی لیڈر رہو یا کوئی حکومت۔

پیغامِ عمل

آزادی کے بعد ہندستان میں جو نئے مسائل پیدا ہوئے ان میں سے غالباً سب سے زیادہ سنگین مسئلہ یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان وہ انٹرایکشن (ملنا جلنا) تقریباً ختم ہوگیا جو آزادی سے پہلے کے دور میں بڑے پیمانے پر جاری تھا۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ ملک کے دونوں بڑے فرقے ان مواقع سے محروم ہوگئے جب دونوں کے درمیان نارمل فضا میں اختلاط ہو اور دونوں ایک دوسرے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نئے ہندستان کی فضا میں تعمیر کے لئے متحدہ کوشش کرسکیں۔ یہ بلاشبہ بے حد سنگین واقعہ تھا اور اس کے دوررس نتائج برآمد ہوئے۔

آزادی کے بعد ملک میں ایک نئی بات یہ ہوئی کہ ہندوؤں کے وہ انتہا پسند طبقے ابھر آئے جو اس سے پہلے بڑی حد تک دبے ہوئے تھے۔ یہ واقعہ ہندو۔مسلم اتحاد کی راہ میں فیصلہ کن رکاوٹ بن گیا۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے دھارے ایک دوسرے سے بڑی حد تک الگ ہوگئے۔ اس کا نقصان بیک وقت دونوں فرقوں کو پہنچا، ہندوؤں کو بھی اور مسلمانوں کو بھی۔

نئے ہندستان میں جب مسلمانوں کا معاملہ ہندوؤں سے پیش آیا تو انھوں نے محسوس کیا کہ یہاں دو قسم کے ہندو پائے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کی نسبت سے ان دونوں قسم کے ہندوؤں کو الگ الگ نام دیا جائے تو وہ یہ ہوگا — نو پرابلم ہندو (بے مسئلہ ہندو) اور پرابلم ہندو (بامسئلہ ہندو)۔ مسلمانوں نے محسوس کیا کہ نو پرابلم ہندوؤں سے تو وہ باآسانی ملنے جلنے کا سلسلہ قائم رکھ سکتے ہیں، مگر پرابلم ہندو سے بظاہر اس قسم کا سلسلہ قائم رکھنا موجودہ حالت میں سخت مشکل ہے۔

آزادی کے بعد مسلمانوں کے درمیان جو قیادت ابھری اس نے اس مسئلہ کا حل یہ سمجھا کہ نو پرابلم ہندوؤں سے تعلقات بڑھائے جائیں اور ان کو لے کر پرابلم ہندوؤں کا مقابلہ کیا جائے۔ اس نظریہ کے تحت مسلمانوں میں کئی قیادتیں ابھریں اور کئی تحریکیں اور تنظیمیں برپا ہوئیں۔ ان شخصیتوں اور تحریکوں کے پرشور عمل کا سلسلہ تقریباً چالیس سال تک جاری رہا۔ مگر نتیجہ بالکل برعکس نکلا۔ بیسویں

صدی کے آخر میں پہنچ کر پرابلم ہندوؤں نے ۱۹۴۷ کے مقابلہ میں سوگنا زیادہ طاقت حاصل کرلی۔ وہ ملک کے اکثر اجتماعی اداروں میں داخل ہوگئے۔ انھوں نے مرکزی اور ریاستی سطح پر اپنی حکومت بنالی، وغیرہ۔

نو پرابلم ہندوؤں کو لے کر پرابلم ہندوؤں کا مقابلہ کرنا، ایک غیر فطری اور غیر حکیمانہ نظریہ تھا۔ یہ ایک منفی نقطۂ نظر ہے، اور منفی نقطۂ نظر کے تحت کی ہوئی کوئی بھی کوشش کبھی مثبت نتائج پیدا نہیں کرسکتی۔ مثبت نتیجہ ہمیشہ مثبت جدوجہد کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے نہ کہ منفی جدوجہد کے ذریعہ۔

اس نقطۂ نظر کا مزید نقصان یہ ہوا کہ ہندستان کے مسلمان عملاً اس ملک میں ایک احتجاجی گروہ بن کر رہ گئے۔ مذکورہ نقطۂ نظر عین اپنی فطرت کے مطابق، احتجاج اور شکایت کا ذہن پیدا کرتا ہے۔ اور یہی مسلمانوں کے ساتھ ہوا۔ ان کا ہر اخبار ایک احتجاج نامہ بن گیا۔ ان کے جلسے احتجاجی جلسوں میں تبدیل ہوگئے۔ ان کے درمیان ایسے لوگ قائد بن کر ابھرنے لگے جو اپنے پرشور الفاظ کے ذریعہ مسلمانوں کی احتجاجی نفسیات کو تسکین دے سکتے تھے۔

احتجاج یا شکایت، دل کی بھڑاس نکالنے کا دوسرا نام ہے۔ نئے ہندستان میں یہاں کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ نہیں تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے دل کی بھڑاس نکالیں، وہ اپنے اندر پائے جانے والے غم وغصہ کے لئے ایک لفظی نکاس (outlet) پالیں۔ اس ملک میں مسلمانوں کو ایک تخلیقی کردار (creative role) ادا کرنا تھا۔ اور ملک کی قسمت بنانے میں اپنا وہ تاریخی حصہ ادا کرنا تھا جو قانون فطرت کے تحت کسی زندہ اقلیت کے لئے مقدر ہے۔

انگریز مورخ آرنلڈ ٹوائن بی نے اپنی کتاب (اسٹڈی آف ہسٹری) میں اقلیتوں کے اس رول کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ یہی بات قرآن میں اس طرح بتائی گئی ہے ـــــ کتنی ہی چھوٹی جماعتیں اللہ کے اذن سے بڑی جماعتوں پر غالب ہوئی ہیں۔ اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ (البقرہ ۲۴۹)

اس آیت میں اذن سے مراد قانون فطرت ہے جو اللہ نے اپنی حکمت کے تحت اس دنیا میں

قائم فرمایا ہے۔ وہ قانون یہ ہے کہ جب بھی کوئی اقلیتی گروہ کا مقابلہ کسی اکثریتی گروہ سے پیش آتا ہے تو اس کے بعد لازماً ایسا ہوتا ہے کہ اقلیتی گروہ کے اندر وہ اعلیٰ صفت پیدا ہوتی ہے جس کے مجموعہ کا نام قرآنی اصطلاح میں صبر ہے۔ یعنی چیلنج کا بلند تر سطح پر جواب دینے کا جذبہ پیدا ہونا۔ اس طرح چیلنج اور رسپانس کا میکانزم اقلیتی گروہ کے اندر نئی اور تخلیقی صفات پیدا کرتا ہے۔ وہ مسائل کا برتر حل دریافت کرتا ہے۔ یہ عمل جاری رہتا ہے یہاں تک کہ اقلیت خود بھی کامیاب ہوتی ہے اور پورے سماج کے لئے بھی زندگی کا نیا تحفہ دینے کا سبب بن جاتی ہے۔

پیش آمدہ مسائل کا جواب اگر منفی انداز میں دیا جائے تو اسی کا نام بے صبری ہے۔ اور اگر پیش آمدہ مسائل کا جواب مثبت انداز میں دیا جائے تو اسی کو قرآن کی اصطلاح میں صبر کہا گیا ہے۔ منفی عمل کا مثبت جواب دینا، یہی تخلیقیت کا اہم ترین عنصر ہے۔ اور یہی وہ خاص صفت ہے جو کسی اقلیتی گروہ کو اکثریتی گروہ سے بھی زیادہ بڑا کردار ادا کرنے کے قابل بنا دیتی ہے۔

اب پہلا سوال یہ ہے کہ اس ملک کے مسلمان اس تاریخی کردار کو ادا کرنے کے لئے کیا کریں جو ان کے لئے فطرت کے قانون کے تحت مقدر ہے۔ اس سلسلہ کا پہلا اور ضروری کام وہی ہے جس کا اوپر ذکر ہوا۔ یعنی مسلمان اپنی احتجاجی سیاست کو ختم کر دیں اور اس کے بجائے مثبت تعمیری سیاست کا طریقہ اختیار کریں۔

ہندستان کے مسلمان اس وقت جس مقام پر ہیں اس کو ایک لفظ میں فریاد اور شکایت کا مقام کہا جا سکتا ہے۔ پچاس سال سے زیادہ مدت تک اس طرز کی پالیسی کو اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں مسلسل مدافعت کی زبان بولنی پڑی۔ ان کا کیس اس ملک میں ''مظلومانہ فریاد'' کا کیس بن گیا۔ جو گروہ اس قسم کی نفسیات میں مبتلا ہو وہ کبھی کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دے سکتا۔ بڑا کارنامہ انجام دینے کے لئے اقدامی نفسیات درکار ہوتی ہے نہ کہ مدافعانہ نفسیات۔

خوش قسمتی سے اس ملک میں وہ اسباب اور مواقع پوری طرح موجود ہیں جو مسلمانوں کو مدافعانہ مقام سے اٹھا کر اقدامی سطح پر پہنچا دیں۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کو صرف یہ کرنا

ہے کہ وہ مواقع کو جانیں اور ان کو بھر پور طور پر استعمال کریں۔

مسلمانوں کو مظلومانہ پوزیشن سے اٹھ کر اقدامی پوزیشن تک پہنچنے کے لئے کیا کرنا ہے۔اس سلسلہ میں پہلا کام یہ ہے کہ اس رکاوٹ کو درمیان سے ہٹا دیا جائے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے بڑے پیمانہ پر میل جول میں حائل ہیں ۔ وہ ہے ملک کی اجتماعی سرگرمیوں میں بھارتیہ سنسکرتی کو غیرضروری طور پر داخل کرنا ۔مسلمانوں کو یہ کرنا ہے کہ وہ پُر امن اور حکیمانہ جدوجہد کے ذریعہ برادران وطن کو اس پر راضی کریں کہ وہ اپنی قدیم سنسکرتی کو صرف اپنے ذاتی دائرے میں محدود رکھیں، وہ اس کو اجتماعی پروگراموں یا سماجی سرگرمیوں میں دخیل نہ کریں۔جس دن ایسا ہوگا اسی دن اپنے آپ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان انٹرایکشن بڑھ جائے گا اور وہ مشترکہ جدوجہد وجود میں آجائے گی جس میں دونوں فرقے مل کر ہندستان کی تعمیر میں اپنا حصہ ادا کریں۔

جب یہ واقعہ پیش آئے گا تو اس کے بعد خود قانون فطرت کے تحت ایسا ہونے لگے گا کہ جو مسلمان کے پاس ہے وہ اس کو ہندوؤں تک پہنچائیں گے اور جو ہندوؤں کو حاصل ہے اس کے ثمرات مسلمانوں تک پہنچنے لگیں گے۔اس مشترکہ عمل کے نتیجہ میں اپنے آپ ایک نیا کلچر ابھرے گا، نئی زندگی تشکیل پائے گی۔اس کے بعد اپنے آپ ایک نیا نظام بنے گا جو ہندو اور مسلمان دونوں کے لئے مفید ہوگا۔

اس تاریخی عمل کو ظہور میں لانے کے سلسلہ میں دونوں ہی فرقوں کی اہم ذمہ داریاں ہیں۔ ہندو فرقہ کو یہ جاننا ہوگا کہ وہ کسی انسانی گروہ سے تو لڑسکتا ہے مگر وہ فطرت سے نہیں لڑسکتا۔ بھارتیہ سنسکرتی کو ملک کی اجتماعی زندگی میں شامل کرنے کا منصوبہ اصلاً کسی انسانی گروہ کے خلاف نہیں۔ وہ فطرت اور تاریخ اور عالمی رجحان کے خلاف ہے۔اس بنا پر وہ یقینی طور پر ناقابل عمل ہے۔

میں ایک بار مہاراشٹر کے ایک شہر میں گیا۔ وہاں ایک ہندو اور ایک مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ دونوں کے درمیان پہلے دوستی تھی ، اس کے بعد دونوں میں ایک خاص مسئلہ میں نزاع ہوگئی۔ مہینوں کی کوشش کے باوجود جب یہ نزاع ختم نہ ہوئی تو ہندو نے مسلمان سے کہا کہ آؤ، ہم اپنے

اختلاف کو بازو میں رکھ دیں اور بقیہ امور میں مل جل کر کام کریں۔ اسی قسم کا ایک قصہ بمبئی میں پیش آیا۔ یہاں ایک مسلمان اور ایک یہودی کے درمیان تجارتی اشتراک ہوا۔ یہودی نے پہلے ہی دن اپنے مسلم پارٹنر سے کہا کہ دیکھو میرے اور تمھارے درمیان تجارتی معاملات میں کوئی اختلاف نہیں۔ البتہ ایک مسئلہ ایسا ہے جس میں میرے اور تمھارے درمیان اتفاق نہیں، وہ اسرائیل کا مسئلہ ہے۔ میں اور تم دونوں یہ طے کرلیں کہ ہم اسرائیل کے مسئلہ پر کبھی بات نہیں کریں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور یہودی اور مسلمان کا یہ تجارتی اشتراک نہایت کامیاب رہا۔

ہندستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو وسیع تر اعتبار سے اسی فارمولے کو اختیار کرنا ہے۔ دونوں کے درمیان یہ امر مشترک ہے کہ ہندستان کو ایک ترقی یافتہ ملک بنایا جائے۔ اس کے بعد جو چیز اختلاف کی ہے وہ صرف یہ ہے کہ اس تعمیری عمل میں غیر ضروری طور پر بھارتیہ سنسکرتی کو شامل کیا جائے۔ اب ہندو فرقہ کو یہ کرنا ہے کہ وہ بھارتیہ سنسکرتی کو اپنے ذاتی دائرہ تک محدود رکھے۔ اس معاملہ میں ہندو فریق اگر اس تفریق پر راضی ہو جائے تو اس کے بعد متحدہ عمل کے لئے تمام دروازے پوری طرح کھل جائیں گے۔

ایسا ہونا بے حد ضروری ہے۔ اس کے بغیر ہندو-مسلم تعلقات صرف نو پرابلم ہندوؤں تک محدود ہو کر رہ جائیں گے۔ وہ پرابلم ہندوؤں تک وسیع نہ ہو سکیں گے۔ جب کہ پرابلم ہندوؤں کو شریک کئے بغیر ملکی تعمیر کی کوئی بڑی جدوجہد زیر عمل نہیں لائی جاسکتی۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، انھیں بھی صرف ایک کام کرنا ہے۔ وہ یہ کہ ہندستان میں ہندو فرقہ اکثریت میں ہے۔ اس بنا پر فطری طور پر ایسا ہوتا ہے کہ کچھ معاملات پیش آتے ہیں جن کو اب تک تعصب اور زیادتی کی اصطلاحوں میں بیان کیا جاتا رہا ہے۔ اس طرح کے واقعات ہر سماج میں اور ہمیشہ پائے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کو یہ کرنا ہے کہ وہ ان واقعات کو چیلنج کے روپ میں لیں۔ وہ ان کو کسی مخصوص فرقہ کی کارروائی سمجھنے کے بجائے فطرت کے نظام کے تحت پیش آنے والا واقعہ سمجھیں۔

مطالعہ بتاتا ہے کہ کسی واقعہ کو ظلم سمجھنے سے شکایت کا مزاج بنتا ہے۔ اس کے برعکس جب واقعہ کو چیلنج سمجھا جائے تو خود فطری قانون کے تحت ایسا ہوتا ہے کہ انسان کی صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ اس کی خفیہ قابلیت (latent potential) ظہور میں آنے لگتی ہے۔ پہلے اگر وہ صرف ایک انسان تھا تو اب وہ سپر انسان (superman) بن جاتا ہے۔ اس طرح وہ اس قابل بن جاتا ہے کہ اپنی بڑھی ہوئی استعداد کے ساتھ چیلنج کا مقابلہ کر کے کامیابی سے دوچار ہو۔

یہی وہ مخصوص مقام ہے جہاں لمبے تاریخی عمل کے بعد ہندو اور مسلمان دونوں پہنچے ہیں۔ اب بہترین عقل مندی یہ ہے کہ بیسویں صدی کے خاتمہ کے ساتھ قدیم غیر فطری پالیسی کو ختم کر دیا جائے۔ تاکہ جب آنے والی صدی کا سورج طلوع ہو تو وہ ہمارے لئے ایک نئے اور بہتر ہندستان کی خوش خبری کے ہم معنٰی بن جائے۔

ایک سیاسی جائزہ

۱۹۴۷ سے پہلے ہندستان میں مسلم قائدین نے جو تحریکیں چلائیں وہ وسیع تر تقسیم میں دو تھیں۔ ایک کو عام فہم زبان میں اتحاد ہند کی تحریک اور دوسری کو تقسیم ہند کی تحریک کہہ سکتے ہیں۔ بظاہر یہ دونوں تحریکیں ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ دونوں کے اندر ایک مشترک خامی موجود تھی ۔اور وہ تھی حقیقی حالات کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ نہ کرنا۔

جن قائدین نے اتحاد ہند کی تحریک چلائی وہ سارے معاملہ کو انگریز اور ہندستانی کا مسئلہ سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سارے مسئلہ کی جڑ انگریز ہے۔ ہندو اور مسلمان دونوں ایک جان دو قالب ہیں۔ ان کے درمیان جھگڑے کا کوئی امکان ہی نہیں۔ یہ صرف انگریز ہیں جنھوں نے ایک کو دو میں بانٹ کر لڑا رکھا ہے۔ اسی تصور کو اقبال احمد سہیل نے ۱۹۴۷ سے پہلے ان الفاظ میں نظم کیا تھا۔

یوں شیشہ و ساغر ٹکرائیں منہ دیکھتے میکش رہ جائیں
اس فن کو جہاں میں اور کوئی جز ساقیٔ دانا کیا جانے

یہ اصل صورت حال کا نہایت سرسری اندازہ تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز ہی میں مختلف اسباب سے برادران وطن میں ہندو انتہا پسندی کی تحریک شروع ہوگئی تھی جو دن بدن طاقتور ہوتی چلی گئی۔ ۱۹۴۷ سے پہلے یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد یقینی طور پر مسلمانوں کو ایک شدید تر خطرہ پیش آئے گا۔ یہ ہندو قوم پرستی یا ہندو انتہا پسندی کا خطرہ تھا۔

مگر اتحاد پسند مسلم قائدین نے اس خطرہ کے مقابلہ کے لئے کوئی تیاری نہیں کی۔ حتیٰ کہ انھوں نے یہ بھی نہیں کیا کہ مسلمانوں کو پیشگی طور پر اس خطرہ سے آگاہ کر دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۴۷ کے بعد جب مسلمانوں کو یہ خطرہ پیش آیا تو وہ صرف احتجاج یا منفی ردّعمل کے درجہ میں اپنی کارروائیاں کرتے رہے۔ انھوں نے اس خطرہ کے مقابلہ میں نہ تو کوئی گہری منصوبہ بندی کی اور نہ اس کے مقابلہ میں وہ کوئی حقیقی عملی تدبیر کر سکے۔

ہندستان میں سماجی اتحاد کے لئے سیکولر فارمولا استعمال کرنا تھا۔ مگر اصل صورت حال یہ تھی کہ یہاں مختلف مذہبی گروہ موجود تھے اور ہر گروہ کے لیڈروں نے ان کے اندر پرشور طور پر یہ مزاج بنایا تھا کہ —— میں ہندو ہوں، میں مسلمان ہوں، میں سکھ ہوں، میں عیسائی ہوں، وغیرہ۔ اس طرح یہاں کا مذہبی طبقہ شدت کی حد تک اس احساس میں مبتلا تھا کہ ہم ایک الگ مذہبی گروہ ہیں اور یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی علیٰحدہ شناخت (identity) کو سختی کے ساتھ قائم رکھیں۔

اس طرح کے سماج میں سیکولرزم کا اتحادی فارمولا کامیاب نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کی کامیابی کی لازمی شرط یہ تھی کہ یا تو لوگوں کے اندر گروہی تفریق کے مزاج کو ختم کیا جائے یا ان کے اندر یہ ذہن بنایا جائے کہ اپنی علیٰحدہ مذہبی حیثیت کو باقی رکھتے ہوئے انھیں دوسروں کا بھی پورا احترام کرنا چاہئے۔ مگر ذہنی اور فکری تربیت کا یہ کام انجام نہیں دیا گیا۔ صرف نعروں اور تقریروں کے ذریعہ یہ امید کرلی گئی کہ لوگوں کے درمیان سیکولر اتحاد قائم ہوجائے گا۔ حقیقی حالات کے اعتبار سے یہ ناممکن تھا اس لئے وہ حاصل بھی نہ ہوسکا۔

یہی معاملہ نئے مسلم ملک (پاکستان) میں ایک اور شکل میں پیش آیا۔ جس خطہ میں پاکستان بنا وہاں مختلف بنیادوں پر زبردست گروہی احساسات موجود تھے۔ یہاں کے لوگ انھیں احساسات میں جی رہے تھے۔ میں بنگالی ہوں، میں پنجابی ہوں، میں سندھی ہوں، میں بلوچی ہوں، میں سنی ہوں، میں شیعہ ہوں، وغیرہ۔

ان تفریقی احساسات کو ختم کرنے یا ان کو غیر موثر بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ البتہ یہ کوشش کی گئی کہ نعروں اور تقریروں کی دھوم کے ذریعہ اسلام کو پورے ملک کے لئے اتحاد کی اساس بنادیا جائے۔ عالم اسباب میں ایسا ہونا ممکن نہ تھا اس لئے وہ کامیاب بھی نہیں ہوا۔

اسلام بلاشبہ انسانوں کو متحد کرنے کی طاقت رکھتا ہے مگر اسلام کی یہ کرامت اسی وقت ظاہر ہوسکتی ہے جب کہ لوگوں کے دلوں اور دماغوں میں اسلام کو پوری طرح اتار دیا جائے۔ خارجی نعروں اور اوپری تقریروں کے ذریعہ یہ مقصد کبھی حاصل نہیں ہوسکتا۔

جہاں تک تقسیم ہند کے حامی قائدین کا تعلق ہے وہ بھی اسی طرح کے بھرم میں مبتلا رہے۔ انھوں نے سمجھا کہ سارا معاملہ ہندو قوم اور مسلم قوم کے باہمی اختلاف کا ہے۔ اور اس کا آسان حل یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جغرافی تقسیم کردی جائے۔ جب ہندو الگ ہوگا اور مسلمان الگ تو اپنے آپ تمام جھگڑے ختم ہو جائیں گے۔

مگر یہ اصل صورت حال کا ایک غیر حقیقی اندازہ تھا۔ حقیقی حالات کے اعتبار سے اصل صورت حال یہ تھی کہ تقسیم کا نتیجہ صرف یہ نکلے کہ جو مسائل پہلے ہندو اور مسلمان کے درمیان تھے وہ تقسیم کے بعد نئے مسلم ملک میں مسلم اور مسلم کے درمیان مزید اضافہ کے ساتھ ابھر آئیں۔ ۱۹۴۷ کے بعد نئے مسلم ملک میں عملاً ایسا ہی پیش آیا۔ ہر وہ نزاع جس کا ذکر پہلے ہندو کی نسبت سے کیا جاتا تھا وہ نئے ملک میں خود مسلمانوں کی نسبت سے بہت بڑے پیمانے پر پیدا ہوگئی۔

۱۹۴۷ سے پہلے کچھ ایسے دانشور موجود تھے جو دونوں گروہوں کو آنے والے خطرے سے ڈراتے تھے۔ اتحاد ہند کے قائدین کو ہندو انتہا پسندی کے خطرہ سے اور تقسیم ہند کے قائدین کو خود مسلمانوں کی نسل پسندی اور علاقہ پسندی کی ذہنیت سے۔ مگر دونوں گروہوں نے اس انتباہ کو نظر انداز کیا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ دونوں اس بھرم میں مبتلا تھے کہ ان کے پاس اتحاد کا ایسا فارمولا موجود ہے جو ہر افتراق کی کاٹ کے لئے کافی ہے۔ اتحاد پسند قائدین سمجھتے تھے کہ ان کے پاس سیکولرزم کا تیر بہدف فارمولا موجود ہے۔ اور سیکولرزم کے نظریہ کے تحت ہندستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک رشتہ میں جوڑ کر متحد کر سکتے ہیں۔ دوسری طرف تقسیم ہند کے قائدین یہ سمجھتے تھے کہ ان کے پاس اسلام کا معیاری نظریہ ہے جو مختلف مسلم گروہوں کو ایک رشتہ میں باندھنے کے لئے کافی ہے۔ مگر تجربات بتاتے ہیں کہ یہ دونوں ہی خوش فہمی بے بنیاد ثابت ہوئی۔ نہ ہندستان میں سیکولرزم یہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک رشتہ میں متحد کر سکا اور نہ پاکستان میں اسلام کے نعرہ کا یہ فائدہ ہوا کہ وہاں کے مختلف مسلم گروہ باہم متحد ہو کر رہیں۔

اس تلخ انجام کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ سیکولرزم یا اسلام میں لوگوں کو متحد کرنے کی طاقت نہیں۔ سیکولرزم اور اسلام دونوں ہی کسی سماج میں اتحادی فورس بن سکتے ہیں۔ مگر وہ اتحادی طاقت اسی وقت بنیں گے جب کہ انھیں استعمال کیا جائے۔ ہندستان اور پاکستان کے اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ دونوں میں سے کسی نظریہ کو صحیح طور پر استعمال نہیں کیا گیا۔

ہندستان۔ پاکستان دونوں ملکوں میں جو ہوا وہ یہ تھا کہ یہاں سیکولرزم کے نعرے لگائے گئے اور پاکستان میں اسلام کے نعرے۔ اور کسی نعرہ کو سماجی اتحاد کے لئے استعمال کرنا صرف اس وقت ممکن تھا جب کہ وہاں لمبی مدت تک فکری تحریک کا کام کیا جائے، سماج کے افراد اس سے متاثر ہوں۔ اور سماج میں پیش نظر منصوبہ کے موافق ضروری ذہنی فضا تیار ہو جائے۔

یہ کام اس حد تک ہو کہ پورا سماج مطلوب اسکیم کو قبول کرنے کے لئے فکری اور مزاجی طور پر تیار ہو جائے۔ دوسرے لفظوں میں، فطرت کے مطابق، اصلاح کا اصول یہ ہے کہ ــــــ پہلے ایجوکیشن، اس کے بعد اقدام۔ یہی کسی اصلاح کی صحیح ترتیب ہے۔ مگر انڈیا اور پاکستان میں جو ہوا وہ انگریزی مثل کے مطابق، گاڑی کو گھوڑے کے آگے باندھنے کے ہم معنیٰ تھا۔ اور جو لوگ اپنی گاڑی کو گھوڑے کے آگے باندھیں۔ ان کی گاڑی اس عالم اسباب میں کبھی چلنے والی نہیں۔

ہندتو: حقیقت یا افسانہ

خطرے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک حقیقی خطرہ، اور دوسرا فرضی خطرہ۔ اگر حقیقی خطرہ درپیش ہو تو اس کا حل یہ ہے کہ آدمی اس کی نوعیت کو سمجھے اور اس کے مطابق بچاؤ کی ضروری تدبیر کرے۔ لیکن اگر خطرہ محض فرضی ہو تو مسئلہ بالکل بدل جاتا ہے۔ اب اس سے بچاؤ کی تدبیر صرف یہ ہوتی ہے کہ اس کو سادہ طور پر نظر انداز کر دیا جائے۔ فرضی خطرہ کو نظر انداز کر دینا ہی اس سے بچاؤ کی سب سے زیادہ کامیاب تدبیر ہے۔

ہندتو کا خطرہ راقم الحروف کے نزدیک محض فرضی خطرہ ہے، وہ کبھی واقعہ بننے والا نہیں۔ ایسی حالت میں اس کے لیے پریشان ہونے کی کیا ضرورت۔

یہ صحیح ہے کہ آج کل ہندتو کا کافی چرچا ہے۔ کچھ لوگ یہ کہنے لگے ہیں کہ مستقبل کا انڈیا ہندتو کی بنیاد پر تشکیل دیا جائے گا۔ مگر جہاں تک میرا مطالعہ ہے، خود ہندتو کے علم برداروں کے ذہن میں اس کا کوئی واضح نقشہ موجود نہیں ہے۔ اور جس چیز کا نقشہ ہی اب تک واضح طور پر متعین نہ ہوا ہو، وہ انڈیا کے مستقبل کی تشکیل کرنے والا کس طرح بنے گا۔

مسٹر لال کرشن آڈوانی کے الفاظ میں، ہندتو سے مراد کلچرل نیشنلزم (cultural nationalism) ہے۔ یعنی کلچر پر مبنی قومیت۔ وہ کون سا کلچر ہوگا جس پر یہ قومیت تشکیل دی جائے گی۔ اس کا جواب مسٹر جے دوباشی کے الفاظ میں یہ ہے کہ انڈیا میں قومی تشخص صرف ہندو ہی ہو سکتا ہے:

In India, the national identity can only be Hindu. (The Illustrated Weekly of India, March 12, 1993)

اس کے ساتھ مسٹر گری لال جین کے الفاظ ملا لیجئے تو بات مکمل ہو جائے گی۔ ٹائمس آف انڈیا (۱۱ مارچ ۱۹۹۳) میں خاص اسی موضوع پر مسٹر جین کا ایک مضمون چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے:

Apartheid in reverse — Dangers of minorityism

مضمون نگار کے نزدیک انڈیا کے مسلمانوں کے مسئلہ کا حل یہ ہے کہ وہ اکثریتی فرقہ کے کلچر کو اختیار کر لیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ انڈیا کوئی انسانی چڑیا خانہ نہیں ہے جس میں مختلف انسانی انواع

ایک مقام پر الگ الگ خانوں میں رکھ دی گئی ہوں اور ان کو ایک نہ کیا جا سکتا ہو۔ انڈیا ممتاز طور پر اور ہزاروں سال سے ایک یکساں کلچر کا ملک ہے اگرچہ وہ یک سنگی نہیں :

India is not a human zoo with different species of humanity put together in one physical location in separate enclosures and it cannot be turned into one. It embodies a remarkably homogenous, though not monolithic, culture going back thousands of years. (p.8)

غیر ہندو فرقے اگر ہندتو کے علم برداروں کے اس مطالبہ کو بلا بحث مان لیں تب بھی اصل مسئلہ ختم نہیں ہوتا۔ کیوں کہ یکساں کلچر کو اختیار کرنے کے لیے اس کا ایک ماڈل ہونا ضروری ہے۔ حالاں کہ ایسا کوئی ماڈل سرے سے ملک کے اندر موجود ہی نہیں۔ اور جب ماڈل موجود نہ ہو تو اس کی پیروی کس طرح کی جائے گی۔

وہ چیز جس کو یہ حضرات ہندو کلچر یا بھارتی کلچر کہتے ہیں، وہ بروقت کسی ایک چیز کا نام نہیں ہے۔ اس میں بیک وقت بے شمار خدا ہیں۔ بابری مسجد کو ڈھانے والے بھارتی کلچر کے نمائندوں نے پُرفخر طور پر اجودھیا میں یہ نعرہ لگایا تھا کہ : ایک طرف ۳۳ کرور، ایک طرف ایک اللہ۔ اسی طرح ہندوؤں میں زبان، کھانا، کپڑا، رہن سہن، ہر چیز میں اختلاف ہے۔ حتی کہ ایک ہندو مبصر کے الفاظ ہیں، اس ملک میں جتنے ہندو ہیں، اتنی ہی ان کی قسمیں ہیں۔

جب ہندو کی اتنی زیادہ قسمیں ہیں تو سوال یہ ہے کہ وہ کون ہندو ہے جس کو پیروی کے لیے ماڈل سمجھا جائے۔ کیا وہ ہندو جو کوٹ اور پتلون پہنتا ہے یا وہ ہندو جو دھوتی اور کرتا پہنتا ہے۔ وہ ہندو جو مورتی پوجا کرتا ہے یا وہ ہندو جو مورتی پوجا کا کھنڈن کرتا ہے۔ وہ ہندو جو آستک ہے یا وہ ہندو جو ناستک ہے۔ وہ ہندو جو رامائن اور مہابھارت کو تاریخ کہتا ہے یا وہ ہندو جو رامائن اور مہابھارت کو افسانہ (متھ) سمجھتا ہے۔ وہ ہندو جو شاکاہاری ہے یا وہ ہندو جو ماسا ہاری ہے۔ وہ ہندو جو ہندوازم کو مذہب بتاتا ہے یا وہ ہندو جو ہندوازم کو فلاسفی قرار دیتا ہے۔ وہ ہندو جو رام کو ہیرو مانتا ہے یا وہ ہندو جو راون کو ہیرو سمجھتا ہے۔ وہ ہندو جو اونچ ذات اور نیچ ذات میں یقین رکھتا ہے یا وہ ہندو جو ان باتوں کو ماننے سے انکار کرتا ہے۔

اس قسم کے بے شمار فرق ہیں جو ایک ہندو اور دوسرے ہندو کے درمیان پائے جاتے ہیں

اب سوال یہ ہے کہ ان میں سے کون سا ہندو ہے جو ہندوازم یا ہندو کلچر کے لیے ماڈل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایسی حالت میں "ہندتو" کے علم برداروں کو پہلے خود ہندوؤں کے اوپر اپنا بلڈوزر چلا کر انھیں ایک کلچر یا یکساں کلچر کا نمونہ بنانا ہوگا۔ اس کے بعد ہی وہ غیر ہندو فرقوں سے یہ مانگ کر سکتے ہیں کہ وہ اس "ماڈل ہندو" کی پیروی کریں۔

اگر یہ حضرات سنجیدگی کے ساتھ غور کریں تو انہیں معلوم ہوگا کہ ان اختلافات کو بلڈوز کر کے ہندتو کا کوئی ایک ماڈل بنانا قابل عمل نہیں، اس لئے ہندتو کی بنیاد پر ملک کی تعمیر بھی یقینی طور پر قابل عمل نہیں۔ یہ صورت حال بتاتی ہے کہ ہندو سوسائٹی میں اختلافات اتنے زیادہ بنیادی ہیں جو کبھی ختم ہونے والے نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ حالت میں مسٹر گری لال جین کے الفاظ خود ہندو فرقہ پر زیادہ بڑے پیمانہ پر صادق آتے ہیں۔ ہندو فرقہ خود ایک بہت بڑا ہیومن زو ہے۔ اپنے موجودہ تنوعات کے ساتھ ہندو فرقہ کے لیے یکساں کلچر کا نمونہ بننا ممکن نہیں۔ وہ متنوع کلچر (composite culture) کا ماڈل یقیناً ہے مگر وہ یکساں کلچر کا ماڈل ہرگز نہیں۔

ہندتو کی اس کمزوری کا اعتراف خود ہندتو کے علم برداروں کو بھی کرنا پڑا ہے۔ چنانچہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ ہندو کی مشترک تعریف کے لیے کوئی واضح بنیاد موجودہ حالت میں موجود نہیں۔ کیوں کہ وہ دیکھتے ہیں کہ ایک ہندو، عمومی اعتبار سے، سب سے پہلے ایک ذات سے تعلق رکھتا ہے، اس کے بعد ہی وہ ہندو برادری کا حصہ بنتا ہے:

A Hindu, generally speaking, belongs to a caste before he belongs to the Hindu fraternity.

مسٹر گری لال جین (۱۹۹۳-۱۹۲۲) نے اپنے ایک مفصل مضمون میں لکھا تھا کہ ہندو قومیت کی دو قسمیں ہیں، منفی اور مثبت۔ منفی ہندو قومیت درجات کے فرق کے ساتھ محض مسلم مخالف جذبہ پر قائم ہے۔ مثبت ہندو قومیت کا تعلق ایک ہندو شخص کے لیے اپیل کرنے پر ہے۔ مگر چوں کہ یہ شخص ہندوؤں کے درمیان داخلی یکسانیت نہ ہونے کی وجہ سے غیر واقعی ہے اس لیے مثبت ہندو قومیت وجود میں آنے کے قابل نہیں۔ اس طرح جو چیز ممکن ہے وہ مطلوب نہیں اور جو چیز مطلوب ہے وہ ممکن نہیں:

There are two types of Hindu communalism: negative and positive. Negative Hindu communalism consists in being merely anti-Muslim in varying degrees: positive Hindu communalism consists in appealing in the name of a Hindu identity. But since this identity is very shadowy due to Hindu's lack of internal homogeneity, positive Hindu communalism is not viable. Thus what is possible is not desirable and what is desirable is not possible. (The Times of India, New Delhi, July 4, 1987)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہند تو خود اپنے اندرونی مسائل میں اتنا زیادہ مشغول ہے کہ اس کے لیے بیرونی خطرہ بننا تقریباً ناممکن ہے۔ ہندتو بیرونی خطرہ صرف اس وقت بن سکتا ہے جب کہ مسلمان جوش اور ہنگامہ والی سیاست سے اس کو اینٹی مسلم احساس پر کھڑے ہونے کا موقع دے دیں۔ اگر مسلمان ٹکراؤ سے اعراض کی پالیسی اختیار کرلیں تو ہندتو اپنے قیام کی واحد بنیاد سے محروم ہو جائے گا۔ اس کے بعد اس کا جو انجام ہوگا اس کو لفظوں میں بتانے کی ضرورت نہیں۔

زندگی کا ایک محکم اصول یہ ہے کہ اگر کچھ لوگ ایک بے معنی نعرہ لگا رہے ہوں تو ہمیں چاہیے کہ ہم ان نعروں کو نظر انداز کر کے یہ دیکھیں کہ تاریخ کی طاقتیں کس طرف جا رہی ہیں۔ کیوں کہ زندگی میں بالآخر جو چیز باقی رہتی ہے وہ تاریخ کی طاقتیں ہیں نہ کہ کچھ غیر سنجیدہ لوگوں کے بولے ہوئے الفاظ۔

اس سلسلہ میں میں امریکہ اور کناڈا کی مثال دوں گا۔ ان ملکوں میں بھی، انڈیا کی طرح، مختلف کلچر پائے جاتے ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد وہاں کچھ انتہا پسند لیڈر اٹھے۔ انھوں نے مختلف کلچر کو ختم کر کے ایک کلچر بنانے کی تحریک چلائی۔ اس تحریک کو عام طور پر یونی کلچرزم (uniculturalism) کہا جاتا ہے۔ مگر یہ تحریک کامیاب نہ ہو سکی۔ آخر کار انھیں ماننا پڑا کہ ان کے ملک کے لیے قابل عمل چیز صرف متنوع کلچریت (multiculturalism) ہے نہ کہ واحد کلچر۔

یہی واقعہ یقینی طور پر انڈیا میں بھی ہونے والا ہے۔ واحد کلچر کا نعرہ لگانے والے یہاں ناکام ہو کر رہ جائیں گے اور آخر کار جو چیز باقی رہے گی وہ مختلف اور متنوع کلچر کا اصول ہے جو ہزاروں سال سے اس ملک میں موجود تھا اور آج بھی وہ پوری طرح موجود ہے۔ یہی تاریخ کا فیصلہ ہے۔

نئی دہلی میں ۲۵ جولائی ۱۹۹۳ کو ایک میٹنگ تھی۔ اس کی رپورٹ ٹائمس آف انڈیا ۲۶ جولائی میں چھپ چکی ہے۔ یہاں مختلف ہندو دانش وروں نے تقریریں کیں۔ ٹائمس آف انڈیا کے ایڈیٹر

دلیپ پڈگاؤنکر (Dileep Padgaonkar) نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اس دنیا میں ہر آدمی کی مختلف حیثیت ہوتی ہے۔ آپ اس قانون قدرت کو بدل نہیں سکتے۔ اس معاملہ میں ہمیں تنگ نظری کے بجائے وسعت نظری کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔

انھوں نے کہا کہ میں مہاراشٹر میں پیدا ہوا۔ اب میں دہلی میں رہتا ہوں۔ وطن، زبان، مذہب، تہذیب، تعلیم ہر لحاظ سے میری مختلف حیثیتیں ہیں۔ اسی طرح تاریخ کے اعتبار سے میری مختلف حیثیت ہے۔ میری زندگی میں قدیم بھارتی عہد کا حصہ ہے۔ پھر میری زندگی پر مسلمانوں کے ہزار سالہ عہد کی چھاپ ہے۔ اس کے بعد برٹش عہد آیا۔ اس نے بھی میری زندگی پر اثرات ڈالے۔ اب میں آزاد انڈیا کا ایک فرد ہوں۔ یہ ساری چیزیں میری زندگی کا حصہ ہیں۔ ان میں سے کسی کو بھی میں اپنے سے الگ نہیں کر سکتا۔

اس قسم کی تفصیلات بتاتے ہوئے انھوں نے مشہور انگلش رائٹر والٹ وھٹمین (Walt Whitman) کا قول دہرایا اور کہا کہ ہمیں ان تمام تضادات کے ساتھ جینا ہے۔ میں اتنا زیادہ وسیع ہوں کہ ان تمام تضادات کو اپنی زندگی میں سمو سکوں:

We all have to live with our contradictions. I am large enough to contain all these contradictions.

والٹ وھٹمین (۱۸۹۲-۱۸۱۹) کا یہ قول زندگی کی ایک حقیقت کو بتاتا ہے۔ انسان تضادات کا مجموعہ ہے اور تضادات سے نباہ کر کے ہی وہ کامیاب ہو سکتا ہے۔

انڈین کلچر اور انڈین ہسٹری کے مشہور عالم پنڈت بی این پانڈے (۸۸ سال) کا ایک انٹرویو ٹائمس آف انڈیا (۲۲ اگست ۱۹۹۳) میں چھپا ہے۔ ان سے یہ انٹرویو مسٹر الیس کالی داس نے لیا ہے۔ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مشکل یہ ہے کہ آج کا ہندو تو ہمارے دھرم کی مقدس کتابوں سے بہت کم مناسبت رکھتا ہے۔ اتھرو وید میں ہے کہ یہ دیش کئی مذہبوں، کئی نسلوں، کئی ذاتوں، کئی زبانوں کا دیش ہے۔ اس کے اندر مزید یہ کہا گیا ہے کہ اس دیش کو مل کر رہنے کے لیے ایک اصول کو مان لینا چاہیے۔ وہ یہ کہ یہ سرزمین ہماری مادر وطن ہے اور ہم سب اس کی سنتان ہیں۔ اس طرح پانچ ہزار سال پہلے ہم اس اصول پر متفق ہو چکے ہیں کہ اس دیش میں زبان، عقیدہ اور کلچر کے اختلاف کے باوجود ہم پُر امن طور پر ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے:

The trouble is that today's Hindutva has little in common with the Dharma of our scriptures. The Atharva Veda says: "This is a country of many religions, many ethnicities, many castes, many languages." It further says that to co-exist the people of this country must agree on one principle: "This land is our mother and all of us are her progeny." So even 5000 years ago we had agreed on the principles of peaceful co-existence in a clime of diversity in language, creed and culture.

انڈین کلچر کے بارہ میں یہی صحیح نقطۂ نظر ہے اور آخر کار ہمارے ملک میں یہی باقی رہنے والا ہے۔ انڈیا ماضی میں ملٹی کلچر کا ملک تھا، حال میں وہ ملٹی کلچر کا ملک ہے، اور مستقبل میں بھی وہ ملٹی کلچر کا ملک رہے گا۔ یہی تاریخ کا فیصلہ ہے۔ یہی عقل کا تقاضا ہے، اور اسی میں ملک کی ترقی کا راز چھپا ہوا ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے وہ صرف نعرہ بازی ہے، نہ کہ کوئی واقعی نظریہ یا کوئی حقیقی سیاست۔

مستحکم سماجی نظام

بیسویں صدی عیسوی کے آخر میں ہندستان میں ایک خطرناک علامت ظاہر ہوئی ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مستقبل بعید تک کے لئے ملک میں مستحکم حکومت کا دور ختم ہوگیا ہے۔ حکومت کا اور پارلیمنٹ کا بار بار ٹوٹنا اب یہاں کا سالانہ معمول بنتا جارہا ہے۔ ایسی حالت میں ملک کے لئے آخری امید صرف یہ باقی رہ گئی ہے کہ غیر مستحکم سیاسی نظام کے درمیان مستحکم سماجی نظام قائم کرنے کی کوشش کی جائے۔

۱۹۹۷ میں یورپ کے ایک سفر کے دوران مجھے دو دن کے لئے روم میں ٹھہرنے کا موقع ملا۔ یہاں میری ملاقات ایک اٹیلین پروفیسر سے ہوئی۔ ان سے میں نے پوچھا کہ اٹلی میں عرصہ سے سیاسی استحکام نہیں ہے۔ حکومتیں ہر سال ٹوٹتی رہتی ہیں۔ اس کے باوجود حالیہ سروے کے مطابق، اٹلی میں اقتصادی شرح ترقی (rate of growth) پورے یورپ میں سب سے زیادہ ہے۔ سیاسی عدم استحکام کے باوجود اس اقتصادی ترقی کا راز کیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ لمبے عمل کے بعد ہمارے یہاں غیر سیاسی سطح پر سسٹم بہت مضبوط ہوگیا ہے جو سیاسی تبدیلیوں کے باوجود بدستور قائم رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی انتشار کی حالت میں بھی قومی ترقی کے عمل میں خلل واقع نہیں ہوتا۔

میرا احساس یہ ہے کہ موجودہ حالات میں انڈیا میں بھی اسی ماڈل کو اختیار کیا جانا چاہئے۔ خوش قسمتی سے یہ نظام آج بھی ہمارے ملک میں تقریباً پچاس فیصد تک موجود ہے۔ اب صرف تھوڑی سی محنت کے ذریعہ اس کو ایک مکمل سسٹم کے درجہ تک پہنچایا جاسکتا ہے۔

یہاں میں کچھ مثالیں دوں گا۔ ۱۹۴۷ کے بعد انڈیا کی قسمت جن بڑے سیاسی لیڈروں کے ہاتھ میں آئی وہ تقریباً سب کے سب سوشلسٹ ذہن رکھنے والے لوگ تھے۔ انھوں نے انڈیا کی تعمیر نو کے لئے مقلدانہ طور پر روسی ماڈل کو اختیار کرلیا۔ اس میں صرف اتنا فرق تھا کہ ملکی حالات کی بنا پر وہ یہاں اشتراکی ڈکٹیٹر شپ قائم کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ اس لئے انھوں نے نام نہاد پبلک سکٹر

کے ساتھ پرائیویٹ سکٹر کو بھی جینے کی اجازت دے دی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ۱۹۹۱ میں جب سوویت یونین ٹوٹا تو وہاں کی اقتصادیات کامل دیوالیہ پن کی شکار ہوگئیں۔ لیکن انڈیا میں ہم پاتے ہیں کہ اگر چہ ہمارے یہاں سوشلسٹ حکمرانوں کا قائم کردہ پبلک سکٹر سوویت یونین ہی کی طرح مکمل طور پر ناکام ہوگیا، اس کے باوجود ملک کی اقتصادیات دیوالیہ پن کا شکار ہونے سے بچی ہوئی ہے۔ اس کا کریڈٹ کسی بھی درجہ میں ہمارے حکمرانوں کو نہیں جاتا۔ یہ تمام تر اسی پرائیویٹ سکٹر کا کارنامہ ہے جس کو آزادی کے بعد ہمارے سوشلسٹ حکمرانوں نے صرف ایک ناگزیر برائی کے طور پر باقی رکھا تھا۔

ہندستان میں پچھلے کئی سو سال سے ایک مضبوط تجارتی طبقہ موجود تھا۔ وہ اس پوزیشن میں تھا کہ شہنشاہ اورنگ زیب اور ایسٹ انڈیا کمپنی کو قرض دے سکے۔ یہ بزنس کمیونٹی مسلسل قائم رہی۔ آزادی کے دور میں اس کی نئی نسل نے بڑے پیمانہ پر جدید تعلیم حاصل کر لی اور اس طرح اپنے تجارتی ڈھانچہ کو جدید معیار کے مطابق بنا کر اپنے آپ کو مزید مستحکم کر لیا۔

دور آزادی کے حکمرانوں نے اس معاملہ میں کوئی بھی مثبت کام نہیں کیا۔ اس مدت میں ان کا واحد کارنامہ یہ ہے کہ فلاح عامہ کے نام پر انھوں نے بے شمار مصنوعی قوانین بنائے اور اس طرح سوشلسٹ جنون کے تحت تجارتی طبقہ کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی۔ مگر یہ طبقہ اپنی سخت جانی کا ثبوت دیتے ہوئے پھر بھی زندہ رہا۔ دراصل ملک کا یہی تجارتی طبقہ (private sector) وہ سب سے بڑا عامل ہے جس نے حکمرانوں کی بدترین نااہلی کے باوجود ملک کو اقتصادی دیوالیہ پن سے بچایا ہے۔

اس سلسلہ میں دوسرا مددگار عامل وہ ہے جس کو زرعی سکٹر کہا جاتا ہے۔ ہندستان میں سیکڑوں سال سے مضبوط زرعی نظام قائم تھا۔ اسے گاؤں کے کسانوں نے اپنی ذاتی محنت سے قائم کیا تھا۔ سابق سوویت یونین نے وہاں کے زرعی سکٹر کو بے دردانہ طور پر نام نہاد سرکاری کنٹرول میں لے لیا تھا۔ ہندستان کے سوشلسٹ حکمراں اس پوزیشن میں نہ تھے کہ وہ ملک کی اسّی فیصد کسان آبادی پر اپنا سوشلسٹ بلڈوزر چلا سکیں۔ چنانچہ یہ زرعی سکٹر حکمرانوں کی مدد کے بغیر خود اپنی طاقت پر قائم رہا۔

ہندستان سوویت یونین جیسی اقتصادی تباہی سے بچا ہوا ہے۔ اس کا دوسرا بڑا سبب اسی زرعی سکٹر کا زندہ رہنا ہے۔ اس زرعی سکٹر نے نہ صرف ملک کو غذائی اعتبار سے خود کفیل بنایا بلکہ برآمدات کی صورت میں وہ ملک کے لئے قیمتی زرمبادلہ حاصل کرنے کا ذریعہ بنا رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہمارے حکمراں سوشلسٹ ریفارم کے نام پر اس زرعی سکٹر کو سرکاری سکٹر بنانے میں کامیاب ہوجاتے تو یقینی طور پر ملک کا وہی اقتصادی انجام ہوتا جو سوویت یونین کے ساتھ پیش آیا ہے۔

تیسرا شعبہ جو نسبتاً کمزور حالت میں قائم ہوا وہ تعلیم کا شعبہ ہے۔ تعلیم کا رواج ہندستان میں اگرچہ قدیم زمانہ سے تھا مگر وہ صرف خاص طبقوں تک محدود تھا۔ مسلمان جب ہندستان میں آئے تو انھوں نے ہر مسجد کو مدرسہ کی صورت دے کر تعلیم کو کافی پھیلا دیا۔ بہت سے ہندو مثلاً ڈاکٹر راجندر پرساد نے اسی نظام کے تحت اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد انگریز ملک میں جدید تعلیم لے آئے۔ آزادی (۱۹۴۷) کے بعد ملک میں ہزاروں کی تعداد میں نئے تعلیمی ادارے قائم ہوگئے۔ انھیں مختلف کوششوں کا یہ نتیجہ ہے کہ آج ملک میں پچاس فیصد لوگ کم یا زیادہ تعلیم یافتہ دکھائی دیتے ہیں۔ یہ تعلیمی ڈھانچہ ملک کو آخری تباہی سے بچانے میں بہت کامیاب ثابت ہوا ہے۔

چوتھا نظام، اقدار کے نظام (value system) کا ہے۔ آزادی کے بعد ہمارے لیڈروں نے پولیٹیکل کرپشن کا جو طوفان برپا کیا، اس کے بعد ملک کا یہ حال ہونا چاہئے تھا کہ وہ آخری حد تک اخلاقی دیوالیہ پن کا شکار ہوجائے۔ مگر ایسا نہ ہوسکا۔ آج بھی ملک میں اخلاقی اقدار کی روایات کسی نہ کسی درجہ میں زندہ اور قائم ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو قومی اور سماجی زندگی کے تمام شعبے اس حد تک تباہ ہو چکے ہوتے کہ بازار میں چلنا اور ٹرینوں میں سفر کرنا بھی عام انسان کے لئے سخت مشکل ہوجاتا۔

ناموافق سیاسی حالات کے باوجود ملک میں اخلاقی روایت کے باقی رہنے کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب دوبارہ اخلاقی تعلیم کا وہ خاموش نظام ہے جو غیر سیاسی سطح پر قائم چلا آرہا ہے۔ سو سال پہلے کے دور میں یہ نظام زیادہ تر صوفیوں کے ذریعہ قائم تھا۔ اب اس نظام کا تسلسل اس طرح قائم ہے کہ ایک طرف ہندوؤں کے اندر بہت بڑی تعداد میں گرو اور سادھو سنت موجود ہیں جو ہر دن اپنی

قوم کو امن اور پیار اور سہن شیلتا کا اپدیش دیتے رہتے ہیں۔ یہ کام بہت بڑے پیمانہ پر پورے ملک میں ہو رہا ہے۔

دوسری طرف مسلمانوں میں لاکھوں کی تعداد میں مسجد اور مدرسے اور دینی حلقے قائم ہیں۔ مسلمانوں کی بیش تر تعداد کسی نہ کسی طور پر ان اداروں اور حلقوں سے جڑی ہوئی ہے۔ یہاں ان کو مسلسل طور پر اخلاق اور شرافت اور انسانیت کا سبق دیا جاتا ہے۔ یہ کام ہر شہر اور گاؤں میں ہو رہا ہے، جب کہ سیاست اور حکومت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

یہ ایک غیر سیاسی نظام ہے جس کے چار بڑے بڑے شعبے ہیں ـــــــ تجارت، زراعت، تعلیم اور اخلاقیات۔ موجودہ حالت میں جب کہ ہمارے نا اہل لیڈروں نے ملک کو سیاسی دیوالیہ پن کی حد تک پہنچا دیا ہے، یہی غیر سیاسی نظام ہے جو ملک کو آخری تباہی سے بچائے ہوئے ہے۔

لارڈ ایکٹن نے کہا تھا کہ اقتدار بگاڑتا ہے (power corrupts)۔ یہ مقولہ ہمارے ملک میں اپنی بدترین صورت میں صحیح ثابت ہوا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بگاڑ کا یہ مسئلہ صرف موجودہ سیاسی لیڈروں تک نہیں رکے گا بلکہ جو شخص بھی سیاست کے میدان میں داخل ہوگا وہ اسی مقولہ کا شکار ہوتا رہے گا۔ اس لئے کم از کم موجودہ حالت میں عقلمندی یہی ہے کہ ہم سیاسی لیڈروں سے زیادہ امید رکھنا چھوڑ دیں اور مذکورہ غیر سیاسی نظام کو مزید مکمل اور مستحکم بنانے میں لگ جائیں۔

ہمارے لئے اب امید کا مقام ملک کا سیاسی ادارہ نہیں ہے بلکہ وہ غیر سیاسی ادارے ہیں جن کا اوپر ذکر ہوا۔ جو شخص بھی ملک کی تعمیر میں اپنا کچھ حصہ ادا کرنا چاہتا ہے اس کو اسی غیر سیاسی نظام کی تعمیر و تشکیل میں مصروف ہو جانا چاہئے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم صرف غیر سیاسی شعبوں میں مشغول ہو جائیں اور سیاسی شعبے کو اس کی بگڑی ہوئی حالت پر چھوڑ دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ غیر سیاسی شعبے کو بہتر بنانا بالواسطہ طور پر خود سیاسی شعبے کو بہتر بنانے کا ذریعہ ہے۔

ملک کے سیاسی شعبے کے بگاڑ کو درست کرنے کی کوشش پچھلے پچاس سال سے جاری رہی ہے۔

اس میں ڈاکٹر رام منوہر لوہیا اور جے پرکاش نرائن جیسے بہت سے لوگوں کے نام شامل ہیں۔ مگر لمبی کوشش کے باوجود اس معاملے میں کوئی کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ ایسی حالت میں اس تجربہ کو مزید جاری رکھنا کوئی معقول بات نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سیاسی اصلاح کی براہ راست کوشش پوری طرح ناکام ہوچکی ہے۔ اب ہمارے لئے جو صورت باقی ہے وہ یہی ہے کہ اس معاملے میں بالواسطہ اصلاح کے آزمودہ طریقہ کو اختیار کرلیا جائے۔

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ جیسے تم ہوگے ویسے ہی تمھارے حکمراں ہوں گے (**كما تكونون، كذٰلك يؤمر عليكم ، مشكوٰة المصابيح، كتاب الامارة و القضاء**) اس کا مطلب یہ ہے کہ سیاست ہمیشہ سماجی حالات کے تابع ہوتی ہے۔ اگر سیاسی شعبہ میں تبدیلی لانا ہے تو سب سے پہلے سماجی نظام میں تبدیلی لانا چاہئے۔ یہ دراصل سماج ہے جو سیاسی شعبہ کی تشکیل کرتا ہے، نہ کہ اس کے برعکس۔

خلاصہ یہ کہ موجودہ حالات میں ملک کے مستقبل کے لئے اگر کوئی امید ہے تو وہ الیکشنی ہنگاموں اور سیاسی اکھیڑ پچھاڑ میں نہیں ہے بلکہ سماجی شعبوں کی خاموش تعمیر میں ہے۔ جو لوگ بھی ملک کا سچا درد رکھتے ہیں انھیں اسی ایک کام میں مشغول ہو جانا چاہئے۔ اگر ملک میں مستحکم سماجی نظام قائم ہو جائے تو وہ غیر مستحکم سیاسی نظام کے باوجود ترقی کرتا رہے گا۔ اس کے بعد ملک کی ترقی کو کوئی روکنے والا نہیں۔

کشمیر گائڈ

کشمیر گائڈ

زیرِ نظر مجموعہ کشمیر گائڈ کے طور پر شائع کیا جارہا ہے۔ میں تحریری اعتبار سے ۱۹۶۸ سے کشمیر سے وابستہ رہا ہوں۔ اول دن سے میری یہ رائے ہے کہ کشمیر کو غیر حقیقت پسندانہ سیاست نے تباہ کیا ہے، اور اب حقیقت پسندانہ سیاست کے ذریعہ اس کو دوبارہ ایک ترقی یافتہ کشمیر بنایا جاسکتا ہے۔

کشمیری مسلمانوں کی موجودہ نفسیات یہ ہے کہ وہ ہر ایک سے بیزار ہو چکے ہیں۔ وہ بے اعتمادی کی فضا میں جی رہے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعہ کا مقصد یہ ہے کہ ان کو اس بے اعتمادی کی فضا سے نکالا جائے اور انھیں حوصلہ اور اعتماد پر کھڑا کرنے کی کوشش کی جائے۔

کشمیریوں کے لئے اس نئی زندگی کا آغاز ہر لمحہ ممکن ہے۔ مگر اس کی دو لازمی شرطیں ہیں۔ اول یہ کہ آج وہ جس ناخوش گوار صورت حال سے دوچار ہیں، اس کا ذمہ دار وہ خود اپنے آپ کو ٹھہرائیں۔ جب تک وہ اس کا ذمہ دار دوسروں کو ٹھہراتے رہیں گے، ان کے لئے نئی زندگی کا آغاز ممکن نہیں۔

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ وہ مفروضات کی دنیا سے نکلیں اور عملی حقائق کی دنیا میں جینا شروع کریں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ان کے نااہل لیڈروں نے انھیں جن خوش فہمیوں میں مبتلا کیا تھا ان سے وہ باہر آئیں۔ وہ حالاتِ موجودہ سے ہم آہنگی کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے اپنی تعمیر کا نیا منصوبہ بنائیں۔

حالات کا فیصلہ ہے کہ وہ آزادانہ طور پر، نہ کہ مجبورانہ طور پر، یہ جرأت مندانہ فیصلہ کریں کہ تقدیر نے ان کو انڈیا کا ایک حصہ بنا دیا ہے اور اب ان کے لیے اس کے سوا کوئی ممکن صورت نہیں کہ وہ خوش دلی کے ساتھ تقدیر کے اس فیصلہ کو قبول کرلیں۔

مزید یہ کہ یہ ان کے لیے کوئی برائی نہیں، وہ یقینی طور پر ان کے لیے ہر اعتبار سے خیر کی حیثیت رکھتی ہے۔ انڈیا ایک بڑا ملک ہے۔ یہاں آزادی اور جمہوریت ہے۔ یہاں تقریباً بیس کروڑ کی تعداد میں ان کے ہم مذہب مسلمان رہتے ہیں۔ برصغیر ہند کے تمام بڑے اسلامی ادارے انڈیا میں قائم

ہیں۔ انڈیا میں اس علاقہ کے مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ کے نقوش موجود ہیں جو اس علاقہ کے مسلمانوں کو زندگی کا حوصلہ دیتے ہیں۔ ان سب سے بڑھ کر یہ کہ ہند میں دعوتِ دین کے وہ عظیم مواقع موجود ہیں جن کی انجام دہی پر حدیث میں نجاتِ آخرت کی خوش خبری دی گئی ہے۔ (النسائی، احمد)

ایک بار میں چند دن کے لئے کراچی میں تھا۔ وہاں میری ملاقات ایک مسلم صنعت کار سے ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ آپ لوگ انڈیا میں ہم سے زیادہ بہتر پوزیشن میں ہیں۔ میں نے اس کا سبب پوچھا تو انھوں نے کہا کہ دیکھئے، پاکستان ایک چھوٹا ملک ہے۔ اگر ہم کوئی پروڈکٹ تیار کریں تو اس کو مارکیٹ کرنے کے لیے ہمارے پاس بہت محدود دنیا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس انڈیا بہت بڑا ملک ہے۔ انڈیا میں اگر آپ کوئی پروڈکٹ تیار کریں تو اس کو مارکیٹ کرنے کے لیے آپ کے پاس ایک نہایت وسیع دنیا موجود ہوتی ہے۔

مذکورہ مسلم تاجر کی یہ بات اب ایک واقعہ بن چکی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اکیسویں صدی میں پہنچ کر انڈیا کے مسلمان پورے برصغیر ہند کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ مسلمان بن چکے ہیں۔ یہ بات بلا مبالغہ درست ہے اور کسی بھی شہر کا تقابلی سروے کر کے اس کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔ اس واقعہ کی ایک علامتی مثال یہ ہے کہ آج نہ صرف برصغیر ہند بلکہ پوری مسلم دنیا کا سب سے زیادہ دولت مند آدمی ہندستان میں پایا جاتا ہے، یعنی بنگلور کے مسٹر عظیم ہاشم پریم جی۔

کشمیر کے مسلمان اگر دل کی آمادگی سے انڈیا کے ساتھ مل جائیں تو ان کے لئے ہر قسم کی ترقی کے شاندار مواقع کھل جائیں گے۔ تعلیم، اقتصادیات اور دوسرے تمام ترقیاتی شعبوں میں یہاں ان کے لئے ترقی کے جو امکانات ہیں وہ کسی بھی دوسرے نقشہ میں نہیں۔

مزید یہ کہ سیاست کے اعتبار سے انڈیا میں ان کے لئے ترقی کے عظیم مواقع موجود ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے میرا ایک مضمون اردو اور ہندی اور انگریزی اخباروں میں چھپا تھا۔ اس میں میں نے لکھا تھا کہ کشمیر کے مسلمان اگر ٹکراؤ کی پالیسی چھوڑ دیں اور ہندستان کو دل سے قبول کرتے ہوئے اس کا حصہ بن جائیں تو آئندہ جمہوری ہندستان میں جو پہلا مسلم وزیر اعظم بنے گا وہ ایک کشمیری مسلمان ہوگا۔ یہ

ایک ایسا واقعہ ہے جس کے بارے میں مجھے کوئی شبہہ نہیں — اگلے صفحات میں جو کچھ لکھا جارہا ہے وہ مختلف پہلوؤں سے اسی حقیقت کی تفصیل وتشریح ہے۔

کشمیری قیادت

کشمیر کے مسئلہ پر میں اس کے آغاز ہی سے سوچتا رہا ہوں۔ اللہ کی توفیق سے میں نے ابتداء میں اس معاملہ میں جو رائے قائم کی تھی وہی رائے آج بھی مجھ کو درست نظر آتی ہے۔ اس معاملہ میں مجھے کبھی اپنی رائے بدلنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ مطبوعہ ریکارڈ کے مطابق، اس موضوع پر میں ۱۹۶۸ سے لکھتا رہا ہوں۔ اس کے بارے میں غالباً میری پہلی تحریر وہ ہے جو الجمعیۃ ویکلی میں چھپی تھی۔ یہاں یہ تحریر الجمعیۃ کے صفحات سے لے کر نقل کی جارہی ہے:

''اپنا حق وصول کرنے کا وقت وہ ہوتا ہے جب کہ فیصلے کا سرا اپنے ہاتھ میں ہو۔ مگر ہمارے لیڈر اس وقت ہوش میں آتے ہیں جب کہ ان کا کیس اخلاقی کیس بن چکا ہو'' — یہ احساس مجھے اکثر اس وقت ہوتا ہے جب کہ میں کشمیری لیڈر شیخ عبد اللہ کی تقریر پڑھتا ہوں۔ شیخ صاحب ایک مخلص کشمیری ہیں۔ اپنی جرأت اور قربانیوں کی وجہ سے وہ بجا طور پر شیر کشمیر کہلانے کے مستحق ہیں۔ مگر ان کی موجودہ کشمیری مہم مجھے مشتے بعد از جنگ سے زیادہ نظر نہیں آتی۔

۱۹۴۷ میں وہ اس پوزیشن میں تھے کہ اگر وہ حقیقت پسندی اختیار کرتے تو اپنا فیصلہ خود اپنی مرضی کے مطابق کر سکتے تھے۔ مگر انھوں نے فیصلے کے وقت کو غیر حقیقت پسندانہ خوابوں میں کھودیا۔ اب جب کہ فیصلہ کا سرا ان کے ہاتھ سے نکل چکا ہے تو وہ چیخ وپکار کررہے ہیں۔ حالانکہ اب ان کی چیخ و پکار کی حیثیت محض اخلاقی دہائی کی ہے، اور اخلاقی دہائی اس دنیا میں کوئی وزن نہیں رکھتی۔

ایک نوجوان نے ایک مرتبہ دکان کھولی۔ ابھی انھوں نے زندگی میں پہلی بار قدم رکھا تھا اور انھیں اندازہ نہ تھا کہ دنیا میں کس قسم کے تحفظات کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ دکان میں نہایت معمولی تالا لگانا شروع کیا۔ ایک روز وہ دکان سے اداس حالت میں لوٹے۔ یہ دیکھ کر ایک بزرگ نے پوچھا: ''کیا بات ہے، آج اُداس نظر آرہے ہو''۔

’’دکان میں چوری ہوگئی‘‘۔نوجوان نے کہا۔

’’کیسے‘‘

’’تالا معمولی تھا۔کوئی شخص رات میں کھول کر سامان نکال لے گیا‘‘۔

’’یہ تو تمھاری غلطی تھی‘‘۔

’’جی ہاں۔اب تجربہ ہوا کہ دکان میں تالا اچھے قسم کا لگانا چاہئے‘‘۔

یہ سن کر بزرگ نے فرمایا— ’’یہ بھی کوئی تجربہ کے بعد معلوم ہونے کی چیز ہے۔جب تم دکانداری کی لائن میں داخل ہوئے تو تمھیں اول دن سے جاننا چاہئے تھا کہ دکان میں تالا مضبوط لگایا جاتا ہے۔‘‘

دکان اوراس طرح کے دوسرے شخصی معاملات میں تو اس کا بھی امکان ہے کہ آدمی ایک بار ٹھوکر کھا کر دوبارہ سنبھل جائے۔مگر قومی فیصلوں کی نوعیت بالکل جداگانہ ہے۔شخصی معاملات میں ایک بار نقصان اٹھانے کے بعد یہ بھی امکان رہتا ہے کہ محنت کر کے آدمی دوبارہ حالات کو اپنے موافق بنالے۔مگر قومی معاملات میں جب فیصلہ کا سرا ایک بار ہاتھ سے نکل گیا تو مسئلہ بے حد پیچیدہ ہو جاتا ہے۔پھر تو زمین وآسمان کی نئی کروٹیں ہی اس کو بدل سکتی ہیں۔

قومی قیادت ایک ایسا کام ہے جو ان لوگوں کے کرنے کا ہے جو حال کے اندر مستقبل کو دیکھ سکیں— باقی وہ لوگ جن کی نگاہیں صرف ماضی اور حال تک جاتی ہوں اور مستقبل انھیں صرف اس وقت نظر آئے جب وہ واقعہ بن کر ان کے اوپر ٹوٹ پڑا ہو۔ایسے لوگ قوموں کی قیادت نہیں کر سکتے۔البتہ اپنے غیر دانش مندانہ اقدامات سے قوموں کو مسائل میں الجھانے کا فرض ضرور انجام دے سکتے ہیں۔‘‘
(الجمعیۃ ویکلی،نئی دہلی، ۱۴جون،۱۹۶۸،صفحہ ۴)

اس کے بعد میں اسی انداز سے مسلسل کشمیر کے بارہ میں لکھتا رہا ہوں۔پچھلے ۳۵ سال میں کشمیر کے موضوع پر میں نے جو کچھ لکھا ہے ان کو اگر یکجا کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب بن جائے گی۔

یہ اللہ کا شکر ہے کہ میری اس طویل کوشش سے ہزاروں کشمیریوں کو فائدہ پہنچا ہے۔ہزاروں لوگ جنگجوئی کا مزاج ختم کر کے تعلیم وترقی کے میدان میں مثبت طور پر سرگرم ہیں۔اس سلسلہ میں مجھے

کشمیریوں کی طرف سے مسلسل خطوط اور ٹیلیفون، وغیرہ ملتے رہتے ہیں جن کی تفصیل یہاں بتانے کی ضرورت نہیں۔

کوئی بھی تحریک بظاہر عوام کی طرف منسوب ہوتی ہے، مگر حقیقتاً وہ لیڈر کی تحریک ہوتی ہے۔ ایک یا چند لیڈر اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ عوام کو ابھارتے ہیں اور پھر عوام کے نام سے اپنی لیڈری کی قیمت وصول کرتے ہیں۔ یہ صورت حال لیڈر کی ذمہ داری کو بہت زیادہ بڑھا دیتی ہے۔ ایسی حالت میں صرف اسی شخص کو لیڈرشپ کے میدان میں داخل ہونا چاہئے جس نے وہ ضروری تیاری کی ہو جو اس کو لیڈرشپ کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے قابل بناتی ہے۔ ضروری تیاری کے بغیر جو شخص لیڈرشپ کے میدان میں سرگرم ہو وہ اللہ کے نزدیک سخت مجرم ہے، خواہ بے شعور عوام کے درمیان اس نے کتنی ہی زیادہ مقبولیت حاصل کرلی ہو۔

کشمیریوں کے لئے آخری وقت آگیا ہے کہ وہ اپنے لیڈروں سے اوپر اٹھ کر پورے معاملہ پر ازسرِ نو غور کریں۔ لیڈروں کے الفاظ کی روشنی میں نہیں بلکہ حقائق کی روشنی میں وہ اپنی زندگی کا نقشہ بنائیں۔ اس کے سوا ان کے لیے کامیابی کی اور کوئی صورت نہیں۔

فطرت کا سبق

دریا کا سامنا چٹان سے ہو تو وہ اپنا راستہ بدل کر آگے بڑھ جاتا ہے مگر نادان انسان چاہتا ہے کہ وہ چٹان کو توڑ کر اپنا راستہ بنائے، خواہ اس کا نتیجہ یہ ہو کہ اس کا سفر ہی ہمیشہ کے لئے رک جائے۔

کشمیر میں انڈیا کے خلاف مسلّح تحریک اکتوبر ۱۹۸۹ میں شروع ہوئی۔ اس سے صرف ایک مہینہ پہلے میں نے کشمیر کا سفر کیا تھا۔ وہاں سری نگر کے ٹیگور ہال میں میرا خطاب تھا۔ اس کے علاوہ، اس قیام کے دوران بہت سے لوگوں سے میری ملاقاتیں ہوئیں۔ اس کا سفرنامہ میں نے اسی وقت لکھا تھا مگر وہ کسی وجہ سے الرسالہ میں شائع نہ ہو سکا۔

ایک دن میں کچھ کشمیری مسلمانوں کے ساتھ سری نگر کے باہر کھلی وادی میں گیا۔ ہر طرف فطرت کے خوبصورت مناظر تھے۔ پہاڑ کے اوپر سے پانی کے چشمے بہتے ہوئے میدان میں آرہے

تھے۔ کشمیری مسلمانوں کو لے کر میں ایک چشمہ کے پاس بیٹھ گیا۔ وہاں یہ منظر تھا کہ چشمہ کا پانی بہتا ہوا ایک جگہ پہنچتا ہے جہاں اس کے سامنے ایک پتھر ہے۔ پانی یہ نہیں کرتا کہ وہ پتھر کو توڑ کر آگے جانے کی کوشش کرے۔ اس کے برعکس وہ پتھر کے دائیں اور بائیں سے مُڑ کر آگے نکل جاتا ہے اور اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔

میں نے کشمیری مسلمانوں سے کہا کہ اس کو دیکھئے، یہ آپ کے نام قدرت کا ایک پیغام ہے۔ اس فطری واقعہ کے ذریعہ آپ کو یہ خاموش پیغام دیا جارہا ہے کہ تمھاری زندگی کے سفر میں کوئی رکاوٹ کی چیز آجائے تو تمھیں ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ رکاوٹ سے ٹکرا جاؤ، اور رکاوٹ کی چٹان کو توڑ کر اپنے لئے سیدھا راستہ بناؤ۔ اس کے بجائے تم کو یہ کرنا چاہئے کہ رکاوٹ سے اعراض کرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف اپنے سفر کو جاری رکھو۔

یہی زندگی میں کامیابی کا راز ہے۔ فرد کا معاملہ ہو یا کسی قوم کا معاملہ، ہر ایک کے لئے تعمیر وترقی کی واحد تدبیر یہ ہے کہ وہ راستہ کے پتھروں کو نظر انداز کرکے آگے بڑھے، وہ مسائل سے اعراض کرے اور مواقع کو استعمال کرکے اپنی زندگی کی تعمیر کرے۔

جہاں تک راقم الحروف کا تعلق ہے، میں کشمیر میں انڈیا کی فوجی یا سیاسی موجودگی کو کشمیریوں کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں سمجھتا۔ موجودہ جمہوری زمانہ میں سیاست صرف ایک دردِ سر ہے۔ اور فوج صرف سرحدوں کی چوکیدار۔ ۱۹۸۹ سے پہلے انڈیا کی فوج کشمیر کی سرحدوں پر رہتی تھی، وہ کشمیر کی بستیوں میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ مگر جب اکتوبر ۱۹۸۹ میں کشمیری تحریک کے لوگوں نے اسلحہ اٹھایا اور تشدد کا طریقہ اختیار کیا تو اس وقت انڈیا کی فوج اس سے مقابلہ کے لیے بستیوں میں داخل ہوئی۔ کیوں کہ جنگجو لوگ بستیوں میں رہ کر اپنی مسلح کارروائیاں کرتے تھے۔

تاہم بالفرض اگر کشمیری مسلمان ہندستانی فوج کی کشمیر میں موجودگی کو اپنے لئے راستے کا پتھر سمجھیں تب بھی ان کے لیے کامیابی اور ترقی کا راز وہی ہے جو فطرت کی زبان سے انھیں بتایا جارہا ہے۔ یعنی ـــــ مسائل کو نظر انداز کرو اور مواقع کو استعمال کرو:

Ignore the problems, avail the opportunities.

یہ کوئی مجبورانہ اصول نہیں جس کا تعلق صرف موجودہ کشمیر سے ہو۔ یہ ایک عالمی اصول ہے۔ اس کا تعلق ہر انسانی آبادی سے ہے۔ مزید یہ کہ زندگی کا یہی اصول فرد کے لئے بھی ہے اور قوم کے لئے بھی، یہی اصول مسلم ملک کے لیے بھی ہے اور غیر مسلم ملک کے لئے بھی۔

غیر حکیمانہ طریقہ

موجودہ دنیا میں کامیاب زندگی کا ایک اصول یہ ہے کہ جب کسی سے کسی مسئلہ میں نزاع پیدا ہو تو پہلے ہی مرحلہ میں یہ کیا جائے کہ جو کچھ مل رہا ہے اس کو رضامندی کے ساتھ قبول کر لیا جائے۔ اگر پہلے مرحلہ میں ایسا نہیں کیا گیا اور زیادہ حاصل کرنے کی خاطر مسئلہ کے تصفیہ کو لمبا کیا گیا تو مسئلہ اور پیچیدہ ہو جائے گا، اور پہلے مرحلہ میں جو کچھ مل رہا تھا اس کا ملنا بھی ناممکن ہو جائے گا۔

اس کی ایک مثال فلسطین کا موجودہ مسئلہ ہے۔ ۱۹۱۷ کا واقعہ ہے۔ برٹش امپائر نے فلسطین کی تقسیم کا ایک فارمولا بنایا۔ یہ عام طور پر بالفور ڈیکلریشن کے نام سے مشہور ہے۔ یہ تقسیم واضح طور پر عربوں کے حق میں تھی۔ اس تقسیم میں فلسطین کا ایک تہائی سے کم حصہ اسرائیل کو دیا گیا تھا اور اس کا دو تہائی سے زیادہ حصہ عربوں کے لیے خاص کیا گیا تھا۔ اس کے مطابق، یروشلم کا پورا شہر اور بیت المقدس کا پورا علاقہ عربوں کو ملا تھا۔ مگر اس وقت کی مسلم قیادت نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ایک عرب عالم نے حقیقت پسندی کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے اس کو قبول کر لینے کی بات کہی تو اس پر عرب مفاد سے غداری کا الزام لگایا گیا۔ وہ شخص یہ شعر کہہ کر مر گیا:

سیعلم قومی أننی لا أغشهم ومهما استطال اللیل فالصبح واصل

یعنی عنقریب میری قوم جان لے گی کہ میں نے اس کو دھوکہ نہیں دیا ہے۔ اور رات خواہ کتنی ہی لمبی ہو جائے صبح بہر حال آ کر رہتی ہے۔

اس وقت کی مسلم قیادت یا عرب قیادت اگر حقیقت پسندی کا طریقہ اختیار کرتی اور ابتدائی مرحلہ میں جو کچھ اس کو مل رہا تھا اس کو لے کر وہ اپنی ساری کوشش تعمیر و ترقی کے کام میں لگا دیتی تو آج فلسطین کے عرب مسلمانوں کی حالت وہاں کے یہود سے بدرجہا زیادہ بہتر ہوتی۔ مگر غیر حقیقت پسندانہ

اندازاختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ فلسطینیوں کے حصہ میں تباہی کے سوا کچھ نہ آیا۔

ٹھیک یہی معاملہ جموں اور کشمیر میں بھی پیش آیا ہے۔ کشمیری قیادت اور پاکستانی قیادت دونوں اس معاملہ میں بدترین نااہلی کا شکار ہوئی ہیں۔ واقعات بتاتے ہیں کہ کشمیر کا موجودہ مسئلہ خود اس کے قائدین کی نادانیوں کے نتیجہ میں پیش آیا نہ کہ کسی اور کے ظلم یا سازش کے نتیجہ میں۔

اس معاملہ میں مسلم قائدین کی نادانیوں کی فہرست بہت لمبی ہے۔ یہاں میں اس کے صرف ایک پہلو کا ذکر کروں گا۔ ۱۹۴۷ میں جب ملک تقسیم ہوا تو پاکستان کی قیادت ناقابلِ فہم طور پر دو مختلف ریاستوں کی دعویدار بن گئی — جونا گڈھ اور حیدر آباد۔ اگر پاکستان کی قیادت حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے جونا گڈھ اور حیدر آباد کی مدعی نہ بنتی جو پاکستان کو سرے سے ملنے والا ہی نہ تھا تو کشمیر کا معاملہ کبھی سنگین نہ بنتا۔ اس کا فیصلہ نہایت آسانی کے ساتھ پاکستان کے حق میں ہو جاتا۔ مگر پاکستانی قائدین کی دوطرفہ دوڑ کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں میں سے کوئی ایک بھی ان کے حصہ میں نہ آیا۔ یہاں میں اس سلسلے میں خود پاکستان کے دو حوالے نقل کروں گا۔

اس سلسلہ میں پہلا حوالہ چودھری محمد علی کا ہے۔ وہ ۵۶-۱۹۵۵ میں پاکستان کے پرائم منسٹر تھے۔ اس سے پہلے وہ لیاقت علی خاں کی حکومت میں منسٹر کی حیثیت سے شریک تھے۔ پاکستان کے حالات پر ان کی ایک ضخیم انگریزی کتاب چھپی ہے جس کا نام ایمرجنس آف پاکستان (Emergence of Pakistan) ہے۔

اس کتاب میں وہ لکھتے ہیں کہ تقسیم کے بعد جونا گڈھ کے مسلم نواب نے پاکستان کے ساتھ اپنی ریاست کا الحاق کر لیا جب کہ جونا گڈھ میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ انڈیا نے اس الحاق کو نہیں مانا اور پولیس ایکشن کے ذریعہ ریاست جونا گڈھ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد دہلی میں ایک میٹنگ ہوئی۔ اس میٹنگ میں ہندستان کی طرف سے جواہر لال نہرو اور سردار پٹیل شریک تھے۔ اور پاکستان کی طرف سے نواب زادہ لیاقت علی خاں اور چودھری محمد علی نے شرکت کی۔

مصنف لکھتے ہیں کہ سردار پٹیل اگرچہ پاکستان کے سخت دشمن تھے مگر وہ نہرو سے زیادہ حقیقت

پسند تھے۔ دونوں ملکوں کے وزیر اعظم کے درمیان ایک گفتگو میں، جس میں پٹیل اور میں دونوں موجود تھے، لیاقت علی خاں نے کشمیر اور جونا گڈھ کے معاملہ میں انڈیا کے متضاد رویہ پر تفصیلی کلام کیا۔ انھوں نے کہا کہ جونا گڈھ کے حکمراں کے پاکستان سے الحاق کے باوجود وہ انڈیا کا حصہ ہے۔ کیوں کہ وہاں کی اکثریت ہندو ہے تو کشمیر اپنی مسلم اکثریت کے ساتھ کیوں کر انڈیا کا حصہ بن سکتا ہے، صرف اس لیے کہ وہاں کے ہندو حکمراں نے انڈیا کے ساتھ ایک مشروط الحاق کے کاغذات پر دستخط کر دئے۔ اگر جونا گڈھ کے الحاق کی دستاویز جس پر وہاں کے مسلم حکمراں نے دستخط کئے ہیں اپنے اندر کوئی جواز نہیں رکھتی تو اس دستاویز کا بھی کوئی جواز نہیں جس پر کشمیر کے ہندو حکمراں نے دستخط کئے ہیں۔ اگر جونا گڈھ میں وہاں کے عوام کی خواہش اہمیت رکھتی ہے تو یہی اصول کشمیر کے لیے بھی ہونا چاہئے۔ انڈیا کشمیر اور جونا گڈھ دونوں کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

جب لیاقت علی خاں نے یہ بات کہی تو پٹیل اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکے اور پھٹ پڑے، انھوں نے کہا کہ تم جونا گڈھ کا موازنہ کشمیر سے کیوں کرتے ہو، حیدر آباد اور کشمیر کی بات کرو، اور ہم ابھی ایک تصفیہ تک پہنچ سکتے ہیں۔

پٹیل کا نظریہ اس موقع پر اور بعد کو بھی یہ تھا کہ مسلم اکثریت کے علاقے کو ان کی مرضی کے خلاف اپنے قبضہ میں رکھنا انڈیا کے لیے کمزوری کا ذریعہ ہوگا نہ کہ طاقت کا ذریعہ۔ ان کا احساس تھا کہ انڈیا اور پاکستان اگر اس پر راضی ہو جائیں کہ حیدر آباد انڈیا کے ساتھ ہو اور کشمیر پاکستان کے ساتھ، تو کشمیر اور حیدر آباد کا مسئلہ پُرامن طور پر حل کیا جا سکتا ہے۔ اس میں مشترک طور پر دونوں ہی کا فائدہ ہوگا:

> Sardar Patel, although a bitter enemy of Pakistan, was a greater realist than Nehru. In one of the discussions between the two Prime Ministers, at which Patel and I were also present, Liaquat Ali Khan dwelt at length on the inconsistency of the Indian stand with regard to Junagadh and Kashmir. If Junagadh, despite its Muslim ruler's accession to Pakistan belonged to India because of its Hindu majority, how could Kashmir, with its Muslim majority, be a part of India simply by virtue of its Hindu ruler having signed a

conditional instrument of accession to India? If the instrument of accession signed by the Muslim ruler of Junagarh was of no validity, the instrument of accession signed by Hindu ruler of Kashmir was also invalid. If the will of the people was to prevail in Junagadh, it must prevail in Kashmir as well. India could not claim both Junagadh and Kashmir. When Liaqut Ali Khan made these incontrovertible points, Patel could not contain himself and burst out: "Why do you compare Junagadh with Kashmir? Talk of Hyderabad and Kashmir, and we could reach an agreement." Patel's view at this time and even later was that India's effort to retain Muslim majority areas against the will of the people was a source not of strength but of weakness to India. He felt that if India and Pakistan agreed to let Kashmir go to Pakistan and Hyderabad to India, the problems of Kashmir and of Hyderabad could be solved peacefully and to the mutual advantage of India and Pakistan.

Chaudhry Muhammad Ali, *Emergence of Pakistan*, pp. 299-300

اگر پاکستانی لیڈر کا یہ بیان درست ہے تو یہ اس بات کا ناقابل تردید ثبوت ہے کہ کشمیر کا مسئلہ خود پاکستانی لیڈروں کا پیدا کردہ ہے، نہ کہ ہندستانی لیڈروں کا پیدا کردہ۔

اس سلسلہ میں دوسری مثال وہ ہے جو پاکستان کے ایک معروف لیڈر سردار شوکت حیات خاں کی کتاب میں ملتی ہے۔ ان کی یہ کتاب لاہور سے اردو میں ''گم گشتۂ قوم'' کے نام سے ۴۶۰ صفحات پر چھپی ہے۔ اس کتاب کا انگریزی نام یہ ہے:

The Nation that Lost its Soul.

یہاں اس کتاب کا ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے:

''بعد میں کشمیر پر حملہ کے دوران جب ماؤنٹ بیٹن لاہور آیا۔ ایک ڈنر جس میں لیاقت، گورنر مودی اور پنجاب کے چار وزیر موجود تھے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے پٹیل کا پیغام پہنچایا۔ پٹیل جو

ہندستان کی ایک طاقتور شخصیت تھا اس کا پیغام تھا کہ اس اصول کی پابندی کی جائے جو کانگریس اور مسلم لیگ کے مابین ریاستوں کے مستقبل کے بارے میں طے پایا تھا۔ وہ یہ کہ ریاست اپنے باشندوں کی اکثریت اور سرحدوں کے ساتھ ملاپ کی بنا پر پاکستان یا ہندستان کے ساتھ الحاق کریں گی۔ پٹیل نے کہلایا کہ پاکستان کشمیر لے لے اور حیدرآباد دکن کا مطالبہ چھوڑ دے۔ جہاں پر ہندو آبادی کی اکثریت تھی اور جس کا پاکستان کے ساتھ زمینی یا سمندری ذریعے سے کوئی اتصال بھی نہ تھا۔ یہ پیغام دینے کے بعد ماؤنٹ بیٹن گورنمنٹ ہاؤس میں آرام کرنے چلا گیا۔

میں کشمیر آپریشن کا مکمل نگراں تھا۔ میں نے لیاقت علی کے پاس جا کر انھیں تجویز دی کہ ہندستان کی فوج کشمیر میں داخل ہو چکی ہے۔ ہم قبائلیوں کی مدد سے اس کو باہر نکالنے اور کشمیر کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ یہاں تک کہ ہماری اس وقت کی فوج بھی اس کامیابی کے حصول میں شاید مددگار ثابت نہ ہو سکے گی۔ لہٰذا ہمیں پٹیل کی پیش کش کو ٹھکرانا نہیں چاہئے۔ نواب زادہ نے میری جانب مڑ کر کہا ''سردار صاحب کیا میں پاگل ہو گیا ہوں کہ میں کشمیر کے پہاڑوں اور ٹیلوں کے بدلے ریاست حیدرآباد دکن کو چھوڑ دوں جو پنجاب سے بھی بڑی ریاست ہے''۔

لیاقت علی خاں کے اس ردعمل کو دیکھ کر میں تو سن ہو گیا کہ ہمارا وزیر اعظم ملکی جغرافیہ سے اتنا بے خبر تھا۔ اس کی ذہانت کا یہ معیار کہ وہ حیدرآباد دکن کو کشمیر پر ترجیح دے رہا ہے۔ یہ تو احمقوں کی جنت میں رہنے والی بات تھی۔ حیدرآباد کا حصول ایک سراب تھا جب کہ کشمیر مل رہا تھا۔ کشمیر کی پاکستان کے ساتھ اہمیت سے وہ قطعی واقف نہیں تھے۔ چنانچہ احتجاج کے طور پر میں نے کشمیر آپریشن کی نگرانی سے استعفیٰ دے دیا۔ (صفحہ ۲۳۱۔۳۲)

پاکستانی لیڈر کے مذکورہ بیان کو اگر درست مان لیا جائے تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ کشمیر کا مسئلہ مکمل طور پر اور یک طرفہ طور پر خود مسلم قیادت کا پیدا کیا ہوا ہے، کسی اور کا نہیں۔ یہاں میں صرف یہ

اضافہ کروں گا کہ فطرت کے مسلّمہ قانون کے مطابق، کسی شخص یا قوم کے لیے ممکن نہیں کہ وہ اپنی غلطی کی قیمت دوسرے سے وصول کر سکے۔ اپنی غلطی کی قیمت آدمی کو بہر حال خود ادا کرنا پڑتا ہے، اور یقینی طور پر پاکستان کا اس میں کوئی استثناء نہیں۔

حقیقت پسند بنیے

اپریل ۱۹۸۶ء کے آخری ہفتہ میں امرتسر میں کچھ سکھوں نے بطور خود آزاد خالصتان کے قیام کا اعلان کر دیا۔ عین اسی زمانہ میں میں نے دہلی کے انگریزی اخبار ہندستان ٹائمس میں ایک مضمون شائع کیا جس کا عنوان یہ تھا— حقیقت کا اعتراف:

Acceptance of Reality.

میرا یہ مضمون پنجاب اور کشمیر دونوں کے بارے میں تھا۔ میں نے پنجابیوں اور کشمیریوں دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ علیٰحدہ پنجاب اور علیٰحدہ کشمیر کی تحریکیں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتیں۔ وہ حقیقت کی چٹان سے ٹکرانے کے ہم معنٰی ہیں۔ اس قسم کی کوشش سے کچھ لوگ اپنا سر تو توڑ سکتے ہیں مگر وہ صورت حال کو بدل نہیں سکتے۔ میں نے دونوں جگہ کے لوگوں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ حقیقت پسندی سے کام لیں اور صورت موجودہ (status quo) کو مان کر مثبت انداز میں اپنی زندگی کی تعمیر کریں۔

سکھ لوگ جلد ہی معاملہ کو سمجھ گئے۔ اور انھوں نے اس مسئلہ پر اپنی متشددانہ تحریک ختم کر دی۔ کشمیر کے لوگ بھی یقینی طور پر آخر کار یہی راستہ اختیار کریں گے مگر اس وقت جب کہ ان پر فارسی کا یہ شعر صادق آچکا ہوگا:

آں چہ دانا کند کند ناداں　　　لیک بعد از خرابیٔ بسیار

اس فرق کا سبب غالباً یہ ہے کہ سکھ لوگوں کے پاس اپنی تباہی کو جائز ثابت (justify) کرنے کے لئے کوئی شاندار نظریہ موجود نہ تھا۔ جب کہ دوسرے گروہ کے پاس ایسے شاندار نظریات موجود ہیں جن کے ذریعہ وہ خودکشی کے عمل کو اسلامی شہادت جیسا خوبصورت عنوان دے سکے۔

اس سلسلہ کا ایک تجربہ یہاں قابل ذکر ہے۔ ۲۷ جنوری ۱۹۹۲ کا واقعہ ہے۔ کشمیر کے دو

تعلیم یافتہ مسلمان دہلی آئے اور مجھ سے ملاقات کی۔ یہ لوگ خود تو کسی جنگجو تنظیم کے باضابطہ ممبر نہیں تھے مگر وہ کشمیر کی جنگجو تحریک کے پوری طرح حامی تھے۔ وہ عملی جنگجو نہ ہوتے ہوئے بھی پورے معنیٰ میں فکری جنگجو تھے۔

گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ آپ لوگوں کی نام نہاد تحریکِ کشمیر کسی بھی اعتبار سے درست نہیں۔ وہ نہ جہاد ہے اور نہ اس سے اسلامی نظام قائم ہونے والا ہے۔ اور نہ علیٰحدگی کی کوئی معنویت ہے۔ اس کا نتیجہ بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔ انھوں نے پر جوش طور پر اپنی موجودہ تحریک کی حمایت کی اور دعویٰ کیا کہ ہم جلد ہی ایک عظیم کامیابی حاصل کرنے والے ہیں۔ پھر انھوں نے میرے کہنے پر اپنے دستخط کے ساتھ حسب ذیل الفاظ میری ڈائری میں لکھے:

''ہندستان سے علیٰحدگی کے بعد جو کشمیر بنے گا، انشاء اللہ وہ کشمیر اسلامی کشمیر ہوگا''۔

اس کے بعد میں نے کہا کہ آپ لوگوں کی یہ بات بے بنیاد خوش فہمی کے سوا اور کچھ نہیں۔ آپ لوگوں کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ آپ کے اندازے کتنے زیادہ بے حقیقت تھے۔ پھر میں نے اپنی ڈائری میں ان کے سامنے یہ الفاظ لکھے:

بالفرض اگر کشمیر ہندستان سے علیٰحدہ ہو تو اس کے بعد جو آزاد کشمیر یا پاکستانی کشمیر بنے گا وہ ایک برباد کشمیر ہوگا۔ کشمیریوں کے لئے چوائس (choice) ہندستانی کشمیر یا پاکستانی کشمیر میں نہیں ہے۔ بلکہ ہندستانی کشمیر یا برباد کشمیر میں ہے۔

اس واقعہ پر اب دس سال پورے ہو رہے ہیں۔ اس دس سالہ تجربہ نے آخری طور پر یہ ثابت کیا ہے کہ مذکورہ کشمیری مجاہد کے الفاظ فرضی خوش فہمی کے سوا اور کچھ نہ تھے۔ اس کے برعکس، میں نے جو کچھ اللہ کی توفیق سے کہا وہ آج ایک ناقابل انکار حقیقت بن چکا ہے۔ واقعات نے یہ ثابت کیا ہے کہ موجودہ حالات میں کشمیر کا فائدہ نہ آزاد کشمیر بننے میں ہے اور نہ پاکستانی کشمیر بننے میں۔ کشمیر کا فائدہ ہر اعتبار سے یہ ہے کہ وہ ہندستان کا حصہ بن جائے اور ٹکراؤ کی پالیسی کو چھوڑ کر پر امن تعمیر کا طریقہ اختیار کرلے۔

کشمیر میں جو لوگ اپنے خیال کے مطابق، جہاد کی تحریک چلا رہے ہیں، وہ اپنے آپ کو

اسلام پسند کہتے ہیں۔ مگر صحیح یہ ہے کہ وہ اسلام پسند بننے سے پہلے حقیقت پسند بنیں۔ اسلام کا قلعہ حقیقت کی زمین پر کھڑا ہوتا ہے۔ خوش فہمی کی زمین پر کوئی بھی قلعہ نہیں بن سکتا، نہ اسلام کا اور نہ غیر اسلام کا۔

سیاسی ٹکراؤ سے احتراز

دانش مند آدمی کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ دانش مند انسان وہ ہے جو چیزوں کی اضافی حیثیت کو جانے:

A wise man is he who knows the relative value of things.

اس مقولہ کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ شاید کشمیر کے رہنماؤں میں کوئی بھی شخص نہیں جس کو اس مقولہ کے مطابق، دانش مند کہا جا سکے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے اقدام کو جانا مگر انھوں نے اپنے اقدام کے نتیجہ کو نہیں جانا۔

اس معاملہ کو قرآن کی ایک آیت کی روشنی میں سمجھئے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے جب ملکۂ سبا کے نام اپنا خط بھیجا اور اس سے اطاعت کا مطالبہ کیا تو اس نے اپنے درباریوں سے مشورہ کیا۔ درباریوں نے کہا کہ ہمارے پاس فوجی طاقت ہے پھر ہم کیوں کسی غیر کی اطاعت قبول کریں۔ اس کا جواب جو ملکۂ سبا نے دیا وہ قرآن میں اس طرح بیان ہوا ہے:

ملکۂ سبا نے کہا کہ بادشاہ لوگ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو وہ اس کو خراب کر دیتے ہیں اور اس کے عزت والوں کو ذلیل کر دیتے ہیں۔ اور یہی یہ لوگ کریں گے۔ (النمل ۳۴)

قرآن میں یہ واقعہ جو نقل کیا گیا ہے، اس سے ایک نہایت اہم حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ طاقتور حکمراں سے ٹکراؤ کرتے ہوئے یہ سوچنا چاہئے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ نتیجہ اگر منفی نکلتا ہو تو اعراض کیا جائے گا نہ کہ ٹکراؤ۔ تجربہ بتاتا ہے کہ طاقتور حکمراں سے ٹکراؤ کا نتیجہ ہمیشہ الٹی صورت میں نکلتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں آبادیاں تباہ ہوتی ہیں اور عزت والے لوگوں کو ذلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سیاسی ٹکراؤ کا یہ تباہ کن نتیجہ ہمیشہ ظاہر ہوتا ہے، خواہ حکمراں کوئی بھی ہو، اور خواہ وہ کوئی صالح انسان کیوں نہ ہو۔

طاقتور حکمراں سے ٹکراؤ ہر حال میں اس قابل ہے کہ اس سے بچا جائے۔ اگر کچھ لوگ اس نصیحت کی پروا نہ کریں اور وہ طاقتور حکمراں سے براہِ راست ٹکرا جائیں تو اس کے بعد ان کے لیے جان و مال کی تباہی کی شکایت کرنا لاحاصل ہے۔ انھیں جاننا چاہئے کہ جو تباہی انھیں پیش آرہی ہے وہ در اصل ٹکراؤ کی قیمت ہے۔ جو لوگ اقتدار کے خلاف مسلّح ٹکراؤ کی پالیسی اختیار کریں ان کو بہر حال یہ قیمت دینی پڑے گی۔ اس دنیا میں یہ ممکن نہیں کہ غلطی کوئی ایک گروہ کرے اور اس کی قیمت کسی اور گروہ کی طرف سے ادا کی جائے۔

کشمیری لیڈروں اور پاکستانی لیڈروں کی طرف سے اکثر ایسے مضامین چھپتے ہیں جن کا عنوان ہوتا ہے زخمی کشمیر (Wounded Kashmir) یا زخمی وادی (Wounded Valley)، وغیرہ۔ ان مضامین میں بتایا جاتا ہے کہ انڈیا کی فوج کس طرح کشمیر کے لوگوں پر ظلم کر رہی ہے۔ اس قسم کی رپورٹیں ساری دنیا میں ہزاروں کی تعداد میں چھاپ کر شائع کی گئی ہیں۔ مگر عملاً ان کا کوئی بھی مثبت فائدہ نہیں۔ اس قسم کی تمام رپورٹیں بے فائدہ چیخ و پکار بن کر رہ گئی ہیں۔

فریاد و احتجاج کی اس بے اثری کی شکایت کشمیریوں کو کسی اور سے کرنے کے بجائے خود اپنے آپ سے کرنا چاہئے۔ ان کشمیریوں کے لئے ملکہ سبا کے مذکورہ واقعہ میں بہت بڑا سبق ہے۔ ملکہ سبا نے یہ حکیمانہ پالیسی اختیار کی کہ فوجوں کے ظلم وستم کی نوبت ہی نہ آئے۔ اس کے برعکس کشمیریوں نے اپنی بے دانشی کے تحت فوجوں کو دعوت دی کہ وہ ان پر ٹوٹ پڑیں اور انھیں اپنے تشدّد کا نشانہ بنائیں۔ کشمیریوں نے ''آ بیل مجھے مار'' کا طریقہ اختیار کیا، اور ملکہ سبا نے بیل سے اعراض کا۔ یہی ایک جملہ میں کشمیر کی پوری کہانی کا خلاصہ ہے۔

کشمیر کے لوگ آج جس مسئلہ سے دوچار ہیں اس کے حل کا آغاز یہ ہے کہ وہ اس معاملہ میں اپنی غلطی کا اعتراف کریں اور قرآن میں بتائے ہوئے ملکہ سبا کے واقعہ سے سبق لے کر اپنی زندگی کی تعمیر کی از سرِ نو منصوبہ بندی کریں۔ اس کے سوا اس مسئلہ کا اور کوئی حل نہیں۔

حکمت کا تقاضا

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **لاتشددوا علی انفسکم فیشدد علیکم** (سنن ابی داؤد، کتاب الادب)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم تشددوالا طریقہ اختیار نہ کرو۔ ورنہ تمہارے حالات اور زیادہ شدید ہو جائیں گے۔ موجودہ زمانہ میں اس کی مثال ہر اس مسلم ملک میں پائی جاتی ہے جہاں اپنے مقصد کے حصول کے لئے متشددانہ طریقہ اختیار کیا گیا۔ انھیں میں سے ایک کشمیر بھی ہے۔

کشمیر میں جو تشدد کلچر چلایا گیا، اس کا فائدہ تو کچھ نہیں ہوا البتہ نقصان اتنا زیادہ ہوا جس کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا — معیشت تباہ ہوگئی، تعلیمی نظام درہم برہم ہوگیا، تقریباً ایک لاکھ آدمی ہلاک ہوگئے۔ اس سے زیادہ لوگ وہ ہیں جو جسمانی معذوری کا شکار ہوکر زندگی گزارنے پر مجبور ہوگئے۔ اخلاقی روایات ٹوٹ گئیں۔ جس کشمیریت کے نام پر تحریک چلائی گئی وہ کشمیریت تباہ ہوکر رہ گئی۔ انھیں میں سے ایک عظیم نقصان یہ ہے کہ کشمیر کے بیشتر باصلاحیت اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ کشمیر کو چھوڑ کر باہر کے علاقوں میں چلے گئے۔

کشمیر کی ٹورسٹ انڈسٹری اپنے اندر بہت سے فوائد رکھتی تھی۔ اس کی بدولت تجارتی سرگرمیاں یہاں سال بھر جاری رہتی تھیں۔ مگر اب یہ حال ہے کہ وہاں کی ٹورسٹ انڈسٹری تقریباً ختم ہوگئی ہے۔ ایک کشمیری نے کہا کہ اس ٹورسٹ انڈسٹری کی بدولت کشمیر کا یہ حال تھا کہ ہم پتھر لے کر سڑک پر بیٹھ جاتے تھے تو وہ بھی ایک قیمتی سودے کی طرح بکتا تھا مگر آج یہ حال ہے کہ ہمارے سیب کا بھی کوئی خریدار نہیں۔ کشمیری عوام کے نام پر اٹھائی جانے والی اس تحریک کا کوئی فائدہ کشمیری عوام کو تو نہیں ملا البتہ کشمیر کے نام نہاد لیڈروں کو ضرور اس سے فائدہ پہنچا۔

قرآن نے مؤمنین کو جو تعلیم دی ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ — تم لوگ اس چیز پر غم نہ کرو جو تم سے کھویا گیا۔ (الحدید ۲۳)

یہ آیت دراصل فطرت کے اس قانون کو بتاتی ہے جو اللہ نے اس دنیا میں مقرر کیا ہے۔ اس

قانون کے مطابق، ہر انسان اور ہر گروہ کے ساتھ لازمی طور پر کھونے کا تجربہ پیش آتا ہے۔ کوئی بھی فرد یا قوم فطرت کے اس قانون سے مستثنیٰ نہیں۔ یہ اللہ کی اس حکمت تخلیق کا ایک جزء ہے جس کے تحت اس نے اس دنیا کو بنایا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ یہ اللہ کا قانون ہے اور اللہ کے قانون کو بدلنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔

مگر اسی کے ساتھ فطرت کا دوسرا لازمی قانون یہ ہے کہ اس دنیا میں مواقع (opportunities) کبھی ختم نہ ہوں۔ اس دنیا میں جب بھی ایک موقع ختم ہوتا ہے تو فوراً ہی دوسرا موقع اس کے ساتھ لگا ہوا چلا آتا ہے۔ اس لئے عقل مندی یہ ہے کہ آدمی کھوئے ہوئے موقع کو بُھلائے اور نئے موقع کو استعمال کرے۔ یہی آج کشمیریوں کو کرنا چاہیے۔

استحصالی لیڈر محرومیوں کے نام پر اپنی لیڈری چلاتا ہے۔ حقیقی لیڈر وہ ہے جو یافت کے اصول پر اپنی تحریک چلائے۔ جو موانع کے بجائے مواقع کی نشان دہی کر کے اپنی قوم کو نئے مستقبل کا راستہ دکھائے۔

امن اور انصاف

امن کے ساتھ آپ ابدی طور پر رہ سکتے ہیں مگر جنگ آپ ابدی طور پر نہیں لڑ سکتے — کشمیر کے لیڈروں کو شاید اس آزمودہ تاریخی حقیقت کا علم نہیں۔ وہ اپنی بے نتیجہ جنگ کو مسلسل طور پر جاری رکھے ہوئے ہیں یہاں تک کہ یہ بے نتیجہ جنگ اب خودکش بم باری کی حد تک پہنچ چکی ہے۔ ان لوگوں کو معلوم نہیں کہ خودکش بم باری کا طریقہ جاپان نے دوسری عالمی جنگ میں ان کے مقابلہ میں ہزار گنا زیادہ بڑے پیمانہ پر استعمال کیا مگر وہ مکمل طور پر ناکام رہا۔ دنیا میں کبھی کوئی بادشاہ بھی کسی جنگ کو ابدی طور پر جاری نہ رکھ سکا۔ پھر کشمیر کے کمزور عوام کس طرح اس بے نتیجہ جنگ کو ابدی طور پر جاری رکھ سکتے ہیں۔ آخر کار جو کچھ ہونے والا ہے وہ یہ کہ کشمیر کے جنگجو تھک جائیں اور مجبورانہ طور پر اپنی جنگ کو ختم کر دیں۔ مگر صحیح یہ ہوگا کہ کشمیر کے لوگ دانش مندی کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے خود اپنے فیصلہ کے تحت اس تباہ کن جنگ کا خاتمہ کر دیں۔

کشمیر کے ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے بات ہوئی۔ میں نے کہا کہ کشمیر میں سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ امن (peace) ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم بھی امن چاہتے ہیں، مگر کون سا امن۔ امن وہ ہے جس کے ساتھ انصاف ملے، جس امن کے ساتھ انصاف شامل نہ ہو وہ تو صرف ظالموں کے لیے مفید ہے، نہ کہ مظلوموں کے لیے۔

میں نے کہا کہ یہ سب سے زیادہ سنگین غلط فہمی ہے جس میں تمام دنیا کے مسلم رہنما مبتلا ہیں۔ امن کی تعریف عدم جنگ (absence of war) سے کی جاتی ہے۔ اور یہ بالکل صحیح تعریف ہے۔ امن کبھی انصاف کے لئے نہیں ہوتا۔ امن صرف اس لئے ہوتا ہے کہ انصاف کے حصول کی کوشش کے لئے کارگر فضا حاصل ہو سکے۔ یہی عقل کے مطابق بھی ہے اور یہی اسلام کے مطابق بھی۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے جب حدیبیہ کا امن معاہدہ کیا تو اس میں آپ کو صرف امن ملا تھا، انصاف نہیں ملا تھا۔ البتہ جب امن کے ذریعہ معتدل حالات پیدا ہوئے تو آپ نے ان حالات میں عمل کر کے بعد کو انصاف بھی حاصل کر لیا۔ انصاف کبھی امن کا جزء نہیں ہوتا، انصاف ہمیشہ امن کے بعد حاصل شدہ مواقع کو استعمال کرنے سے ملتا ہے، نہ کہ براہ راست طور پر خود امن سے۔

کشمیر کی متشددانہ تحریک کے رہنماؤں سے بات کی جائے تو وہ ہمیشہ اور یکساں طور پر ایک بات کو دہراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ یہ کہ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ اقوام متحدہ کی تجویزوں کی روشنی میں ہمارے معاملہ کا فیصلہ کیا جائے۔ بالفاظ دیگر یہ کہ کشمیر میں (referendom) کرایا جائے۔ قانونی یا منطقی طور پر اس بات کا بے وزن ہونا اس وقت ساری دنیا کو معلوم ہو گیا جب کہ اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل کوفی عنان نے اپنے ایک دورہ کے درمیان اسلام آباد میں یہ اعلان کیا کہ کشمیر کے بارے میں اقوام متحدہ کا رزولیوشن اب غیر متعلق (irrelevant) ہو چکا ہے۔

تاہم اس سے قطع نظر میں ایک اصولی بات کہوں گا۔ وہ یہ کہ اپنا حق خود اپنی طاقت سے حاصل کیا جاتا ہے۔ دوسرے کی طاقت کے زور پر کبھی کسی نے اپنا حق حاصل نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ قسم کا نظریہ صرف کسی خوش فہم انسان کے دماغ میں جگہ پا سکتا ہے۔ عالم واقعہ میں ایسے کسی

نظریہ کا وجود نہیں۔ اب کشمیریوں کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ وہ تاریخ میں اپنا نام خوش فہم قوم کی حیثیت سے لکھوانا چاہتے ہیں یا حقیقت شناس قوم کی حیثیت سے۔

اسلامی تحریک نہیں

کشمیر کے جنگجو مسلمان اپنی موجودہ جنگ کو اسلامی جہاد کہتے ہیں۔ یہ ایک سخت قسم کا مغالطہ ہے جس میں یہ حضرات مبتلا ہیں۔ اس معاملہ میں ہمارے علماء کی ناقابلِ فہم خاموشی نے ان کے اس یقین میں مزید اضافہ کیا ہے۔ کشمیر کی موجودہ جنگ یقینی طور پر جہاد نہیں۔ اس میں حصہ لینے والے کو ہرگز جہاد کا انعام نہیں مل سکتا۔

جس طرح نماز کی شرطیں ہیں اسی طرح جہاد فی سبیل اللہ کی بھی شرطیں ہیں اور کشمیر کی لڑائی ان شرطوں پر پوری نہیں اترتی — جہاد کے لئے ایک باقاعدہ امیر ہونا چاہئے۔ جہاد کے لئے ایک بااختیار مسلم علاقہ بطور مرکز ہونا چاہئے۔ جہاد کے لئے پہلے ضروری تیاری ہونی چاہیے۔ جہاد ملک و مال کے لیے نہیں ہوتا بلکہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے ہوتا ہے، وغیرہ۔ اور یہ ایک واقعہ ہے کہ کشمیر کی لڑائی ان میں سے کسی بھی شرط پر پوری نہیں اترتی۔ کشمیر کی موجودہ لڑائی کو یا تو گوریلا وار کہا جا سکتا ہے یا پراکسی وار۔ اور ان دونوں ہی قسم کی جنگوں کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ گوریلا وار اس لئے غیر اسلامی ہے کہ اسلام میں جہاد حاکم کا کام ہے نہ کہ عوام کا کام۔ اور پراکسی وار اس لئے غیر اسلامی ہے کہ جو حکومت اس پراکسی وار کو چلا رہی ہے اس نے اس کا اعلان نہیں کیا اور اسلامی جنگ کے لئے کھلا اعلان لازمی شرط ہے۔

اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے تو کشمیر کی موجودہ ناکام جنگ کشمیریوں کو یہ پیغام دے رہی ہے کہ ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر تم اپنی لڑائی کو بند کر دو۔ اس لئے کہ اس لڑائی میں تمھارے لئے دنیا کی تباہی بھی ہے اور آخرت کی تباہی بھی۔ دنیا کی تباہی اس لئے کہ تم ضروری تیاری کے بغیر لڑ رہے ہو۔ اور آخرت کی تباہی اس لئے کہ تم جہاد کے نام سے ایک ایسی لڑائی لڑ رہے ہو جو اسلامی اصول کے مطابق جہاد ہی نہیں۔

سیاسی آزادی کی تحریک کوئی اسلامی تحریک نہیں، وہ سرتاسر ایک قومی تحریک ہے۔ ایسی کوئی

تحریک اگر قومیت کے نام پر چلائی جائے تو اس میں بظاہر کوئی حرج نہیں لیکن اگر ایسی کوئی تحریک اسلامی جہاد کے نام پر چلائی جائے تو یقینی طور پر وہ ایک غلط تحریک بن جائے گی۔

پیغمبروں میں سے کسی بھی پیغمبر نے ملکی آزادی یا سیاسی آزادی کے نام پر کوئی تحریک نہیں چلائی۔ حالانکہ اکثر پیغمبروں کے زمانہ میں عین وہی حالات موجود تھے جن میں سیاسی لیڈر آزادیٔ وطن کی تحریک چلایا کرتے ہیں۔ مثلاً یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں ایک مشرک اور غیر ملکی خاندان مصر کے اوپر حکمراں تھا۔ مگر حضرت یوسف نے مذکورہ قسم کی سیاسی تحریک ملک میں نہیں اٹھائی۔ حضرت یوسف کے بعد اس طرح کی تحریک ملک میں اٹھی مگر وہ ملک کے قومی لیڈروں نے چلائی تھی، نہ کہ حضرت یوسف یا ان کے ساتھیوں نے۔

کشمیر کے مسلمان اگر اپنی جدوجہد کو اسلامی بنانا چاہتے ہیں تو ان پر لازم ہے کہ سب سے پہلے وہ اپنی جدوجہد کی موجودہ صورت کو ختم کریں۔ وہ اس روش سے باز آئیں کہ انھوں نے سراسر ایک قومی تحریک چلائی اور اس کے اوپر اسلام کا لیبل لگا دیا۔ اس قسم کی تحریک کو کبھی اللہ کی نصرت نہیں مل سکتی۔

کشمیر کے مسلمان اکثر یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ ہم تو دو پاٹوں کے درمیان پس رہے ہیں۔ ایک طرف انڈین فوج اور دوسری طرف جنگجو۔ پھر اس پر اضافہ کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ اصل یہ ہے کہ پہلے جب یہ کشمیری جہاد شروع ہوا تو اس میں اچھے لوگ موجود تھے مگر اب کشمیر کی لڑائی برے لوگوں کے ہاتھ میں آ گئی ہے۔

یہ ایک سخت قسم کا مغالطہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ گوریلا وار کا انجام ہمیشہ اور ہر جگہ یہی ہوتا ہے۔ گوریلا وار پہلے بظاہر اچھے لوگ شروع کرتے ہیں مگر بعد کو اس میں برے لوگ شامل ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کہ اس میں شامل ہو کر انھیں اسلامی جہاد یا وطنی آزادی کا شلٹر (shelter) مل جاتا ہے جس کے زیر سایہ وہ اپنی لوٹ مار کو مقدس طور پر جاری رکھ سکیں۔

مذکورہ قسم کا عذر کشمیریوں کے لئے کوئی کام آنے والا نہیں۔ انھیں یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ گوریلا وار شروع کرنا اول دن ہی سے ایک غلطی تھی۔ اس طرح کے حالات میں اپنی غلطی کا

اعتراف کرنا پہلا قدم ہوتا ہے، نہ کہ دوسرے کو ذمہ دار ٹھہرانا۔

ممکن کی سیاست

زندگی نام ہے دوسرے موقع (second chance) کو استعمال کرنے کا۔ یہ تاریخی حقیقت کشمیر کے بارے میں بھی اتنا ہی درست ہے جتنا کہ دوسرے ملکوں کے بارے میں۔ مثلاً انڈیا کے لئے پہلا موقع یہ تھا کہ آزادی کے بعد وہ ایک متحد ہندستان کی صورت میں دنیا کے نقشہ پر ابھرے۔ مگر یہ پہلا موقع اس کے لئے مقدر نہ ہوسکا۔ اس کے بعد یہاں کے لیڈروں نے دوسرے ملے ہوئے موقع کو استعمال کیا اور اب انڈیا نہایت تیزی کے ساتھ ایک طاقتور اور ترقی یافتہ ملک کی صورت میں ابھر رہا ہے۔ یہی معاملہ پاکستان کے ساتھ پیش آیا۔ پاکستانی لیڈروں کا پہلا خواب یہ تھا کہ مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان، دونوں کے مجموعہ کی صورت میں وہ ایک بڑا ملک بنائیں۔ مگر ۱۹۷۲ میں یہ پہلا موقع ان کے لئے ختم ہوگیا۔ اس کے بعد انھوں نے دوسرے حاصل شدہ موقع کو استعمال کیا۔ اور اب پاکستان مسلم دنیا کے ایک اہم ملک کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ یہی معاملہ کسی نہ کسی صورت میں دنیا کے ہر ملک کے ساتھ پیش آیا۔ ہر ملک نے کسی نہ کسی صورت میں پہلے موقع کو کھویا ہے۔ مگر دوسرے موقع کو استعمال کرکے اس نے دوبارہ نئی زندگی حاصل کرلی ہے۔

یہی معاملہ کشمیر کا ہے۔ کشمیر کے لیڈروں نے ۱۹۴۷ سے پہلے کشمیر کے بارے میں ایک سیاسی خواب دیکھا تھا۔ یہ گویا ان کے لئے پہلا موقع تھا۔ مگر ۱۹۴۷ کے انقلاب کے بعد یہ پہلا موقع ان سے کھویا گیا۔ اب کشمیر کے لوگوں کے لئے صحیح اور ممکن طریقہ یہ ہے کہ وہ دوسرے موقع کو استعمال کریں، وہ دوسرے موقع کو استعمال کرتے ہوئے کشمیر کی نئی تعمیر کریں۔

کشمیری لیڈر کشمیر کو ایک آزاد کشمیر کی صورت میں دیکھنا چاہتے تھے۔ بظاہر یہ ناممکن نہ تھا۔ مگر ۱۹۴۷ کے بعد حالات میں جو فیصلہ کن تبدیلی ہوئی ہے اس نے اب اس کو ناممکن بنا دیا ہے کہ برصغیر ہند کے نقشہ میں آزاد کشمیر کے نام سے کوئی مستقل ملک بنے۔ اب حالات کے اعتبار سے جو چیز ممکن ہے وہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ دستور ہند کی دفعہ ۳۷۰ کے مطابق وہ انڈیا کا ایک حصہ بنے۔ کشمیری

لیڈر اب تک ناممکن کی سیاست چلا رہے تھے۔ اب انھیں حقائق کا اعتراف کرتے ہوئے وہ ممکن سیاست چلانا چاہئے جو بروقت ان کے لیے قابل حصول ہے۔

کشمیر کے بارے میں اس حقیقت کا اندازہ مجھے خدا کے فضل سے ملکی آزادی کے بعد ہی ہو گیا تھا۔ تاہم اس پر میرا پہلا تحریری بیان غالباً وہ ہے جو ۱۹۶۸ میں چھپا تھا۔ یہ پورا بیان اس مجموعہ میں دوسرے مقام پر موجود ہے۔

کشمیریوں کے لیے واحد درست مشورہ یہ ہے کہ وہ ماضی کو بھلا کر حال میں جینا سیکھیں۔ وہ حال کے ممکن نقشہ میں اپنی زندگی کی تعمیر کریں، نہ کہ ماضی کے نقشہ میں جو کہ اب عملاً خیالی اور تصوراتی بن چکا ہے۔

کشمیر کے بارے میں پاکستان اگر اعتراف حقیقت کی پالیسی اختیار کر لے تو یہ پاکستان کے لیے کوئی نئی چیز نہ ہوگی۔ اس سے پہلے وہ بنگلہ دیش (سابق مشرقی پاکستان) کے بارے میں اعتراف حقیقت کی یہی پالیسی اختیار کر چکا ہے۔ ایسی حالت میں پاکستان کے لیے اس معاملہ میں کوئی عذر باقی نہیں رہتا۔

عالمی امکانات

کشمیر کے مسلمانوں کو فطری طور پر کئی پلس پوائنٹ حاصل ہیں جن پر انھوں نے غالباً ابھی تک غور نہیں کیا۔ انھیں میں سے ایک یہ ہے کہ انڈیا کے ساتھ مل کر وہ دنیا کے سب سے بڑے مسلم ملک کی حیثیت حاصل کر سکتے ہیں۔ نہ صرف پاکستان اور بنگلہ دیش سے زیادہ بلکہ کسی بھی دوسرے مسلم ملک سے زیادہ۔ یہ کشمیری مسلمانوں کا ایک ایسا پلس پوائنٹ ہے جس کو اگر وہ شعوری طور پر جان لیں تو وہ زندگی کی سب سے بڑی نعمت کو حاصل کر سکتے ہیں، یعنی اعتماد اور بلند حوصلہ، اور احساس کمتری سے مکمل طور پر پاک ہونا۔

کشمیر کے مسلمان اپنے نادان لیڈروں کی غلط رہنمائی کے نتیجہ میں اپنے لئے پہلا موقع کھو چکے ہیں۔ تاہم اب بھی دوسرا موقع ان کے لیے موجود ہے۔ دوسرے موقع کو استعمال کر کے وہ اب بھی وہ

سب کچھ حاصل کر سکتے ہیں جس کو وہ چاہتے ہیں۔

یہ کشمیریوں کی خوش قسمتی ہے کہ جب وہ بظاہر پہلا موقع کھوکر دوسرے موقع کے دور میں داخل ہوئے تو خود زمانہ میں ایسا انقلاب آ گیا کہ ساری زمین ایک عالمی گاؤں (global village) کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ اب سیاسی نظام کی تبدیلی خود ایک اضافی (relative) چیز بن چکی ہے۔ نئے حالات میں انسان کے لئے ممکن ہوگیا ہے کہ وہ زمین کے ایک گوشہ میں رہ کر عالمی ربط قائم کر سکے۔ وہ بظاہر حکومتی اقتدار پر فائز نہ ہوتے ہوئے بھی وہ سارے فوائد حاصل کر سکے جو قدیم زمانہ میں صرف سیاست وحکومت کا حصہ سمجھے جاتے تھے۔

موجودہ زمانہ میں اس کی مثال سنگاپور اور جاپان جیسے ممالک ہیں۔ وہ بظاہر محدود جغرافیہ کے مالک ہوتے ہوئے عالمی جغرافیہ کے فوائد حاصل کر رہے ہیں۔ یہی عالمی امکانات کشمیریوں کے لیے بھی پوری طرح کھلے ہوئے ہیں۔ بشرطیکہ وہ دانش مندانہ عمل کے ذریعہ ان کو اپنے حق میں استعمال کرسکیں۔

دونوں کی جیت

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی زمین پر دو آدمیوں یا دو گروہوں کے درمیان نزاع ہو جاتی ہے۔ زمین کا کچھ حصہ ایک گروہ کے پاس ہوتا ہے اور بقیہ حصہ دوسرے گروہ کے پاس۔ اب ایک صورت یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے حصہ کو چھیننے کے لئے آپس میں لڑتے رہیں، یہاں تک کہ دونوں تباہ ہو جائیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ دونوں اس پر راضی ہو جائیں کہ جو حصہ جس گروہ کے قبضہ میں ہے، وہ اس کے پاس رہے اور دونوں باہمی لڑائی کو چھوڑ کر اپنے اپنے حصہ کی تعمیر وترقی میں مصروف ہو جائیں۔ نزاع کے حل کے اس طریقہ کو امریکی اصطلاح میں، میں بھی جیتا، تم بھی جیتے (win-win solution) کہا جاتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ جموں اور کشمیر کے سوال پر انڈیا اور پاکستان کے لئے یہی بہترین قابل عمل فارمولا ہے۔ دونوں ملکوں کے قبضہ میں جموں اور کشمیر کا ایک ایک حصہ ہے۔ دونوں اگر وِن وِن

سولوشن کے اصول پر اپنے اپنے حصہ پر راضی ہو جائیں اور جھگڑے کا راستہ چھوڑ کر حاصل شدہ کی تعمیر پر اپنی بھرپور کوشش لگا دیں تو یقینی طور پر یہ دونوں ملکوں کے لئے نہایت مفید ثابت ہوگا۔ دونوں کے یہاں ترقی کا وہ سفر شروع ہو جائے گا جو لمبی مدت سے رکا ہوا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ پاکستان کے پاس ریاست جموں اور کشمیر کا جو حصہ ہے وہ مقابلۃً کم ہے۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں رقبہ کی کمی یا بیشی کی حیثیت محض اضافی ہے۔ اصل اہمیت یہ ہے کہ اپنے حاصل شدہ رقبہ کو محنت اور دانش مندی کے ساتھ استعمال کیا جائے۔

دنیا میں اس کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں۔ مثلاً دبئی، ہانگ کانگ، تائی وان، سنگا پور، وغیرہ رقبہ کے اعتبار سے بہت چھوٹے ہیں، مگر ترقی اور خوشحالی کے اعتبار سے وہ بہت سے بڑے بڑے ملکوں سے بہتر حالت میں ہیں۔

انسان ایک نفسیاتی مخلوق ہے۔ یہ دراصل نفسیات ہے جو کسی انسان کی شخصیت کی تشکیل کرتی ہے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ کسی انسان کے اندر اگر منفی نفسیات پیدا ہو جائے تو اس کی پوری شخصیت منفی شخصیت بن جائے گی۔ اس کے برعکس اگر کسی کی نفسیات مثبت نفسیات بن جائے تو اس کی پوری شخصیت مثبت شخصیت میں ڈھل جائے گی۔

جموں اور کشمیر کا مسئلہ ۱۹۴۷ سے انڈیا اور پاکستان کے درمیان تلخی کا سبب بنا ہوا ہے۔ اس لمبی مدت میں دونوں ایک دوسرے کو حریف کی نظر سے دیکھتے رہے ہیں۔ دونوں کا احساس یہ رہا ہے کہ فریقِ ثانی نے اس کا حق چھین رکھا ہے۔ اس دوطرفہ احساس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں گویا ''میں بھی ہارا، تم بھی ہارے'' کی نفسیات میں جیتے رہے۔ دونوں پڑوسیوں کے درمیان وہ معتدل فضا باقی نہ رہی جو دونوں ہی کی ترقی کے لیے ضروری تھی۔

اب اگر دونوں ملک دانش مندی سے کام لیتے ہوئے ''میں بھی ہارا، تم بھی ہارے'' کی منفی نفسیات سے باہر آجائیں اور اس کے بجائے، دونوں ''میں بھی جیتا، تم بھی جیتے'' کے مثبت فارمولے کو اختیار کر لیں تو اچانک دونوں ملکوں کے درمیان انسانی ترقی کے نئے دروازے کھل جائیں گے۔ اس کے بعد وہ حقیقی

انڈیا اور وہ حقیقی پاکستان بننا شروع ہو جائے گا جس کا خواب دونوں ملکوں کے بانیوں نے دیکھا تھا۔

اب تک دونوں پڑوسی ملک اس احساس میں جیتے رہے ہیں کہ سرحد کے دوسری طرف سے انھیں ایک دشمن ملک کا خطرہ درپیش ہے، اس کے بعد دونوں یہ محسوس کرنے لگیں گے کہ سرحد کے دوسری طرف ان کا ایک دوست ملک موجود ہے۔ اب تک دونوں ملک محرومی کے احساس میں جی رہے تھے، اس کے بعد دونوں ملک یافت کے احساس میں جینے لگیں گے۔ اب تک دونوں ملک اپنے آپ کو مسائل میں گھرا ہوا سمجھتے تھے، اس کے بعد دونوں ملک یہ محسوس کریں گے کہ وہ کھلے ہوئے مواقع کے درمیان ہیں۔ بظاہر جغرافی اور سیاسی تقسیم کے باوجود دونوں ملکوں کے درمیان ایک برتر انسانی اور تعمیری وحدت قائم ہو جائے گی۔ اور یہ سب کرشمہ ہوگا اس بات کا کہ دونوں نے وِن وِن سولیوشن کے طریقہ کو اختیار کر لیا۔

حل کی طرف

موجودہ حالت میں پاکستان کے لئے جو انتخاب (choice) ہے وہ جمہوری حکومت اور فوجی حکومت کے درمیان نہیں ہے بلکہ حقیقی انتخاب جن دو حالتوں کے درمیان ہے وہ یہ کہ پاکستان کا سفر جس بند گلی (impasse) پر آ کر رک گیا ہے وہاں سے وہ اپنے آپ کو نکال کر اپنا سفر دوبارہ شروع کرے یا وہ اسی بند گلی میں بدستور پڑا رہے۔ یہاں تک کہ وہ قوموں کے عالمی روڈ میپ سے غیر موجود ہو جائے۔

کسی قوم کی زندگی میں بعض اوقات ایسا لمحہ آتا ہے جب کہ قوم کا ترقیاتی سفر رک جاتا ہے۔ اس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ ایک جرأت مندانہ فیصلہ کیا جائے تاکہ دوبارہ قوم کا سفر معتدل انداز میں جاری ہو سکے۔ اس قسم کا نازک فیصلہ اکثر اوقات عوامی جذبات کے خلاف ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کا جرأت مندانہ فیصلہ اکثر ایسے افراد کرتے ہیں جو فوجی حکمراں کی حیثیت رکھتے ہوں۔ جمہوری حکمراں اس قسم کا جرأت مندانہ فیصلہ نہیں لے سکتا۔ کیوں کہ وہ عوام کی رایوں سے چن کر حکومت تک پہنچتا ہے، اس بنا پر اس کے لئے ایسا کوئی انقلابی فیصلہ لینا ناممکن ہو جاتا ہے جو عوامی احساسات سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔

یہاں میں اس نوعیت کی دو مثالیں پیش کروں گا۔ مسلم تاریخ میں اس کی ایک مثال صلاح الدین ایوبی (وفات ۱۱۹۳ء) کی ہے۔ صلاح الدین کا یہ عظیم کارنامہ سمجھا جاتا ہے کہ اس نے صلیبی قوموں کی فوجی یلغار سے مسلم دنیا کو بچایا۔ مگر صلاح الدین کو یہ طاقتور حاکمانہ حیثیت کیسے ملی جب کہ وہ اپنا یہ عظیم رول ادا کر سکے۔ جیسا کہ معلوم ہے، صلاح الدین ایوبی مصر کے سلطان نورالدین زنگی کا ایک فوجی افسر تھا۔ سلطان نورالدین کی موت کے بعد اگرچہ اس کے بیٹے موجود تھے لیکن صلاح الدین نے حکومت پر قبضہ کر کے سلطان کا منصب حاصل کر لیا۔ مسلم مورخین نے عام طور پر صلاح الدین کے اس قبضہ کی کارروائی کو جائز قرار دیا ہے۔ کیوں کہ یہ قبضہ اگر چہ بظاہر غیر آئینی تھا لیکن اپنے نتیجہ کے اعتبار سے وہ ایک عظیم سیاسی فائدہ کا سبب بنا۔ اسی نے صلاح الدین ایوبی کے لئے اس امر کو ممکن بنایا کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کے لیے اپنا وہ عظیم کردار ادا کر سکے جو کہ اس نے اس کے بعد ادا کیا۔

دوسری مثال فرانس کے چارلس ڈیگال (وفات ۱۹۷۰) کی ہے۔ وہ فرانس کی فوج میں ایک جنرل تھا۔ اس کے بعد اس نے حالات سے فائدہ اٹھا کر فرانس کے سیاسی اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ بظاہر یہ ایک غیر جمہوری عمل تھا مگر فرانس کی نجات کے لئے ڈیگال نے ایک ایسا کام کیا جو کوئی جمہوری حکمراں نہیں کر سکتا تھا۔

کیوں کہ جو حکمراں عوام کے ووٹوں سے منتخب ہو کر آئے وہ عوامی جذبات کو نظر انداز کر کے کوئی جرأت مندانہ فیصلہ نہیں لے سکتا۔ جب کہ بعض حالات میں کسی قوم کی نجات کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ عوامی جذبات کو نظر انداز کر کے ایک جرأت مندانہ فیصلہ لیا جائے۔

جیسا کہ معلوم ہے، اس وقت فرانس نے افریقہ کے کئی ملکوں مثلاً الجزائر، وغیرہ پر قبضہ کر رکھا تھا اور ان کو فرانس کے صوبے (provinces) کہتا تھا۔ یہ غیر حقیقت پسندانہ پالیسی فرانس کے لئے اتنی زیادہ مہلک ثابت ہوئی کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد جاری ہونے والی ترقیاتی دوڑ میں وہ یورپ کا ایک ''مرد بیمار'' بن گیا۔ ڈیگال نے قومی جذبات سے الگ ہو کر اس مسئلہ پر غور کیا۔ اس کی سمجھ میں آیا کہ اس مسئلہ کا واحد حل یہ ہے کہ افریقہ کی فرانسیسی کالونیوں کو یک طرفہ طور پر آزاد کر دیا جائے۔ یہ

اقدام فرانس کے عوام کے جذبات کے سراسر خلاف تھا۔ مگر یہی وہ غیر مقبول فیصلہ ہے جس نے فرانس کو جدید ترقیاتی دوڑ میں ایک بڑی طاقت کی حیثیت دے دی۔

پاکستان کی موجودہ صورت حال بھی تقریباً یہی ہے۔ کشمیر کے سوال پر انڈیا کے خلاف پاکستان کی بلا اعلان جنگ (undeclared war) نے پاکستان کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ دنیا اس کو ایک غیر محفوظ ملک کے طور پر دیکھتی ہے۔ عالمی مالیاتی ادارے پاکستان میں سرمایہ کاری (investment) کے لئے تیار نہیں۔ پاکستانی عوام کی بے چینی نے ملک میں بدامنی جیسی صورت حال پیدا کر دی ہے۔ ملک کے مذہبی اور تعلیمی اور ثقافتی ادارے تخریبی سرگرمیوں کے مرکز بن گئے ہیں۔

ان خرابیوں کا سب سے زیادہ اندوہناک انجام وہ ہے جس کو برین ڈرین (brain drain) کہا جاتا ہے۔ انسان فطری طور پر ترقی کی دوڑ میں آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ اس لئے کسی ملک کی ترقی کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ وہاں لوگوں کو عمل کے کھلے مواقع دکھائی دیتے ہوں۔ مثلاً وہاں امن ہو، بہترین انفراسٹرکچر (infrastructure) ہو، آدمی کو اپنی محنت کا پورا صلہ ملتا ہوا نظر آئے۔ اگر کسی ملک میں یہ مواقع پوری طرح موجود ہوں تو اس ملک میں ہر آدمی اپنے آپ سرگرم ہو جائے گا اور ملک خود بخود ترقی کرنے لگے گا۔ مگر بدقسمتی سے پاکستان میں ایسا نہ ہو سکا۔ پاکستان میں ''پہلے صورت موجودہ (status quo) کو بدلو'' کے نظریہ کے نتیجہ میں مسلسل طور پر ہنگامی صورت حال باقی ہے۔ وہاں عملی طور پر افراد کے لئے حسب حوصلہ کام کے مواقع بہت کم ہو گئے ہیں۔ چنانچہ بیشتر حوصلہ مند اور باصلاحیت افراد پاکستان چھوڑ کر باہر چلے گئے۔ امریکا کے سفروں کے دوران میں نے امریکا میں مقیم بہت سے پاکستانیوں سے پوچھا کہ آپ اپنے ملک کو چھوڑ کر یہاں کیوں آ گئے۔ تقریباً سب کا ایک ہی جواب تھا کہ امریکا میں کام کے مواقع ہیں جب کہ پاکستان میں کام کے مواقع نہیں۔

کشمیر کے بارے میں پاکستان کی غیر حقیقت پسندانہ پالیسی پاکستان کے ترقیاتی سیلاب کے لئے بند دروازہ (trap door) بنی ہوئی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستان موجودہ زمانہ میں ترقیاتی دوڑ میں پچھڑ گیا ہے۔ پاکستان کو اس پچھڑے پن سے نکالنے کی صرف ایک ہی صورت ہے۔

وہ یہ کہ پاکستان مسائل سے ٹکرانے کے بجائے مواقع کو استعمال (avail) کرنے کی پالیسی اختیار کرے۔ موجودہ حالات میں اس کی عملی صورت یہ ہے کہ پاکستانی لیڈر کشمیر کے معاملہ میں صورت موجودہ (status quo) کو علیٰ حالہٖ ماننے پر راضی ہوجائیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ کشمیر میں قبضہ کی لائن (LoAC) کو کچھ ضروری ایڈجسٹمنٹ کے ساتھ دونوں ملکوں کے درمیان تسلیم شدہ سرحد قرار دے دیا جائے۔ اس معاملہ میں ہندستان اور پاکستان کے درمیان جو جغرافی اور سیاسی اسٹیٹس کو (political statusquo) بن گیا ہے اس کو مان کر اس مسئلہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ اپنی اس رائے کو میں ۱۹۶۸ سے برابر پیش کر رہا ہوں۔ مزید یہ کہ اس طرح کا انقلابی فیصلہ صرف ایک غیر جمہوری حکمراں ہی کر سکتا ہے۔ کسی جمہوری حکمراں کے لیے ایسا غیر جذباتی فیصلہ لینا ممکن نہیں۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صدر پرویز مشرف کے لیے یہی تاریخی کام مقدر ہے۔ اس معاملہ میں جو لوگ صدر مشرف کے حق اقتدار پر سوال اٹھا رہے ہیں ان کا جواب سابق فوجی صدر جنرل ضیاء الحق کی مثال میں موجود ہے۔ اس سے پہلے جنرل محمد ضیاء الحق نے یہی کیا تھا کہ پاکستان کے اقتدار پر فوجی قبضہ کیا۔ اور پھر ایک کارروائی کے ذریعہ اپنے صدر مملکت ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس وقت پاکستان کے اسلام پسندوں سے لے کر امریکا کے محکمۂ خارجہ تک ہر ایک نے اس کو قبول کر لیا اور قانونِ ضرورت (law of necessity) کے تحت اس کو جائز قرار دیا۔ یہ نظیر کافی ہے کہ صدر پرویز مشرف کو بھی اسی دلیل کے ساتھ قبول کر لیا جائے۔ یہ ایک دہرا کردار ہے کہ جہاں ذاتی انٹرسٹ دکھائی دے وہاں آدمی پریکٹیکل بن جائے اور جہاں ذاتی انٹرسٹ کا معاملہ نہ ہو وہاں وہ آئیڈیلزم کی بات کرنے لگے۔

پاکستان میں جنرل پرویز مشرف کا اقتدار سنبھالنا اور پھر ۲۰ جون ۲۰۰۱ کو ملک کے صدر کی حیثیت سے حلف لینا بظاہر ایک غیر آئینی واقعہ ہے مگر میرے نزدیک وہ ایک بالکل بروقت واقعہ ہے۔ موجودہ صورت حال میں پاکستان کو جو جرأت مندانہ فیصلہ لینا ہے وہ صدر پرویز مشرف جیسا

فوجی حکمراں ہی لے سکتا ہے۔ انتخاب کے ذریعہ بننے والے کسی جمہوری حکمراں کے لئے ایسا غیر جذباتی فیصلہ لینا ممکن نہیں۔

اس مسئلہ کا واحد علاج یہ ہے کہ پاکستان اپنی جذباتی پالیسی کو چھوڑ کر حقیقت پسندانہ پالیسی اختیار کرے۔ وہ کشمیر کے سوال پر ہندستان سے سمجھوتہ کرلے تاکہ ملک میں امن کی فضا پیدا ہو اور ملکی ذرائع کو تعمیری سرگرمیوں کی طرف موڑا جاسکے۔

پچھلے ۵۵ سال سے پاکستان کی سیاست ایک ہی سوال پر مرتکز رہی ہے۔ اور وہ ہے —— کشمیر میں قائم شدہ سیاسی حالت (political status quo) کو بدلنا۔ اب آخری طور پر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ پالیسی ایک تباہ کن پالیسی ہے۔ وہ سرے سے کوئی مثبت نتیجہ پیدا کرنے والی ہی نہیں، نہ ماضی اور حال کے اعتبار سے اور نہ ہی مستقبل کے اعتبار سے۔

مذکورہ قسم کا انقلابی فیصلہ لینا یقینی طور پر ایک مشکل کام ہے۔ لیکن اگر ایک بار ہمت کر کے پاکستان ایسا فیصلہ لے لے تو اس کے معجزاتی نتیجے برآمد ہوں گے۔ انڈیا کے خلاف بلا اعلان جنگ کی حالت ختم ہو کر امن قائم ہو جائے گا۔ پاکستانی قوم کی منفی سوچ مثبت سوچ میں تبدیل ہو جائے گی۔ باہمی تجارت کے دروازے کھل جائیں گے۔ تعلیم اور ثقافت اور سیاحت کے میدان میں دونوں ملکوں کے درمیان لین دین شروع ہو جائے گا۔ لٹریچر کی دوطرفہ آمدورفت کے نتیجہ میں دونوں ملکوں کے درمیان غلط فہمیاں ختم ہو جائیں گی اور برادرانہ ماحول قائم ہو جائے گا۔ انڈیا اور پاکستان کی زبان اور کلچر بڑی حد تک ایک ہے۔ اس کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے لئے دور کے پڑوسی (distant neighbours) بنے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد یہ ہوگا کہ دونوں قریب کے پڑوسی بن جائیں گے جیسا کہ وہ فی الواقع ہیں۔

اصل یہ ہے کہ جب بھی کوئی فرد یا قوم کام کرنا چاہے تو اس وقت پیشگی حالات کے نتیجہ میں ایک عملی صورت حال (status quo) موجود رہتی ہے۔ اب سوچنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ پہلے موجود صورت حال (status quo) کو بدلا جائے تاکہ عمل کرنے کے راستے پیدا ہوں۔ دوسرے یہ کہ

موجودصورت کو اپنے حال پر چھوڑتے ہوئے بقیہ ممکن میدانوں میں اپنا عمل جاری کرنا۔

یہ طریقہ جس کو میں مثبت اسٹیٹس کوازم (positive status quoism) کہتا ہوں، یہی عقل کے مطابق ہے۔ یعنی جب آئیڈیل کا حصول ممکن نہ ہو تو پریکٹیکل پر راضی ہو جانا۔ خود اسلام کی تعلیم بھی یہی ہے۔ چنانچہ قرآن میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ **الصلح خیر** (النساء ۱۲۸)۔ یعنی نزاعی معاملات میں سب سے زیادہ بہتر اور مفید پالیسی سمجھوتہ کی پالیسی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اختلافی مواقع پر ٹکراؤ کا طریقہ چھوڑ کر مصالحت کا طریقہ اختیار کرنا۔

اسٹیس کو (status quo) کو مانتے ہوئے تعلقات کو مستقل بنیاد پر استوار کرنے کی یہ تجویز کوئی نئی نہیں۔ جواہر لال نہرو کے زمانہ میں دونوں طرف کی حکومتیں مبینہ طور پر اس تجویز پر راضی ہو چکی تھیں۔ حتیٰ کہ شیخ محمد عبد اللہ دونوں کے بیچ میں ایک درمیانی آدمی کے طور پر پاکستان پہنچ چکے تھے۔ مگر نہرو کی اچانک موت سے اس تاریخ ساز منصوبہ پر عمل درآمد نہ ہو سکا:

> By 1956, Nehru had publicly offered a settlement of Kashmir with Pakistan over the ceasefire line (now converted into the LoC). On May 23, 1964, Nehru asked Sheikh Abdullah to meet Ayub Khan in Rawalpindi in an effort to resolve the Kashmir imbroglio...... the Pakistani leader agreed to a summit with Nehru, to be held in June 1964. This message was urgently telegraphed to Nehru on May 26. But just as Nehru's consent reached Karachi, the world also learnt that Nehru had died in his sleep. And with that a major opportunity for a peaceful solution over Kashmir was also lost. (*The Hindustan Times,* June 18, 2001)

پاکستان اگر ایسا کرے کہ کشمیر کے بارے میں صورت موجودہ (statusquo) پر رضامند ہو کر اس کو مستقل بندوبست کے طور پر قبول کرلے تو اس میں پاکستان کا یا وسیع تر معنوں میں ملت مسلمہ کا کوئی نقصان نہیں۔ کشمیر کا علاقہ پاکستان سے جدا ہونے کے بعد بھی بدستور ایک مسلم خطہ کے طور پر اپنی جگہ باقی رہے گا۔ پھر اس میں آخر نقصان کی کیا بات۔ مزید یہ کہ تجربہ بتاتا ہے کہ برصغیر ہند کے جو مسلمان انڈیا سے جڑے وہ آج پاکستان اور بنگلہ دیش کے مسلمانوں سے زیادہ بہتر حالت میں ہیں۔ اس فرق

کی ایک علامتی مثال یہ ہے کہ ہندستان کے حکیم عبدالحمید صاحب اور پاکستان کے حکیم محمد سعید صاحب دونوں سگے بھائی تھے۔ دونوں نے بڑے بڑے کام کیے۔ مگر حکیم محمد سعید صاحب کو کراچی میں ۱۹۹۸ میں قتل کردیا گیا۔ جب کہ حکیم عبدالحمید صاحب امن کے ساتھ اپنا کام کرتے رہے۔ یہاں تک کہ دہلی میں ان کی طبعی وفات ۱۹۹۹ میں ہوئی۔

دوسری بات یہ کہ پاکستان کا ہندستان سے مصالحت کرنا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ اپنے طاقتور پڑوسی سے نزاع کو ختم کرنا ہے۔ اور اپنے پڑوسی سے نزاع کو ختم کرنا گویا اپنے اوپر ہر قسم کی ترقی کے دروازے کھولنا ہے۔ اپنے حریف سے نزاع کو ختم کرنا کس طرح ترقی کا زینہ بنتا ہے، اس کی ایک مثال موجودہ جاپان ہے۔ دوسری عالمی جنگ سے پہلے جاپان اور امریکا ایک دوسرے کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ جنگ کے بعد جاپان نے امریکا سے مکمل مصالحت کرلی۔ اس مصالحت کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاپان عالمی نقشہ میں اقتصادی سُپر پاور بن کر ابھر آیا۔

پاکستان اپنی موجودہ پالیسی سے اسلام کی بدنامی کا سبب بن رہا ہے۔ اپنی موجودہ پالیسی کی بنا پر پاکستان کو یہ کرنا پڑا کہ اس نے انڈیا سے نفرت کو اپنے لیے قومی اتحاد کا ذریعہ بنایا۔ اس غلط پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان (بشمول مشرقی پاکستان) کے لوگ اسلام کے نام پر تو متحد نہ ہوسکے مگر انڈیا سے نفرت کے نام پر وہ مکمل طور پر متحد نظر آتے ہیں۔ اس مثال کی بنا پر دنیا کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ اسلام کے اندر یہ طاقت نہیں کہ وہ مسلمانوں کو باہم متحد کرسکے۔ اسی ذہن کی ترجمانی دہلی کے انگریزی اخبار ہندستان ٹائمس (۱۸ جون ۲۰۰۱ء) کے ایک مضمون میں اس طرح کی گئی ہے کہ اسلام پاکستان کو متحد نہ کرسکا، مگر ہندستان دشمنی نے اس کو متحد کردیا:

Islam does not hold Pakistan together anymore, but anti-Indianism does.

پاکستان کی مصالحانہ پالیسی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اہل پاکستان کے اندر نیا مثبت ذہن فروغ پائے گا۔ اس کے بعد اہل پاکستان ایک نئے دور میں داخل ہوجائیں گے جب کہ ان کے قومی اتحاد کی بنیاد اینٹی انڈیا ذہن نہ ہو بلکہ ان کے قومی اتحاد کی بنیاد پرو اسلام (pro-Islam) ذہن ہوجائے۔ یہ فائدہ

اتنا عظیم ہے کہ عجب نہیں کہ اس کے بعد پاکستان کے اوپر اللہ کی رحمت کے تمام دروازے کھل جائیں اور اس کی رحمت کا کوئی دروازہ اُس کے اوپر بند نہ رہے۔

دورۂ ہند سے قبل بھیجا ہوا خط

برادر محترم پریزیڈنٹ پرویز مشرف صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ

انڈیا کے لئے آپ کا دورہ (۱۵-۱۶ جولائی ۲۰۰۱) ہم سب کے لئے خوشی کا باعث ہے۔ اللہ تعالیٰ اس اقدام کو مکمل کامیابی عطا فرمائے۔

۱۲/اکتوبر ۱۹۹۹ کو جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک امکانی ہوائی حادثہ سے بچایا اور پاکستان کے سیاسی اقتدار پر سرفراز کیا تو مجھے رابرٹ کلایو کا واقعہ یاد آیا۔ ایک امکانی حادثہ سے بچنے کے بعد کلایو کی زبان سے یہ الفاظ نکلے تھے: خدا نے تم کو کسی بڑے کام کے لئے بچایا ہے۔ اور اس کے بعد اس نے واقعتاً برطانی تاریخ میں ایک بڑا کام انجام دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی تاریخ آپ کے ساتھ دہرائی جانے والی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اللہ نے آپ کو اپنی خصوصی مدد سے بچایا ہے تا کہ آپ برصغیر ہند میں قیام امن کا وہ ضروری کردار ادا کرسکیں جس کا تاریخ کو نصف صدی سے انتظار رہے۔

جب یہ خبر آئی کہ آپ حکومت ہند کی دعوت پر انڈیا کا دورہ کرنے والے ہیں تو اس دورہ کے بارے میں میں نے کئی مضمون لکھے جو یہاں کے اردو، ہندی اور انگریزی اخباروں میں شائع ہوئے۔ مثال کے طور پر ساؤتھ انڈیا کے کثیر الاشاعت انگریزی روزنامہ ہت واد (The Hitavada) میں میرا ایک تفصیلی انٹرویو اس کے شمارہ ۳۰ جون ۲۰۰۱ میں چھپا۔ اس میں ملٹری رولر کی حیثیت سے میں نے آپ کا پرزور دفاع کیا تھا۔ چنانچہ اخبار نے اس انٹرویو کو چھاپتے ہوئے اس کا یہ عنوان دیا:

Military ruler is a blessing for Pakistan

اگر آپ اجازت دیں تو میں کہنا چاہوں گا کہ کشمیر کے معاملہ میں پاکستان کو وہی پالیسی اختیار کرنا چاہئے جو مشہور انگریزی مقولہ میں اس طرح بیان کی گئی ہے ـــــ سیاست ممکن کا آرٹ ہے:

Politics is the art of the possible.

میں ایک بہی خواہ کی حیثیت سے کشمیر کے مسئلہ پر اس کے آغاز ہی سے غور کرتا رہا ہوں۔

۱۹۶۸ سے میں نے اس موضوع پر لکھنا شروع کیا اور اردو اور ہندی اور انگریزی پریس میں بار بار لکھتا رہا ہوں۔ اس مسئلہ کا غیر جانبدارانہ جائزہ لیتے ہوئے میری قطعی رائے ہے کہ کشمیر کے بارے میں پاکستان کے لئے صرف دو ممکن انتخاب (options) ہیں۔ ایک یہ کہ اس معاملہ میں پاکستان ڈی لنکنگ پالیسی (delinking policy) اختیار کرے۔ یعنی کشمیر کے اشو کو پر امن گفت وشنید کے خانہ میں ڈالتے ہوئے بقیہ تمام امور میں ہندستان سے نارمل تعلقات قائم کرلے۔ اور دوسرے یہ کہ جموں اور کشمیر میں جغرافی اعتبار سے جو اسٹیٹس کو (status quo) بن گیا ہے اس کو مستقل سرحد کے طور پر مان کر اس مسئلہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کردے۔ اس کے سوا کوئی تیسرا انتخاب عملی طور پر ممکن نہیں۔ تیسری صورت یقینی طور پر صرف تباہی کی صورت ہے، نہ کہ ترقی اور کامیابی کی صورت۔

اس معاملہ کا ایک اور نہایت اہم پہلو ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں مختلف مقامات پر جہاد کے نام سے ملیٹنسی (militancy) چلائی جارہی ہے، ان میں سے ایک نمایاں نام کشمیر کا ہے۔ اس ملیٹنسی کا فائدہ تو کچھ نہیں ہوا۔ البتہ اس کا ایک عظیم نقصان یہ ہوا کہ اسلام کی امیج ایک وائلنٹ مذہب (violent religion) کی ہوگئی۔ اس بدنامی نے موجودہ زمانہ میں اسلام کے آئیڈیالاجیکل مارچ (ideological march) کو روک دیا جو ایک ہزار سال سے مسلسل ساری دنیا میں چلا آرہا تھا۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اللہ نے آپ کے لئے یہ رول مقدر کیا ہے کہ آپ اسلام کے اس دعوتی سفر کو دوبارہ جاری کریں۔ اگر آپ انڈیا کے ساتھ مستقل قسم کا ایک پیس ٹریٹی (peace treaty) کرلیں تو اس کا فائدہ نہ صرف پاکستان کو ملے گا بلکہ اس کے نتیجہ میں پوری مسلم دنیا میں ایک نیا صحت مند پراسس جاری ہوجائے گا۔ اس کے بعد یہ ہوگا کہ موجودہ متشددانہ رجحان ایک پر امن دعوتی رجحان میں بدل جائے گا۔ لوگ نارمل فضا میں اسلام کا مطالعہ کرنے لگیں گے۔

موجودہ مبصرین پاکستان کو امکانی طور پر نیوکلیر فلیش پائنٹ (nuclear flashpoint) کے طور پر دیکھتے ہیں۔ لیکن اگر آپ جرأت وہمت سے کام لے کر حدیبیہ جیسا ایک پیس ٹریٹی کرلیں تو

پاکستان برعکس طور پر دعوہ فلیش پائنٹ (dawah flashpoint) بن جائے گا۔

مجھے اندازہ ہے کہ کشمیر کے معاملہ میں مصالحت کی پالیسی اختیار کرنا آپ کی مقبولیت کے لیے ایک رِسک (risk) کی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر اس اندیشہ کا جواب قرآن میں یہ دیا گیا ہے کہ: والصلح خیر (النساء ۱۲۸)۔ یعنی صلح بہتر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اختلافی معاملات میں ٹکراؤ کی پالیسی کو چھوڑ کر مصالحت کی پالیسی اختیار کی جائے تو نتیجہ کے اعتبار سے وہ زیادہ بہتر ثابت ہوگی۔

زندگی میں ہر بڑی کامیابی کا تعلق رسک سے ہوتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ افریقہ میں فرانس کی نوآبادیاتی پالیسی نے فرانس کو بے حد کمزور کر دیا تھا۔ جنرل ڈیگال نے جرأت کر کے یک طرفہ طور پر اس پالیسی کو ختم کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس میں جنرل ڈیگال کی مقبولیت بہت کم ہوگئی۔ مگر آج اِس ڈیگال ازم کو ایک کامیاب خارجہ پالیسی سمجھا جاتا ہے۔ کیوں کہ اسی پالیسی کے نتیجہ میں دوسری عالمی جنگ کے بعد فرانس کو نئی طاقت ملی۔

اس خط کے ساتھ میں دو چیزیں بھیج رہا ہوں۔ ایک اپنی کتاب *Islam Rediscovered* اور دوسرے، ماہنامہ الرسالہ کا شمارہ اگست ۲۰۰۱۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس کو پڑھنے کے لئے کچھ وقت نکال سکیں گے۔ اس مطالعہ سے میرا مدعا مزید واضح ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہر طرح آپ کا مددگار رہو۔

نئی دہلی، ۹ جولائی ۲۰۰۱ دعاگو وحیدالدین

نشستند و گفتند و برخاستند

پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف ۱۴ جولائی ۲۰۰۱ کو اسلام آباد سے دہلی آئے۔ یہاں ہندستان کے وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی سے ان کی پانچ بار ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات کا خاص مقصد کشمیر کے مسئلہ کا حل تلاش کرنا تھا۔ مگر بات چیت ناکام رہی اور ۱۶ جولائی ۲۰۰۱ کی رات کو واپس ہو کر وہ اسلام آباد چلے گئے۔

اس اعلیٰ سطحی بات چیت کی ناکامی کا سبب کیا تھا۔ اطلاعات کے مطابق، اس کا سبب یہ تھا کہ

ہندستانی وزیر اعظم چاہتے تھے کہ جموں و کشمیر میں انڈیا اور پاکستان کے درمیان سیاسی اور جغرافی اعتبار سے جو واقعی حالت (status quo) قائم ہوگئی ہے، اس کو علی حالہ باقی رکھتے ہوئے دوسرے تمام امور میں دونوں ملکوں کے درمیان معتدل تعلقات بحال کر لیے جائیں تاکہ دونوں ملکوں کے درمیان ترقی کا رکا ہوا سفر جاری ہو سکے۔ مگر پاکستانی صدر کو غالباً یہ اصرار تھا کہ پہلے جموں و کشمیر کی موجودہ حالت (status quo) کو توڑ کر ان کے دعوے کے مطابق، پوری ریاست پر پاکستان کا حق تسلیم کیا جائے۔ اس کے بعد ہی وہ دونوں ملکوں کے درمیان معتدل تعلقات کے قیام پر راضی ہوں گے۔ ہندستانی وزیر اعظم پاکستانی صدر کی بات نہ مان سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں ملکوں کے درمیان بات چیت ناکام ہو کر رہ گئی۔

جنرل پرویز مشرف جب ہندستان آئے تو شروع میں انھوں نے ایسی بات کہی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مصالحت کا ارادہ لے کر ہندستان آئے ہیں۔ مثلاً انھوں نے راشٹرپتی بھون (نئی دہلی) میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ کشمیر کے نزاع کا کوئی فوجی حل (military solution) ممکن نہیں۔ اسی طرح آگرہ کی پریس کانفرنس میں انھوں نے حقیقت کے اعتراف (acceptance of reality) کی بات کہی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ میں کھلے ذہن کے ساتھ انڈیا آیا ہوں۔ مگر بعد کو وہ حقیقت پسندانہ مصالحت کیے بغیر پاکستان واپس چلے گئے۔

جہاں تک میرا اندازہ ہے، ان کو غالباً پاکستانی عوام کی طرف سے سخت جذباتی ردّعمل کا اندیشہ تھا، اس بنا پر وہ مصالحت کا طریقہ اختیار نہ کر سکے اور ناکام واپس چلے گئے۔ ایک مبصر کے الفاظ میں، جنرل پرویز مشرف کو معلوم تھا کہ پاکستان کے جذباتی عوام جو کرکٹ کے میدان میں انڈیا کے مقابلہ میں اپنی ہار کو برداشت نہیں کر پاتے، تو وہ کشمیر میں انڈیا کے مقابلہ میں اپنی سیاسی ہار کو کیسے برداشت کر سکیں گے۔

مگر یہ کوئی سادہ معاملہ نہیں۔ پاکستان کے صدر کو جاننا چاہیے کہ ان کا سامنا صرف ایک مسئلہ سے نہیں ہے بلکہ وہ بیک وقت دو مسئلے کے درمیان ہیں — اگر وہ کشمیر کے معاملہ میں انڈیا سے

مصالحت (compromise) کا طریقہ اختیار کریں تو پاکستان کے عوام اس کو اپنی سیاسی ہار سمجھ کر جنرل پرویز مشرف سے غصہ ہو جائیں گے۔ لیکن دوسری طرف یہ سخت تر مسئلہ ہے کہ اگر وہ کشمیر کے سوال پر مصالحت نہ کریں تو پاکستان کی اقتصادی تباہی میں مزید اضافہ ہوگا۔ اس کے نتیجہ میں پاکستان میں مایوسی پھیلے گی اور پاکستانی عوام کی نظر میں وہ غیر مطلوب حکمراں بن جائیں گے۔ اور پھر وہ بھی اسی طرح سیاسی زوال کا شکار ہوں گے جس طرح ان کے پیش رو ٹھیک اسی سبب سے سیاسی زوال کا شکار ہوئے۔

ایسی حالت میں پاکستان کے فوجی صدر کے سامنے بیک وقت دو برائیوں میں سے ایک کے انتخاب کا مسئلہ ہے نہ کہ صرف ایک برائی کا مسئلہ۔ وہ کسی حال میں بھی اپنے سیاسی کیریر کو برائی کے مسئلہ سے بچا نہیں سکتے۔ اب انھیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ مذکورہ دونوں برائیوں میں سے کون سی چھوٹی برائی (lesser evil) ہے اور کون سی بڑی برائی (greater evil)۔

اس معاملہ میں اگر مجھے رائے دینا ہو تو میں کہوں گا کہ کشمیر کے بارے میں ہندستانی موقف کو تسلیم کر لینا پاکستانی صدر کے لیے چھوٹی بُرائی ہے۔ کیوں کہ ایسی حالت میں جو کچھ ہوگا وہ صرف یہ کہ ایک چیز جس کو پاکستان بالفعل کھو چکا ہے، اس کے کھوئے جانے کا اعتراف کر لیا جائے۔ پاکستان کو اس کی یہ نقد قیمت ملے گی کہ اس کی تعمیر و ترقی کے تمام دروازے اچانک کھل جائیں گے جو، اب تک گویا اس کے اوپر بند پڑے ہوئے تھے۔

اس کے برعکس اگر پاکستان کی حکومت کشمیر کے بارے میں ہندستانی موقف کو تسلیم نہ کرے اور ہندستان سے اپنی بلا اعلان لڑائی جاری رکھے تو اس کا تباہ کن نقصان یہ ہوگا کہ جس چیز سے پاکستان محروم ہو چکا ہے، اس سے اس کی محرومی تو بدستور قائم رہے گی۔ مزید یہ نقصان ہوگا کہ پاکستان کی اقتصادی تباہی میں اور زیادہ اضافہ ہوگا، جو پہلے ہی ناقابل برداشت حد کو پہنچ چکی ہے۔

خوش گوار آغاز، ناخوش گوار انجام

پاکستان کا اسلامک گروپ اور انڈیا کا فنڈمنٹلسٹ گروپ دونوں کے عقیدے بظاہر ایک

دوسرے سے الگ ہیں۔ مگر عملی طور پر دونوں کا کیس تقریباً یکساں ہے۔ دونوں کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنے اپنے ملکوں کے واحد نجات دہندہ ہیں۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان دونوں گروہوں نے اپنے اپنے ملکوں کو جتنا نقصان پہنچایا ہے اتنا نقصان شاید کسی اور گروہ نے نہیں پہنچایا۔

اس صورت حال کا مشترک سبب یہ ہے کہ دونوں اگر چہ اپنے اپنے اعتبار سے وطن کے خیر خواہ ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ دونوں ہی یکساں طور پر انتہا پسند (extremists) ہیں۔ اور انتہا پسندی کے ساتھ ایک گھر کو بھی کامیابی کے ساتھ نہیں چلایا جا سکتا۔ پھر پورے ملک کو کس طرح انتہا پسندی کے ذریعہ کامیابی کے ساتھ چلایا جا سکتا ہے۔

اب پاکستان کے اسلامسٹ گروپ کو لیجئے۔ یہ لوگ پچھلے تقریباً ۵۵ سال سے پاکستان میں سرگرم ہیں۔ اپنے کئی مطالبات کو منوانے میں بھی بظاہر وہ کامیاب ہوئے ہیں۔ مگر ان کی یہ کامیابی وسیع تر معنوں میں ان کے ملک کے لئے مثبت نتیجہ کا سبب نہ بن سکی۔

پاکستان کی سیاست سے اس کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہاں ہم صرف کشمیر کے مسئلہ کو لیں گے۔ اس معاملہ میں پاکستان کے اسلامسٹ گروپ نے اپنے مخصوص مزاج کے تحت یہ کیا کہ انھوں نے اپنی کشمیری تحریک کو قومی تحریک نہ بتاتے ہوئے اس کو جہاد کا عنوان دے دیا۔

قومی تحریک میں ہمیشہ فیصلہ کن چیز عملی حقائق ہوتے ہیں۔ اس بنا پر قومی تحریک میں ہمیشہ لچک اور ایڈجسٹمنٹ کی گنجائش رہتی ہے۔ مگر جہاد ایک مذہبی عقیدہ کی بات ہے۔ جب کسی معاملہ کو جہاد کا معاملہ قرار دے دیا جائے تو اس سے وابستہ لوگوں میں لچک اور ایڈجسٹمنٹ (adjustment) کا مزاج ختم ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ جہاد کے بارے میں ان کا عقیدہ یہ بتاتا ہے کہ اگر تم اس راہ میں کچھ حاصل نہ کر سکو تب بھی اس میں جان دینا ہی تمھاری کامیابی ہے۔ کیونکہ جہاد کے راستہ میں مر کر تم سیدھے جنت میں پہنچ جاؤ گے۔

واقعات بتاتے ہیں کہ پاکستان کا سیکولر طبقہ کشمیر کے معاملہ میں انڈیا کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ کی پالیسی اختیار کرنے پر ذہنی طور پر راضی ہے۔ مگر وہاں کا اسلامسٹ گروپ اس معاملہ میں ان

کے خلاف عقب لشکر (rearguard) کا کردار ادا کر رہا ہے۔ اس نے پر جوش تقریریں کر کے اس معاملہ کو اتنا زیادہ جذباتی بنا دیا ہے کہ اب پاکستان کے بہت سے لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ہم سری نگر تک پہنچیں یا نہ پہنچیں مگر اس راہ میں لڑ کر ہم جنت تک ضرور پہنچ سکتے ہیں۔ اس طرح پاکستان کا اسلامسٹ گروپ ایڈجسٹمنٹ (adjustment) کی پالیسی اختیار کرنے میں ایک مستقل رکاوٹ بن گیا ہے، جب کہ تاریخ کا تجربہ بتاتا ہے کہ ایڈجسٹمنٹ کی پالیسی ہی کسی قوم کے لئے کامیابی کا واحد ذریعہ ہے۔

اب انڈیا کو لیجئے۔ انڈیا کا فنڈمنٹلسٹ طبقہ بھی اپنے حالات کے اعتبار سے وہی منفی کردار ادا کر رہا ہے جو پاکستان کا اسلامسٹ طبقہ اپنے حالات کے لحاظ سے ادا کر رہا ہے۔ مذہبی فنڈمنٹلزم عین اپنی فطرت کی بنا پر اپنے آپ کو برحق سمجھنے (selfrighteousness) کا مزاج پیدا کرتا ہے۔ اس مزاج کا مزید نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے اندر انتہا پسندی اور کٹر پن کی نفسیات پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو جانتے ہیں مگر وہ دوسروں کو نہیں جانتے۔ وہ اپنے آپ کو ہر حال میں درست اور دوسروں کو ہر حال میں نادرست سمجھتے ہیں۔ وہ صرف اپنے آپ کو رعایت کا مستحق سمجھتے ہیں، دوسروں کی رعایت کرنا ان کی فہرست اخلاق میں شامل نہیں ہوتا۔

آزادی کے بعد ہندستان کی تاریخ میں اس فنڈمنٹلسٹ کردار کی مثالیں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ یہاں ہم کشمیر کے تعلق سے اس معاملہ کی ایک تازہ مثال نقل کریں گے۔

حکومت ہند کی دعوت پر پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف نے انڈیا کا دورہ کیا۔ وہ ۱۴ جولائی ۲۰۰۱ کی صبح کو یہاں آئے اور ۱۶ جولائی ۲۰۰۱ کی رات کو واپس گئے۔ اس دوران دہلی اور آگرہ میں ان کی ملاقاتیں انڈیا کے لیڈروں سے ہوئیں۔ ابتداء میں بظاہر ملاقات کا یہ پروگرام بہت امید افزا تھا۔ مگر بعد کو ایسی تلخی پیدا ہوئی کہ کوئی مشترک اعلان جاری کئے بغیر یہ چوٹی کانفرنس ختم ہو گئی۔ دورہ ناکام ہو کر رہ گیا۔

اس ناکامی کا سبب کیا تھا۔ میرے نزدیک اس کا سبب ہمارے یہاں کے کچھ فنڈمنٹلسٹ

لیڈروں کا بے لچک رویہ ہے۔ وہ اپنے مذکورہ ذہن کی بنا پر معتدل انداز میں پاکستانی صدر سے معاملہ نہ کرسکے اور چوٹی کانفرنس ناکام ہوکر رہ گئی۔

میں ذاتی طور پر پچھلے تقریباً چالیس سال سے یہ رائے رکھتا ہوں کہ کشمیر کے مسئلہ کا واحد ممکن حل یہ ہے کہ موجودہ جنگ بندی لائن یا لائن آف ایکچول کنٹرول کو انڈیا اور پاکستان کے درمیان مستقل سرحد کے طور پر مان لیا جائے۔ لیکن ظاہر ہے کہ پاکستان کے لیے یہ ایک نہایت کڑوا گھونٹ ہے۔ اس لیے اس تجویز کو واقعہ بنانے کے لیے ہمیں حد درجہ حکمت اور دانش مندی سے کام لینا ہوگا۔ اس کے بغیر اس معاملہ میں کامیابی ممکن نہیں۔ اپنے حریف کو بے عزت کرکے آپ اسے جیت نہیں سکتے، البتہ رعایت اور محبت کا معاملہ کرکے یقینی طور پر آپ اس کو جیت سکتے ہیں۔

میں نے صدر پرویز مشرف کے سفر سے پہلے انھیں ایک خط (۹ جولائی ۲۰۰۱) بھیجا تھا۔ یہ خط زیر نظر مجموعہ میں شامل ہے۔ صدر پرویز مشرف جب ہندستان آئے تو انھوں نے بہت سے ایسے اشارے دئے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مفاہمت اور مصالحت پر تیار ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں کھلے ذہن (open mind) کے ساتھ یہاں آیا ہوں۔ دہلی میں اپنے آبائی مکان کی خصوصی زیارت کرکے انھوں نے یہ تاثر دیا کہ میں اپنی پیدائش کے اعتبار سے ایک ہندستانی ہوں، اس لیے فطری طور پر میرے دل میں ہندستان کے لیے ایک نرم گوشہ (soft corner) موجود ہے۔ راشٹر پتی بھون نئی دہلی کی پارٹی میں انھوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ کشمیر کی نزاع کا کوئی فوجی حل موجود نہیں:

There is no military solution to the Kashmir dispute.

انھوں نے آگرہ کی پریس کانفرنس میں اعتراف حقیقت (acceptance of reality) کی بات کہی۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں زینہ بہ زینہ (step by step) آگے بڑھنا ہوگا، وغیرہ۔

پاکستانی صدر کے اس قسم کے اشارے واضح طور پر یہ بتا رہے تھے کہ وہ مصالحانہ انداز اختیار کرنے کے لیے تیار ہیں۔ وہ کشمیر کے نزاعی مسئلہ کو ختم کرنے کا ارادہ لے کر آئے ہیں۔ مگر ہماری لیڈر شپ اپنے مذکورہ فنڈمنٹلسٹ مزاج کی بنا پر پاکستانی صدر کے ان اشاروں (gestures) کو کیش (cash) نہ کرسکی۔ ایک تاریخ بنتے بنتے رہ گئی۔

مثال کے طور پر ہمارے فنڈمنٹلسٹ لیڈروں کو جاننا چاہیے تھا کہ جنرل پرویز مشرف جو بھی معاہدہ کریں، اس کے بعد انھیں اپنے ملک پاکستان واپس جانا ہے۔ اس لیے ہر بات ایسے حکیمانہ انداز سے کہی جائے کہ پرویز مشرف جب واپس ہوکر اسلام آباد پہنچیں تو وہاں ان کا استقبال کالے جھنڈوں سے نہ کیا جائے۔ مگر ہمارے لیڈروں کے بے لچک رویہ اور غیر دانش مندانہ کلام کا نتیجہ یہ ہوا کہ مصالحت کی گفتگو راہ پر آنے کے بعد اچانک اس انجام سے دوچار ہوئی جس کو ایک ہندستانی صحافی نے ڈرامائی موڑ (dramatic turn) کے لفظ سے تعبیر کیا تھا۔ خوش گوار آغاز کا یہ ناخوش گوار انجام کیوں ہوا، اس کی کافی تفصیل میڈیا میں آچکی ہے۔ یہاں اس کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔

نزاعی امور کا تصفیہ گہری دانش مندی کے ساتھ فریق ثانی کی مکمل رعایت کا طالب ہوتا ہے۔ ذاتی انٹرسٹ کے معاملہ میں ہر آدمی کو معلوم ہے کہ مسئلہ کے حل کے لیے ان دونوں پہلوؤں کا لحاظ انتہائی ضروری ہے۔ مگر جب معاملہ قومی انٹرسٹ کا ہو تو لوگ اس حقیقت کو اس طرح بھول جاتے ہیں جیسے کہ وہ اس کو جانتے ہی نہ ہوں۔

کرنے کا کام

پچھلے دو سو سال کے اعتبار سے کشمیر کی تاریخ کو دیکھا جائے تو وہ تین بڑے دوروں سے گزرتے ہوئے دکھائی دے گی۔ پہلے دور میں کشمیر کے لوگ صوفیوں سے متاثر ہوئے۔ کشمیر میں صوفیوں کا آنا کشمیریوں کے لئے اس اعتبار سے مفید ثابت ہوا کہ ان کے ذریعہ سے کشمیریوں کو اسلام کا تحفہ ملا۔ کشمیریوں کی بہت بڑی اکثریت اسلام کے دائرہ میں داخل ہوگئی۔

صوفیاء نے کشمیریوں کو مذہبی اعتبار سے اسلام تو دیا مگر وہ کشمیریوں کو وسیع تر معنیٰ میں زندگی کا کوئی مشن نہ دے سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کشمیریوں کے لئے اسلام زیادہ تر کلچر کے ہم معنیٰ بن کر رہ گیا۔ وسیع تر معنوں میں انھیں وہ شعور اور وہ پروگرام نہیں ملا جو کشمیریوں کی پوری زندگی کو ایک جامع نشانہ دے سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کشمیر کے بیش تر لوگوں کی زندگی بزرگوں کی قبروں یا درگاہوں کے ارد گرد گھومتی ہے۔ مخصوص قسم کے اوراد و وظائف کو وہ اتنے اہتمام کے ساتھ پڑھتے ہیں

جیسے کہ وہی سارا اسلام ہو۔ اس درگاہی اسلام یا کلچرل اسلام کا یہ نقصان ہوا کہ کشمیریوں میں وہ شعور ترقی نہ کرسکا جو وسیع تر معنیٰ میں ان کے اندر صحیح اور غلط کی تمیز پیدا کرے۔ اسی بے شعوری کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ بار بار ایسی منفی سیاست میں ملوث ہوتے رہے جس کا کوئی حقیقی تعلق اسلام سے نہ تھا۔ حتیٰ کہ دنیوی اعتبار سے بھی اس کا کوئی فائدہ کشمیریوں کو ملنے والا نہ تھا۔

اسلام کا ایک فائدہ یہ ہے کہ وہ آدمی کو ایک روحانی مرکز دے، وہ آدمی کو خدا کی عبادت کے طریقے بتائے، وہ آدمی کو ایک ربانی کلچر عطا کرے۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے، کشمیری لوگ اس پہلو سے تو اسلام سے آشنا ہوئے مگر ایک اور پہلو سے وہ بڑی حد تک اسلام کے فوائد سے بے بہرہ رہے۔

یہ دوسرا پہلو وہ ہے جس کو تعمیرِ ذہن کہا جاسکتا ہے۔ کشمیریوں کی تعلیم و تربیت اس نہج پر نہ ہوسکی جو ان کے اندر صحیح اسلامی شعور پیدا کرے۔ جو انھیں سوچنے کے وہ طریقے بتائے جس کی روشنی میں وہ زندگی کے مختلف شعبوں میں اسلام کے مطابق فیصلہ لے سکیں۔ یہ کہنا شاید درست ہوگا کہ کشمیریوں کو مذہبی اعتبار سے تو اسلام ملا مگر شعوری انقلاب کے اعتبار سے وہ بڑی حد تک اسلام سے اپنا حصہ نہ پاسکے۔

اس سلسلہ کا پہلا واقعہ وہ ہے جب کہ کچھ لیڈروں کے نعرہ پر کشمیری لوگ سابق ڈوگرہ راج کے خلاف متحرک ہوئے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ ایک جذباتی ہنگامہ آرائی تھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بظاہر کامیاب ہونے کے باوجود کشمیریوں کے مستقبل کی تعمیر میں اس تحریک کا کوئی حصہ نہیں۔ ڈوگرہ راج کے خلاف یہ تحریک زیادہ تر کچھ لیڈروں کے سیاسی حوصلہ کا اظہار تھی، نہ کہ حقیقی معنوں میں اسلامی شعور کا نتیجہ۔

۱۹۴۷ کے بعد کشمیریوں کے درمیان تحریکوں کا نیا دور شروع ہوا۔ اس دور میں کشمیر کے عوام دو بڑی تحریکوں سے متاثر ہوئے۔ ایک وہ جو سیکولرزم کے نام پر اٹھی اور دوسری وہ جو اسلام کے نام پر اٹھی۔ یہ دونوں ہی تحریکیں دوبارہ کچھ لیڈروں کے سیاسی عزائم کی پیداوار تھیں، وہ حقیقی معنوں میں اسلامی شعور کے تحت پیدا نہیں ہوئیں۔

سیکولر لیڈروں نے ۱۹۴۷ کے بعد آزاد کشمیر یا پاکستانی کشمیر کے نام پر اپنی تحریکیں چلائیں۔ ان تحریکوں کا یہ فائدہ تو ہوا کہ کچھ لیڈروں کو شہرت اور مادی فائدے حاصل ہوئے مگر کشمیری عوام کے لئے وہ ایک ایسے نشانہ کی طرف دوڑنے کے ہم معنیٰ تھی جس کی کوئی منزل نہیں۔ جس کا آغاز تو ہے مگر اس کا کوئی اختتام نہیں۔

دوسرا طبقہ وہ ہے جس نے اسلامی کشمیر اور نظام مصطفیٰ کے نام پر اپنی تحریک چلائی۔ یہ لوگ بظاہر اسلام کا نام لیتے تھے مگر ان کے پاس خوش فہمیوں اور جذباتیت کے سوا کوئی اور سرمایہ نہ تھا۔ وہ اپنے رومانی جذبات کے پیچھے دوڑ رہے تھے اور دوسروں کو دوڑا رہے تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ وہ اسلام کی منزل کی طرف جارہے ہیں۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ ان کی تحریک اسلام کے لیے تو درکنار، خود دنیا کے اعتبار سے بھی کوئی واقعی فائدہ کشمیریوں کو دینے والی نہ تھی۔ یہ دنیا حقائق کی دنیا ہے۔ یہاں جذباتی سیاست کے ذریعہ کوئی مثبت نتیجہ برآمد کرنا ممکن نہیں۔

ان تحریکوں کا بے نتیجہ ہونے ہی کا یہ انجام ہے کہ کشمیری تحریک ۱۹۸۹ کے بعد تشدد کی راہ پر چل پڑی۔ آخری دور میں تشدد کی جو تباہ کن تحریک کشمیریوں کے درمیان ابھری وہ دراصل کشمیریوں کی مایوسانہ نفسیات کا نتیجہ تھی۔ پہلے وہ اپنے نادان لیڈروں کی پیروی میں بے نتیجہ راہوں کی طرف دوڑے اور جب فطرت کے قانون کے تحت ان کی تحریکوں کا کوئی نتیجہ سامنے نہیں آیا تو مایوسی اور جھنجلاہٹ کا شکار ہو کر انھوں نے مسلّح جدوجہد شروع کردی۔

کشمیریوں کے لئے صحیح طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے پورے ماضی کا ازسرِ نو اندازہ (reassessment) کریں۔ وہ ماضی کی غلطیوں کا اعتراف کر کے اپنے مستقبل کی تعمیر کا نیا منصوبہ بنائیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کشمیری لوگ پہلا موقع (first chance) کھو چکے ہیں۔ اب ان کے لئے ممکن صورت صرف یہ ہے کہ وہ دوسرے موقع (second chance) کو شعوری طور پر سمجھیں اور دل کی پوری آمادگی کے ساتھ اس کو اپنے حق میں استعمال کریں۔

کشمیریوں کے لئے اپنی زندگی کی تعمیر کا نیا پروگرام تین نکات پر مشتمل ہوسکتا ہے۔ وہ تین

نکات یہ ہیں ـــــ تعلیم، اقتصادیات، دعوت۔

کشمیریوں کو چاہئے کہ وہ سیاست اور ہتھیار سے مکمل طور پر بے تعلق ہو جائیں۔ وہ اپنی پوری نسل کو تعلیم کے راستہ پر لگا دیں۔ جموں اور کشمیر کے پورے علاقہ میں بڑے پیمانہ پر اسکول اور مدرسے کھولے جائیں۔ کم از کم ۲۵ سال تک وہ یہ کریں کہ اپنے بچوں کو ہر دوسری سرگرمی سے ہٹا کر صرف تعلیم کے راستہ پر لگا دیں۔

دوسرا میدان اقتصادیات کا ہے۔ جموں اور کشمیر کی ریاست میں تجارت اور صنعت کے غیر معمولی مواقع موجود ہیں۔ کشمیری مسلمانوں نے ابھی تک ان مواقع سے بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔ اب انھیں چاہئے کہ وہ نئے ذہن کے تحت پوری طرح یکسو ہو کر تجارت اور صنعت کی طرف متوجہ ہو جائیں۔

تیسرا میدان دعوت کا ہے۔ دعوت سے میری مراد اسلام کا پیغام غیر مسلموں تک پہنچانا ہے۔ اس اعتبار سے کشمیریوں کے لئے دو بہت بڑے میدان کھلے ہوئے ہیں۔ ایک وہ غیر مسلم لوگ جو جموں اور کشمیر میں بسے ہوئے ہیں اور وہاں کے ریاستی باشندہ ہیں۔ دوسرے وہ غیر مسلم لوگ جو سیاح کے طور پر کشمیر میں آتے ہیں۔

کشمیر میں اگر امن قائم ہو جائے تو وہاں سیاحت کا بہت بڑا میدان کھل جائے گا۔ یہ سیاحت ایک اعتبار سے انڈسٹری ہے اور دوسرے اعتبار سے اس کا مطلب یہ ہے کہ پیاسا خود کنوئیں کے پاس آ گیا۔ یہ سیاحتی امکان اتنا بڑا ہے کہ اگر کشمیر کے لوگ اس کو درست طور پر استعمال کریں تو وہی ان کی دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی کے لئے کافی ہو جائے۔

کشمیر جنت نظیر

کشمیر کو سیکڑوں سال سے جنت نظیر کہا جاتا تھا۔ یعنی جنت کا نمونہ۔ ایک فارسی شاعر نے جب کشمیر کو دیکھا تو اس نے کشمیر کے بارے میں یہ شعر کہا کہ اگر جنت زمین پر ہے تو وہ یہی کشمیر ہے:

اگر فردوس برروئے زمین است ہمیں است وہمیں است وہمین است

پچھلے زمانوں میں جب کہ کشمیر کو جنت نظیر کہا جاتا تھا، اس وقت کشمیر میں ''کشمیری عوام'' کی

حکومت نہ تھی۔ پہلے یہاں مغلوں کا راج تھا۔اس کے بعد یہاں انگریز حکومت کرنے لگے۔اس کے بعد یہاں ڈوگرہ راجہ کی حکومت قائم ہوئی۔اس پوری مدت میں کشمیر ایک جنت نظیر خطہ بنا رہا۔ساری دنیا کے لوگ اس کو دیکھنے کے لئے آتے رہے۔ برصغیر ہند میں تاج محل اگر عمارتی حسن کا اعلیٰ نمونہ تھا تو کشمیر قدرتی حسن کا اعلیٰ نمونہ۔

اس تاریخ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کشمیر کو کشمیر بنانے کے لیے اس کی ضرورت نہیں کہ وہاں نام نہاد طور پر ''کشمیری عوام'' کی حکومت ہو۔سیاسی اقتدار دراصل ایک قسم کا سیاسی دردِ سر ہے۔ یہ سیاسی دردِ سر خواہ جس کے حصہ میں آئے، کشمیر بدستور کشمیر رہے گا۔کشمیر میں بسنے والے لوگوں کی اپنی تعمیری سرگرمیوں کے سوا کشمیر کی ترقی کے لیے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔

قرآن میں ہر اس چیز کا ذکر ہے جو انسان کے لیے خیر کی حیثیت رکھتی ہے۔مگر قرآن میں آزادی یا حریت کا ذکر نہیں ملتا۔اس کا سبب یہ ہے کہ آزادی محض ایک پرفریب لفظ ہے، اس کی کوئی حقیقی معنویت نہیں۔اس کا واضح عملی ثبوت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں تقریباً ساٹھ مسلم ملک ہیں جنھوں نے زبردست قربانی کے بعد آزادی کو حاصل کر لیا۔مگر یہ تمام کے تمام ملک عملاً غیر آزاد بنے ہوئے ہیں۔اس کی قریبی مثالیں پاکستان اور افغانستان اور بنگلہ دیش، وغیرہ ہیں۔ان مسلم ملکوں میں یہ ہوا کہ آزادی کی خارجی لڑائی آخر میں اقتدار کی باہمی لڑائی بن گئی۔کشمیریوں کے لئے بھی یہی انجام مقدر ہے۔ یا تو وہ اپنی نام نہاد آزادی کی جنگ جاری رکھیں جس کا آخری انجام صرف یہ ہے کہ خارجی لڑائی داخلی لڑائی کی مہلک تر صورت اختیار کر لے۔ یا وہ اپنی موجودہ سیاسی لڑائی کو ختم کر کے اپنی ساری کوششوں کو تعمیر و ترقی کے کام میں لگا دیں۔

جولائی ۲۰۰۱ کے آخر میں میں ایک ہفتہ کے لیے سوئزر لینڈ میں تھا۔ یہ سفر ایک انٹرنیشنل کانفرنس کی دعوت پر ہوا۔ وہ لوگ ہم کو سوئزر لینڈ کے مختلف مقامات پر لے گئے اور اس طرح ہم کو سوئزر لینڈ کے بیشتر حصے کو دیکھنے کا موقع ملا۔ ہماری ٹیم میں ایک ۸۰ سالہ کشمیری خاتون بھی تھیں۔انھوں نے جب سوئزر لینڈ کے حسن کو دیکھا تو وہ بے اختیار رونے لگیں۔ان کی زبان سے نکلا

کہ ہمارا کشمیر بھی ایسا ہی خوبصورت تھا مگر آج وہ تباہ ہو چکا ہے۔

کشمیر کو کس نے تباہ کیا۔ کشمیر کی تباہی کی ذمہ دار کوئی حکومت نہیں۔ اس کی ذمہ داری تمام تر ان نادان لیڈروں پر ہے جنھوں نے اپنی پرجوش تحریر وتقریر سے کشمیری نوجوانوں کو بھڑکایا اور انھیں تباہ کن جنگجوئی کے راستہ پر ڈال دیا۔ یہ لیڈر اگر کشمیری نوجوانوں کو تعلیم اور تعمیر کے راستہ پر ڈالتے تو آج کشمیر شاید سوئزرلینڈ سے بھی بہتر ہوتا۔ مگر نااہل لیڈروں کی نااہل رہنمائی نے کشمیر کو اتنا بڑا نقصان پہنچایا ہے جس کی تلافی کے لیے شاید ایک صدی کی مدت بھی ناکافی ہو۔

ضرورت ہے کہ اب کشمیر کے عوام وخواص جنگجوئی کے راستہ کو مکمل طور پر اور ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیں۔ وہ پرامن تعمیر کے طریقہ کو اختیار کر لیں۔ اگر کشمیر کے لوگ حقیقی فیصلہ کے ساتھ اس تعمیری راستہ کو اختیار کر لیں تو وہی وہ وقت ہو گا جب کہ کشمیر کی وادیوں میں ہر طرف یہ آواز سنائی دے —— جاگ اٹھا کشمیر۔

اسلام کے نام پر غیر اسلام

De-Islamising Islam—Taliban Style

افغانستان میں کمیونسٹ روس کے سیاسی غلبہ کے آخری زمانہ میں میں نے افغانستان کا سفر کیا تھا۔اس سفر میں میں نے دیکھا کہ افغانستان کی راجدھانی کابل مکمل طور پر محفوظ ہے۔مگر طالبان کے دعوے کے مطابق،ان کی اسلامی حکومت کے زمانہ میں کابل کا بڑا حصہ تباہ ہو چکا ہے۔افغانستان کے عوام آج جن مصیبتوں سے دوچار ہیں ویسی مصیبتوں سے افغانی عوام اپنی پوری تاریخ میں کبھی دوچار نہیں ہوئے تھے۔

طالبان روسی کمیونزم کو کفر بتاتے ہیں اور خود اپنے آپ کو اسلام کا نمائندہ قرار دیتے ہیں۔مگر عجیب بات ہے کہ روسی ''کفر'' نے تو افغانستان کو صرف جزئی طور پر نقصان پہنچایا تھا مگر طالبان کے اسلام نے افغانستان کو کُلی طور پر تباہ کر دیا۔یہ سب کچھ افغانستان میں اسلام کے نام پر کیا جا رہا ہے مگر یہ اسلام کے نام پر اسلام کی نفی (de-Islamisation) ہے جس کی کوئی دوسری مثال شاید اسلام کی پوری تاریخ میں نہیں ملے گی۔

یہ طالبان کون ہیں۔وہ کچھ پر جوش اور غیر تربیت یافتہ نوجوانوں کا ایک مشتعل گروہ ہے۔اس قسم کے لوگ جب کسی ملک کے اقتدار پر قابض ہو جائیں تو وہ صرف تخریب کاری کریں گے۔ان سے کسی تعمیر کی امید نہیں کی جا سکتی۔ایسے لوگ ہمیشہ اس عربی شعر کا مصداق ثابت ہوتے ہیں:

إذا كان الغراب رئيس قوم سيهديهم إلى دار البوارِ

چنانچہ طالبان نے افغانستان میں سیاسی قبضہ حاصل کرنے کے بعد اب تک صرف منفی کارروائیاں کی ہیں، انھوں نے وہاں غالباً کوئی بھی مثبت کام نہیں کیا۔طالبان کے اس خود ساختہ اسلامی ایڈیشن کی اس سیاہ فہرست میں ایک انتہائی افسوسناک اضافہ وہ ہے جس کا آغاز یکم مارچ ۲۰۰۱ کو ہوا۔افغانی طالبان نے اپنے مذہبی چیف ملاّ محمد عمر کے حکم کے تحت، ملک میں واقع گوتم بدھ کے

منقولہ اور غیر منقولہ اسٹیچوؤں (statues) کو ڈائنامائٹ اور بل ڈوزر کے ذریعہ توڑنا شروع کردیا۔ انھوں نے کہا کہ انھیں اپنے اس عمل پر فخر ہے اور وہ یہ کام اسلامی تعلیم کے مطابق کررہے ہیں۔ کیوں کہ اسلام بت پرستی کی اجازت نہیں دیتا۔ طالبان کا یہ عمل بلاشبہہ ایک غیر اسلامی فعل ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام بت پرستی کے خلاف ہے۔ مگر بت پرستی اور بت شکنی دونوں میں فرق ہے۔ قرآن میں یہ حکم تو دیا گیا ہے کہ بتوں کو نہ پوجو مگر قرآن میں یہ حکم نہیں دیا گیا کہ بتوں کو توڑ ڈالو۔ اسلام کا طریقہ دلوں سے بت پرستی کو ختم کرنا ہے، نہ کہ پتھر کے مجسموں کو توڑ کر ختم کرنا۔

اس فرق کو سمجھنے کے لئے کچھ مثالیں لیجئے۔ قرآن میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اے مسلمانو، تم لوگ نماز پڑھو۔ مگر قرآن میں یہ حکم نہیں دیا گیا کہ جو لوگ نماز نہ پڑھیں ان کو مار ڈالو۔ ایسی حالت میں اگر کوئی شخص نماز کے قرآنی حکم کو لے کر بے نمازیوں کو مارنے لگے تو وہ قرآنی حکم کی تعمیل نہیں ہوگی بلکہ وہ قرآن کے نام پر سرکشی ہوگی۔ اسی طرح قرآن میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ جو لوگ صاحبِ استطاعت ہوں وہ بیت اللہ کا حج کریں۔ اب اگر کچھ لوگ ایسا کریں کہ وہ استطاعت کے باوجود حج نہ کرنے والوں کو پکڑیں اور ان کا ہاتھ پاؤں توڑنے لگیں تو یہ قرآن کے نام پر ایک خودساختہ عمل ہوگا جو ایک گناہ کا کام ہے، نہ کہ کوئی ثواب کا کام۔

یہی معاملہ بت پرستی کا ہے۔ ایک مسلمان کو یہ حق تو ضرور ہے کہ وہ نرمی اور شفقت کے انداز میں بت پرستی کی روش کو چھوڑنے کی پُرامن تبلیغ کرے۔ مگر کسی مسلمان کو یہ حق ہرگز نہیں کہ وہ اسلام کا نام لے کر بتوں کو توڑنے لگے۔ پہلا کام اگر اسلام کی تعمیل ہے تو دوسرا کام اسلام سے بغاوت اور سرکشی۔

یہاں یہ سوال ہے کہ فتح مکہ کے بعد کعبہ میں رکھے ہوئے بتوں کو کیوں توڑا گیا۔ اصل یہ ہے کہ کعبہ کو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل نے ایک خدا کی عبادت کے لئے بنایا تھا۔ لمبی مدت تک کعبہ اپنے مقصد تعمیر کے مطابق، اسی حال پر رہا۔ بعد کو وہاں کچھ مشرکین پیدا ہوئے۔ انھوں نے کعبہ پر قبضہ کرکے ناجائز طور پر اس کے اندر ۳۶۰ بت رکھ دیئے۔ یہ بت فتح مکہ (۸ ھ) تک باقی رہے۔ رسول اللہ ﷺ نے پہلے یہ کیا کہ مکہ میں شرک کے خلاف تبلیغ کی اور اس کے بعد جب مکہ کے تمام لوگ

اسلام میں داخل ہوگئے اور مکہ پر اہل اسلام کا غلبہ قائم ہوگیا تو پیغمبر اسلام کے حکم سے کعبہ میں ظالمانہ طور پر رکھے ہوئے ان بتوں کو وہاں سے نکال دیا گیا۔

اس روشنی میں دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ کعبہ کے اندر رکھے ہوئے بتوں کے ساتھ جو معاملہ کیا گیا وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے بت شکنی کا معاملہ نہ تھا بلکہ وہ کعبہ کی تطہیر کا معاملہ تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ کعبہ سے اہل شرک کے ناجائز قبضہ کو ختم کرکے دوبارہ اس کو توحید کے اصول پر قائم کردیا جائے۔

اسی طرح قرآن میں بتایا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے زمانہ میں کچھ بتوں کو توڑا (الانبیاء ۵۹) مگر اس واقعہ سے بھی یہ حکم اخذ نہیں ہوتا کہ مسلمانوں کو ہر جگہ بتوں کو توڑنا چاہئے۔ حضرت ابراہیم کا یہ واقعہ ایک استثنائی واقعہ ہے جس طرح ان کا اپنے بیٹے کے ذبح پر آمادہ ہونا یا اپنی بیوی اور چھوٹے بچے کو غیر آباد صحراء میں تنہا چھوڑ دینا۔ حضرت ابراہیم کے ان واقعات کا تعلق ان کی اپنی ذات سے ہے، نہ کہ عمومی اتباع کے لئے۔

حضرت ابراہیم کا کچھ بتوں کا توڑنا اگر کوئی عمومی حکم ہوتا تو ہر پیغمبر کے یہاں اس کی مثال ملتی۔ حالانکہ دوسرے پیغمبروں کے یہاں ایسی مثال موجود نہیں۔ خود حضرت ابراہیم نے صرف ایک بت خانہ کے کچھ بتوں کو توڑا تھا، نہ کہ علاقہ کے تمام موجود بتوں کو۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کا یہ واقعہ عمومی مفہوم میں بت شکنی کا واقعہ نہیں ہے، وہ آپ کی لمبی دعوتی جدوجہد کی تکمیل پر اتمام حجت کے ذیل کا ایک مخصوص واقعہ ہے جس کو قرآن میں کید اصنام (الانبیاء ۵۷) کہا گیا ہے، نہ کہ کسر اصنام۔ یہ حضرت ابراہیم کی ایک انفرادی دعوتی تدبیر ہے، نہ کہ تمام اہل ایمان کے لئے عمومی طور پر قابل تقلید مثال۔

تاریخ بتاتی ہے کہ پیغمبر اسلام کے بعد آپؐ کے صحابہ اور تابعین عرب سے نکل کر اطراف کے مختلف ملکوں میں پھیل گئے، وہاں انھوں نے بڑے پیمانہ پر اسلام کی اشاعت کی۔ حتیٰ کہ بہت سے ملک پوری طرح اسلامی ملک بن گئے۔ مگر صحابہ وتابعین نے کسی بھی ملک میں بتوں یا مجسموں کو توڑنے کا عمل جاری نہیں کیا۔ ان کا نشانہ انسانی دلوں سے بتوں کو نکالنا تھا نہ کہ خارج میں بنے ہوئے

بتوں کو توڑنا۔ اس معاملہ کی ایک مثال یہ ہے کہ دور اول کے یہ مسلمان مصر میں داخل ہوئے۔ وہاں انھوں نے پُر امن دعوت کے ذریعہ لوگوں کے عقیدہ کو بدلا مگر انھوں نے وہاں کے قدیم بتوں کو نہیں توڑا۔ انھیں میں سے ایک مشہور بت ابوالہول تھا۔ ابوالہول کا یہ عظیم بت قاہرہ سے باہر آج بھی ایک چٹان کے اوپر کھڑا ہوا ہے۔ میں نے خود اپنے ایک سفر کے دوران مصر کے اس بت ابوالہول کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

اب اس معاملہ میں افغانستان کی تاریخ کو دیکھئے۔ افغانستانی روایت کے مطابق، افغانستان میں اسلام ابتدائی طور پر پیغمبر اسلام کے آخری زمانہ ہی میں پہنچ چکا تھا۔ اس کے بعد پیغمبر اسلام کے صحابی خالد بن ولید اور دوسرے مسلمان افغانستان میں داخل ہوئے۔

اس وقت افغانستان میں بدھ مذہب کے ماننے والوں کی اکثریت تھی۔ ان میں سے بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کرلیا۔ افغانستان میں اسلام کی اشاعت کا یہ پُر امن عمل جاری رہا۔ یہاں تک کہ محمود غزنوی کے زمانہ میں پورے افغانستان میں اسلام پھیل گیا۔

یہاں قابل لحاظ بات یہ ہے کہ پیغمبر اسلام کے زمانہ میں جب اسلام افغانستان میں داخل ہوا اس سے تقریباً پانچ سو سال پہلے یہ واقعہ ہو چکا تھا کہ افغانستان کے پہاڑوں میں جگہ جگہ گوتم بدھ کے مجسمے تراش کر کھڑے کر دیئے گئے تھے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، افغانستان میں اسلام کے داخل ہونے سے پہلے وہاں بدھ مذہب کے ماننے والے لوگ آباد تھے۔ بعد کو ان میں سے بیش تر لوگوں نے اسلام قبول کرلیا۔ بدّھا کے یہ سنگی مجسمے اسی قبل از اسلام دور کی یادگار ہیں۔

افغانستان کے پہاڑوں میں بننے والے یہ مجسمے جس طرح اسلام سے پہلے سیکڑوں سال تک محفوظ طور پر موجود تھے، اسی طرح وہ اسلام کے بعد بھی ہزار سال سے زیادہ لمبی مدت تک بدستور محفوظ حالت میں موجود رہے۔ حتیٰ کہ بدنام بت شکن سلطان محمود نے بھی افغانستان کے ان مجسموں کو نہیں توڑا۔ یہ صرف طالبان کے خود ساختہ حالیہ اسلامی دور کی بات ہے کہ ان مجسموں یا بتوں کو غیر اسلامی قرار دے کر انھیں توڑا جا رہا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا طالبان، اسلام کی تعلیم سے زیادہ واقف

ہیں۔ اسلام کی جس تعلیم کا علم پیغمبر اسلام کے صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین اور اسی طرح بعد کے اہل اسلام کو نہ تھا اس کا علم طالبان کو کیسے ہو گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ افغانستان کے طالبان بُت شکنی کے نام پر جو کچھ کر رہے ہیں وہ عملاً اسلام شکنی کی ایک صورت ہے۔ یہ عمل صرف اسلام کو بدنام کرنے والا ہے، اس سے اسلام کو کوئی فائدہ پہنچنے والا نہیں۔

۱۴ مارچ ۲۰۰۱ء کو روہیل کھنڈ یونیورسٹی (بریلی) میں راقم الحروف کی ایک تقریر تھی۔ اس تقریر کا موضوع تھا: اسلام اینڈ پیس۔ تقریر کے بعد جو سوالات ہوئے ان میں سے ایک سوال افغانی طالبان کے موجودہ عمل سے بھی تھا۔ میں نے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا:

As you know Umar Faruq, the second caliph of Islam, was a great companion of the Prophet. During his period several countries like Syria, Palestine and Egypt came under the influence of Islam. A large number of statues existed in those countries since pre-Islamic times. History tells us that caliph Umar never issued an order to destroy those statues. But today the ancient statues of Gautam Buddha in Afghanistan are being destroyed under the order of the Taliban chief Mulla Umar. Now the question is: who is the true representative of Islamic religion: Caliph Umar of the early period of Islam or Mulla Umar of the present Afghanistan.

معاملہ کے چند مزید پہلو

۱۔ اسلام مختلف مذاہب کے درمیان رواداری کے اصول کو تسلیم کرتا ہے۔ قرآن میں مکّی دور میں یہ آیت اتاری گئی کہ: **لکم دینکم ولی دین** (الکافرون) یعنی تمھارے لئے تمھارا دین اور میرے لئے میرا دین۔ اسلام کے اس اصول کو اگر ایک فارمولا کی صورت دی جائے تو وہ مختصر طور پر یہ ہوگا کہ ـــــ ایک کی پیروی کرو اور سب کا احترام کرو:

Follow one and respect all.

۲۔ اس اسلامی اصول کی عملی مثالیں اسلام کی پوری تاریخ میں موجود ہیں۔ مثال کے

طور پر اسلام کے دوسرے خلیفہ عمر فاروق کے زمانہ میں فلسطین فتح ہوا۔ اس وقت اسلامی خلیفہ اور فلسطین کی مسیحی قوم کے درمیان جو معاہدہ طے پایا اور جس پر خلیفہ دوم نے دستخط کئے اس میں دوسری باتوں کے علاوہ یہ بھی لکھا تھا کہ مسیحیوں کے چرچ اور چرچ میں رکھے ہوئے مسیح اور مریم کے مجسمے اور ان کے عقیدہ کے مطابق صلیب (Holy Cross) کو علی حالہ باقی رکھا جائے گا۔ مذہبی رواداری کے اسی اصول پر اسلام کی پوری تاریخ میں عمل ہوتا رہا ہے۔ پچھلی صدیوں میں اسلام کی غیر معمولی اشاعت کا ایک خاص سبب یہی ہے۔ کچھ مسلم بادشاہوں نے بعض اوقات کسی بت کو توڑا مگر یہ استثنائی واقعات ہیں اور وہ ان مسلم بادشاہوں کے اپنے سیاسی مفاد کے تحت پیش آئے، نہ کہ اسلام کی کسی تعلیم کے تحت۔

۳۔ افغانستان میں گوتم بدھ کی جو مورتیاں یا مجسمے پہاڑی پتھر کو تراش کر بنائے گئے ہیں ان کی حیثیت قدیم زمانہ میں جو بھی رہی ہو مگر دو ہزار سال کی لمبی مدت گذرنے کے بعد ان کی حیثیت تاریخی یادگار کی ہو چکی ہے۔ اب وہ کسی مخصوص گروہ کی ملکیت نہیں ہیں، اب ان کی حیثیت عالمی تاریخی ورثہ کی ہے۔ وہ انسانیت کا مشترک اثاثہ ہیں۔ ایسی حالت میں خود اسلام کا اصول یہ ہے کہ اس کو انفرادی یا ملکی دائرہ سے نکال کر عالمی دائرہ کی چیز قرار دیا جائے۔

مثال کے طور پر یروشلم کی مسجد اقصیٰ کو لیجئے۔ مسلمان اس مسجد کے وارث ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اس دعوے کی منطقی بنیاد بھی یہی ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، یروشلم کی مسجد اقصیٰ عین اُس مقام پر بنائی گئی ہے جہاں اسرائیلی پیغمبر اور بادشاہ سلیمان بن داؤد نے یہودی عبادت خانہ (ہیکل) تعمیر کیا تھا۔ بنوامیہ کے زمانے میں اسی مقام پر موجودہ مسجد اقصیٰ بھی تعمیر کی گئی۔

اس معاملہ کی اصل کیا ہے۔ اس کی اصل یہ ہے کہ مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق، پیغمبر اسلام نے اپنی نبوت کے تیرھویں سال خدائی انتظام کے تحت مدینہ سے یروشلم کا سفر کیا۔ خدا نے اپنی لامحدود قدرت کے تحت پوری تاریخ کے تمام پیغمبروں کو یہاں اکٹھا کیا۔ ان تمام پیغمبروں نے پیغمبر اسلام کی امامت میں یہاں باجماعت نماز ادا کی۔ مسلم عقیدہ کے مطابق، اس کے بعد یہ مقام

صرف یہودیوں کا مقدس مقام نہ رہا بلکہ وہ تمام مذاہب، بشمول اسلام، کا مشترک مذہبی مقام بن گیا۔ مسلمان اپنے اسی عقیدہ کی بنیاد پر یروشلم کی مسجد اقصیٰ کی تولیت کے دعویٰ دار ہیں۔ اگر اس اصول کو نہ مانا جائے تو مسجد اقصیٰ یا اس کی جگہ (site) صرف یہودیوں کی ملکیت قرار پائے گی، اس میں مسلمانوں کا حصہ تسلیم کرنا ممکن نہ ہوگا۔

اپنی نوعیت کے اعتبار سے، یہی معاملہ افغانستان کے ان مجسموں کا ہے جو قدیم زمانہ میں افغانستان کے پہاڑوں میں بنائے گئے تھے۔ دو ہزار سال پہلے جب وہ بنائے گئے اس وقت وہ افغانستان کی ملکیت ہو سکتے تھے مگر لمبی تاریخ گذرنے کے بعد اب وہ بین اقوامی ورثہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اب وہ تاریخ انسانی کا حصہ ہیں، نہ کہ محدود طور پر ایک ملک کی ذاتی جائداد کا حصہ۔

اب افغانستان کی کسی حکومت کو یہ حق نہیں کہ وہ عالمی برادری کو نظرانداز کرکے بطور خود ان کے بارے میں یک طرفہ فیصلہ لے سکے۔ افغانستان کی کسی حکومت کو زیادہ سے زیادہ اگر کوئی حق دیا جا سکتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ وہ یہ اعلان کر دے کہ جو ملک چاہے وہ ان کو اٹھا کر اپنے یہاں لے جائے مگر تاریخی اہمیت کے ان مجسموں کو برباد کرنے کا حق کسی مقامی حکومت کو ہرگز نہیں۔ طالبان کی حکومت ان مجسموں کو فروخت بھی نہیں کر سکتی۔ اس لئے کہ طالبان کے عقیدہ کے مطابق، جن مجسموں کو اپنے ملک میں رکھنا جائز نہ ہو ان کو فروخت کرنا بھی یقینی طور پر جائز نہ ہوگا۔

۴۔ اسلام کی ایک تعلیم یہ ہے کہ مسلمان کوئی ایسا اقدام نہ کریں جس کا نتیجہ خود ان کی طرف بُری شکل میں لوٹنے والا ہو۔ مثال کے طور پر قرآن میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کے سوا جن معبودوں کو یہ لوگ پکارتے ہیں ان کو تم گالی نہ دو ورنہ یہ لوگ حد سے گذر کر جہالت کی بنا پر اللہ کو گالی دینے لگیں گے (الانعام ۱۰۹)۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے نزدیک کوئی کام اگر بظاہر درست ہو تب بھی وہ اس وقت نہیں کیا جائے گا جب کہ آخرکار اس کا نتیجہ خود مسلمانوں کے خلاف نکلنے والا ہو۔

اس اصول کی روشنی میں دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ طالبان کا موجودہ اقدام سراسر قرآنی تعلیم کے خلاف ہے۔ کیوں کہ ایک مسلم ملک اگر اپنے حدود میں واقع ایسے تاریخی نوادر اور آثار کو تباہ کرے جن

سے دوسری قوموں کے جذبات وابستہ ہوں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ خود بھی اپنے ملک میں مسلمانوں کے تاریخی آثار کو تباہ کرنے لگیں گے۔ اس طرح مسلمانوں کا یہ اقدام خود مسلمانوں کے لئے ناقابلِ تلافی نقصان کا باعث ہوگا۔

یہ بات اب مستقبل کے اندیشہ کی نہیں رہی۔ حقیقت یہ ہے کہ مارچ ۲۰۰۱ کے شروع میں جب میڈیا میں یہ خبریں آئیں کہ افغانستان میں گوتم بدھ کے قدیم مجسموں کو تباہ کیا جارہا ہے تو اس کے خلاف ساری دنیا میں شدید ردّ عمل کا اظہار کیا جانے لگا۔ شدید ردّ عمل کے انھیں واقعات میں سے ایک وہ بھی تھا جس کا یہاں ذکر کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (۲ مارچ ۲۰۰۱) کے صفحۂ اول پر ایک رپورٹ اس عنوان کے تحت شائع ہوئی ہے:

Cultural Carnage, Screams India

اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ایک انتہا پسند ہندو نے افغانستان کی ان خبروں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ کسی کی پسند یا ناپسند کا معاملہ نہیں۔ اس وقت کیا ہوگا جب کہ غیر مسلم ملک اپنے یہاں مسلم تاریخی یادگاروں کو تباہ کرنے لگیں:

It's not a matter of likes and dislikes. The world cherished it. What would happen if the non-Islamic countries start destroying Islamic architecture?'' he questioned.

۵۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مطالعہ بتاتا ہے کہ غلبہ حاصل کرنے کے بعد فوراً آپ نے صلح کی پالیسی اختیار کی۔ جیسا کہ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ: **الصلح خیر** (النساء ۱۲۸)۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ غلبہ حاصل کرنے کے بعد فوراً تعمیر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور تعمیر کا کام امن کے ماحول کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں ابتدائی اسلامی ریاست قائم ہونے کے بعد فوراً ایک ڈیکلریشن جاری کیا جو صحیفۂ مدینہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس ڈیکلریشن میں آپ نے یہود کو برابر کا درجہ دے کران سے نزاع کو ختم کرنے کی پالیسی اختیار کی۔ اسی طرح آپ نے حدیبیہ کے موقع پر قریش مکہ سے ناجنگ معاہدہ کرلیا۔ اگر چہ یہ معاہدہ صرف اسی وقت ممکن ہوا جب کہ آپ نے فریق مخالف کی شرطوں کو یک طرفہ طور پر مان لیا۔ اسی طرح آپ نے عرب کے مختلف

مقامات پر بسے ہوئے قبائل سے امن کا معاہدہ کرنا شروع کیا یہاں تک کہ چند سالوں میں تمام عرب قبائل معاہدات امن کے تحت آ گئے، وغیرہ۔

طالبان، اپنے اعلان کے مطابق، افغانستان میں اسلام کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ان کی پالیسی پیغمبر اسلام کی مذکورہ پالیسی کے سرتا سر خلاف ہے۔ افغانستان میں غلبہ پانے کے لئے پہلے وہ خود افغانستان کے قبائل سے لڑتے رہے۔ پھر جب انھیں افغانستان کے ۹۰ فیصد رقبہ پر غلبہ حاصل ہو گیا تو انھوں نے ایسی انتہا پسندانہ پالیسی اختیار کی جس کے نتیجہ میں تمام ملکوں سے ان کی نزاع شروع ہو گئی۔ ان کے اس متشددانہ پالیسی کی آخری مثال وہ ہے جو گوتم بدھ کے تاریخی مجسموں کو توڑنے کی صورت میں سامنے آئی ہے۔

افغانستان کے طالبان کے پاس صرف جوش کا سرمایہ ہے، ہوش کے سرمایہ سے وہ تقریباً خالی ہیں۔ اگر وہ باہوش اور دانشمند ہوتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ موجودہ زمانہ میں بیش تر قومیں، صحیح یا غلط طور پر مسلمانوں کی حریف بن چکی ہیں۔ کسی نہ کسی سبب سے ہر قوم کو مسلمانوں سے شکایت ہے۔ یہودی، عیسائی، ہندو، سکھ، پارسی، وغیرہ ہر ایک کسی نہ کسی سبب سے اپنے دل میں مسلمانوں کے خلاف منفی جذبات لئے ہوئے ہے۔

نفرت کی اس عمومی فضا میں غالباً ایک ہی قابل ذکر استثناء باقی رہ گیا تھا، اور وہ بودھ فرقہ کا تھا۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ بودھوں کو مسلمانوں سے کوئی قابل ذکر شکایت نہیں تھی۔ مگر مارچ ۲۰۰۱ میں جب افغانستان میں گوتم بدھ کے مجسموں کو توڑا گیا تو ساری دنیا کے بودھ مسلمانوں سے، اور نتیجۃً خود اسلام سے متنفر ہو گئے۔ طالبان کی اس ناعاقبت اندیشانہ پالیسی نے اسلام یا مسلمانوں کو مثبت طور پر تو کچھ نہیں دیا مگر اس کا منفی نقصان اتنا زیادہ ہے جس کو شاید لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

۶۔ یہ عقل اور فطرت کا ایک معلوم اصول ہے کہ کوئی ایسا کام نہ کیا جائے جس سے دوسروں کے درمیان اپنی بدنامی کا اندیشہ ہو۔ یہی خود اسلام کا اصول بھی ہے۔ چنانچہ پیغمبر اسلام نے اپنے زمانہ میں کئی اقدامات صرف اس لئے نہیں کئے کہ ان میں اسلام کی بدنامی کا اندیشہ تھا۔ مثلاً مدینہ کے لیڈر

عبداللہ بن اُبی جیسے ثابت شدہ مجرم کو آپ نے صرف اس لئے کوئی سزا نہ دی کہ اس سے لوگوں کے جذبات بھڑکیں گے اور پھر اسلام لوگوں کے درمیان بدنام ہو جائے گا۔ اس اصول کی روشنی میں دیکھا جائے تب بھی طالبان کا موجودہ رویہ سراسر غیر اسلامی ہے کیوں کہ تاریخی آثار کے بارے میں جدید دنیا انتہائی حد تک حساس ہوگئی ہے۔ آج کے لوگ تاریخی آثار کو مشترک عالمی ورثہ سمجھتے ہیں۔ آج کا انسان ایسے لوگوں سے سخت نفرت کرتا ہے جو تاریخی آثار کی حفاظت نہ کریں بلکہ ان کو تباہ کرنے کے درپے ہو جائیں۔

موجودہ زمانہ میں تاریخی آثار کے بارے میں لوگوں کی حساسیت کا ایک خاص علمی سبب ہے۔ اصل یہ ہے کہ سائنسی دور سے پہلے قدیم زمانہ میں کسی بات کو ثابت کرنے کے لئے صرف یہ کافی تھا کہ اس کے حق میں ایک تمثیل بیان کردی جائے۔ کوئی فرضی قصہ یا پُر اسرار کہانی بھی کسی بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی سمجھی جاتی تھی۔ قدیم زمانہ میں مزعومات اور مسلّمات میں فرق کرنے کا رواج نہ تھا۔

مگر جدید زمانہ میں سائنسی طرز فکر کے ظہور نے اس معاملہ کو یکسر بدل دیا ہے۔ اب تمثیل یا فرضی کہانی علمی اعتبار سے غیر مستند قرار پا چکے ہیں۔ اب صرف وہ چیز قابل اعتبار ہے جو اپنا کوئی حقیقی وجود رکھتی ہو۔ اس نئے نقطۂ نظر کی بنا پر خارجی تاریخی شواہد کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ کیوں کہ تاریخی شواہد کو تاریخ کے بارے میں معلومات کا مستند ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ اس نئے ذہن کے نزدیک تاریخی یادگاروں کو تباہ کرنا، تاریخ کے مستند ذرائع کو تباہ کرنے کے ہم معنٰی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے لوگ کسی بھی قیمت پر اس کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے کہ تاریخی شواہد کو تباہ کر دیا جائے۔

اس نئے نظریہ نے عقیدہ کو تاریخ سے الگ کر دیا ہے۔ چنانچہ افغانستان میں واقع ان قدیم مجسموں کو اب صرف مذہبی عقیدہ کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا بلکہ انھیں تاریخ کے سنگی شواہد کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ افغانستان کے موجودہ واقعات پر عالمی برادری کے شدید ردعمل کا اصل سبب یہی جدید تاریخی ذوق ہے۔

جدید میڈیا نے اس معاملہ کی سنگینی میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا ہے۔ چنانچہ افغانستان کی حکومت نے جیسے ہی گوتم بودھ کے قدیم مجسمے کو توڑنے کا آغاز کیا فوراً ہی میڈیا کے ذریعہ اس کی خبریں ساری دنیا میں پہنچ گئیں اور عین اسی دن سے تمام دنیا میں طالبان کے اس فعل کی شدید مذمت کی جانے لگی۔

افغانی طالبان اپنے اس کام کو اگر اپنی قوم یا اپنے قبیلہ کے نام پر کر رہے ہوتے تو ان کے اس فعل سے خود طالبان یا ان کا قبیلہ بدنام ہوتا۔ مگر انھوں نے اس کام کو اسلام اور شریعت اسلام کے نام پر کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طالبان کا یہ فعل اسلام کے ساتھ منسوب کیا جانے لگا۔ لوگ اسلام کے خلاف شدید جذبات کا اظہار کرنے لگے۔ وہ کہنے لگے کہ اسلام اگر یہی ہے تو وہ وحشیت اور بربریت کا مذہب ہے۔ آج کی مہذب سوسائٹی کے لئے اسلام قابلِ قبول نہیں۔

یہ کہنا صحیح ہوگا کہ طالبان کے بلڈوزر بظاہر پتھر کے مجسموں کو بلڈوز کر رہے ہیں مگر اپنے نتیجہ کے اعتبار سے وہ خود اسلام کی تصویر کو بلڈوز کرنے کے ذمہ دار ہیں۔

۷۔ نئی دہلی کے انگریزی ہفت روزہ آرگنائزر (Organiser) کے شمارہ ۱۱ مارچ ۲۰۰۱ء میں ایک مضمون چھپا ہے۔ اس کا تعلق افغانستان میں گوتم بدھ کی مورتیوں کو توڑنے سے ہے، اس کے مضمون نگار شیام کھوسلا (Shyam Khosla) ہیں۔ اس کا عنوان ہے — اسلامی بنیاد پرستی، ایک تہذیبی خطرہ:

"Islamic Fundamentalism— A Civilizational Threat"

مضمون نگار نے افغانستان میں بدھا کے اسٹیچو کو توڑنے کے عمل کو وحشیانہ فعل (barbaric act) قرار دیا ہے۔ ہمیں اس سے پورا اتفاق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ افغانستانی طالبان کے اس تخریبی عمل کو کسی بھی زاویہ سے درست قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ان کے اس فعل کی جتنی بھی زیادہ مذمت کی جائے وہ یقینی طور پر جائز ہوگی۔

مگر مذکورہ مضمون نگار نے اسی کے ساتھ اپنے اس مضمون میں یہ کیا ہے کہ انھوں نے افغانی طالبان کے اس فعل کو اسلام کی تعلیمات سے جوڑا ہے۔ ان کی یہ دوسری رائے یقینی طور پر غلط

ہے۔کوئی بھی صاحب علم اس سے اتفاق نہیں کرسکتا۔ وہ لکھتے ہیں کہ ملا عمر کا یہ کہنا ہے کہ ان کا یہ حکم اسلامی شریعت کے عین مطابق ہے۔ اگر ایسا ہے تو کوئی شخص کس طرح ہوش وحواس کے ساتھ یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ اسلام رواداری کی تعلیم دیتا ہے:

Mulla Mohammad Umar says his edict is in line with Islamic laws. If that were so, how can anyone in his senses claim that Islam teaches the spirit of tolerance? (p-4)

میں کہوں گا کہ اسلام کی تعلیمات کیا ہیں اس کو جاننے کا ماخذ ملا عمر کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ اس کے ماخذ قرآن اور سنت ہیں۔ جو شخص بھی اسلام کو جاننا چاہے اس پر لازم ہے کہ وہ اسلام اور مسلمان میں فرق کرے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے ہندستانی ڈیموکریسی اور لالو-رابڑی کے سیاسی نمونہ اور ڈیموکریسی میں فرق کیا جاتا ہے۔ اس فرق کے بغیر نہ اسلام کو سمجھا جاسکتا ہے اور نہ ہندستانی جمہوریت یا ہندستانی دستور کو۔

اسلام کا نظریاتی ماخذ قرآن اور سنت ہے۔ قرآن اور سنت میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ بین اقوامی یا بین انسانی تعلقات کو صلح اور امن اور باہمی معاہدوں کی بنیاد پر استوار کیا جانا چاہیے۔ اسلام کا یہ ایک مستقل اصول ہے کہ بین اقوامی معاملات میں مسلمانوں کو بھی انھیں روایات کا پابند ہونا چاہئے جو مختلف قوموں کے درمیان باہمی اتفاق سے رائج ہوگئی ہوں۔ بین اقوامی معاملات میں یکطرفہ طور پر کوئی آزادانہ روش اختیار کرنا مسلمانوں کے لئے درست نہیں (ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب *Islam Rediscovered*)

جہاں تک اسلام کے مستند عملی نمونہ کا سوال ہے تو اسلام میں مستند عملی نمونہ کی حیثیت صرف پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی ہے، اور پھر اصحاب رسول، خاص طور پر خلفاء راشدین کی۔ دور اول کے ان نمونوں کے بعد کسی بھی دوسرے مسلمان یا مسلم گروہ کو مستند نمونہ کی حیثیت حاصل نہیں۔

جیسا کہ معلوم ہے، خلیفہ عمر پیغمبر اسلام کے ایک جلیل القدر صحابی تھے۔ پیغمبر اسلام کے بعد ان کو دوسرے خلیفہ راشد کی حیثیت حاصل ہے۔ خلیفہ عمر کے زمانہ میں اسلام کے اثرات مختلف ملکوں تک

پہنچے۔ جیسے شام، فلسطین اور مصر، وغیرہ۔ چوں کہ اُس زمانہ میں ساری دنیا میں بت پرستی کا رواج تھا۔ اس لئے ان مفتوحہ ملکوں میں کثرت سے بت اور مجسمے موجود تھے جو قبل از اسلام دور سے چلے آرہے تھے۔ تاہم خلیفہ عمر نے ان موجود مجسموں کو تباہ کرنے کا کوئی حکم نہیں دیا۔ مگر آج ہم دیکھتے ہیں کہ افغانستان میں واقع گوتم بدھ کے قدیم مجسموں کو طالبان کے چیف ملا عمر کے حکم سے توڑا جارہا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اسلام کا سچا نمائندہ کون ہے۔ دور اول کے خلیفہ عمر یا جدید افغانستان کے ملا عمر۔

طالبان کے مذکورہ قابل مذمت اقدام کے بعد راقم الحروف نے ایک مشترک اخباری بیان پر دستخط کئے تھے۔ یہ بیان اخباروں میں چھپ چکا ہے۔ اس بیان کو اس آرٹیکل کے خاتمہ پر نقل کیا جاتا ہے۔

یہ بات تکلیف دہ ہے کہ افغانستان کی طالبان حکومت نے تاریخی اور مذہبی اہمیت کے حامل مجسموں کو ڈھانے کا فیصلہ کیا ہے۔ تاریخی آثار پوری بنی نوع انسانیت کا ورثہ ہیں۔ ان کا تعلق کسی خاص حکومت، علاقے یا عوام سے نہیں ہے۔ مذہبی عبادت گاہوں اور دینی شخصیتوں کے مجسموں کو ڈھانا بالکل غیر اسلامی اور غیر ضروری عمل ہے۔ اسلام ہمیں حکم دیتا ہے کہ ہم دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کا احترام کریں۔ اسلام ہمیں کسی بھی فرقے کی مذہبی جگہوں کو منہدم کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اگر افغانستان سے آنے والی اطلاعات درست ہیں تو ہم اس عمل کی مذمت کرتے ہیں اور طالبان حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ایسے عمل سے باز آجائے جو کہ اسلام کی روح کے منافی ہے:

It is unfortunate to learn that Afghanistan's Taliban Government has decided to demolish statues of historical and religious importance in the country. Historical monuments are heritage of all mankind and do not belong to any government or area or people. Demolition of places of worship and statues of religious personalities is totally un-Islamic and unwarranted. Islam has commanded us to respect places of worship of other religions. Islam does not allow the destruction of religious places of any community. If the news emanating from Afghanistan is correct we condemn this act and ask the Taliban government to desist from any such step which goes against the spirit of Islam.

کرنے کا کام

انڈیا اور پاکستان کے مسائل بھی ایک ہیں اور ان کا حل بھی ایک۔ دونوں ملکوں میں ہر قسم کے امکانات (potential) اپنی اعلیٰ صورت میں موجود ہیں۔ مگر واحد چیز جہاں دونوں ملکوں کی قسمت رکی ہوئی ہے وہ دونوں کے درمیان تعلقات کا نارمل نہ ہونا ہے۔ قدیم مثل ہے کہ انسان ہر دشمن کا تحمل کرسکتا ہے مگر وہ اپنے پڑوسی سے دشمنی کا تحمل نہیں کرسکتا۔ انڈیا اور پاکستان کے معاملہ میں یہ مثل اپنی بدترین صورت میں صادق آتی ہے۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انڈیا اور پاکستان کے درمیان اس وقت ایک غیر اعلان شدہ جنگ (undeclared war) کی حالت قائم ہے۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ اس صورت حال کو ختم کرکے دونوں کے درمیان اعلان شدہ امن (declared peace) کی حالت قائم کی جائے۔ یہ امن صرف اس طرح قائم ہوسکتا ہے کہ دونوں ملک ماضی کو بھلا کر اور ہر قسم کا فرضی یا غیر فرضی خطرہ مول لے کر بیک وقت یہ طے کریں کہ آج سے ہم دونوں پرامن پڑوسی کے طور پر رہیں گے اور کسی بھی عذر (excuse) کی بنا پر ٹکراؤ کا طریقہ اختیار نہ کریں گے۔

تاریخ کا تجربہ ہے کہ دنیا میں جب بھی کسی نے کوئی کامیابی حاصل کی ہے تو امن اور مفاہمت کے ذریعہ حاصل کی ہے۔ جنگ اور ٹکراؤ کے ذریعہ کبھی کسی نے کوئی حقیقی کامیابی حاصل نہیں کی۔

اس کی ایک سبق آموز مثال امریکا اور چین کے درمیان مفاہمت کا حالیہ واقعہ ہے۔ امریکا اور چین دونوں ایک دوسرے کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ یہ نوبت پہنچ چکی تھی کہ امریکا چین کے مستقل وجود ہی کا منکر تھا۔ اس نے چین کو مین لینڈ (main land) کا نام دے رکھا تھا۔ مگر آخر کار امریکا کے حقیقت پسند مدبرین کی سمجھ میں آیا کہ چین کے ساتھ رقابت کی پالیسی خود ان کے اپنے مفادات کے خلاف ہے۔ امریکا چین کو جیسا دیکھنا چاہتا ہے ویسا اسے بنانے کے لئے بھی قابل عمل راستہ یہی ہے کہ نرمی اور مفاہمت کے اصول پر چین کے ساتھ معاملہ کیا جائے۔

اس سلسلہ کا صرف ایک حوالہ یہاں نقل کرنا مفید ہوگا۔ ۲۰ ستمبر ۲۰۰۰ کو امریکا کی

سینٹ (Senate) نے ایک غیر معمولی قانون کو منظوری دی۔ اس قانون کے مطابق، چین کو وہ درجہ (status) مل گیا جس کو امریکا میں پی این ٹی آر (permanent normal trade relations) کہا جاتا ہے۔ امریکی مدبرین کا خیال ہے کہ اس کے ذریعہ ایک طرف امریکا کی خوش حالی (prosperity) بڑھے گی اور دوسری طرف چین میں ڈیموکریسی آئے گی۔

امریکا میں بہت سے لوگ اپنے روایتی مزاج کی بنا پر اس کے خلاف تھے کہ چین کو اس قسم کا دوستانہ درجہ دیا جائے۔ نئی دہلی کے انگریزی روزنامہ ہندستان ٹائمز کی رپورٹ (۲۱ ستمبر ۲۰۰۰) کے مطابق، امریکا کے اس وقت کے صدر بل کلنٹن نے اپنی جوابی تقریر میں کہا کہ — امریکا گھونسا دکھانے کے بجائے اپنے پھیلے ہوئے ہاتھ کے ذریعہ چین میں زیادہ اثر و رسوخ حاصل کر سکتا ہے:

The US would have more influence in China with an outstretched hand than with a clenched fist (p. 13)

ہندستان اور پاکستان کو اگر ترقی کرنا ہے تو دونوں ہی کو یہ کرنا ہوگا کہ وہ آپس میں حریفانہ تعلق کو ختم کریں اور دوستانہ تعلق کو بڑھائیں۔

تعلقات کی بہتری کا یہ کام نہ ٹریک ون ڈپلومیسی کے ذریعہ ہو سکتا ہے اور نہ ٹریک ٹو ڈپلومیسی کے ذریعہ، اور نہ کسی ٹریک تھری ڈپلومیسی کے ذریعہ۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ دونوں کے درمیان فوری طور پر اور غیر مشروط طور پر امن قائم کیا جائے۔

دونوں ملکوں کو یہ جاننا چاہئے کہ اس دنیا میں ترقی کا راز جغرافی خطہ کی توسیع نہیں بلکہ حاصل شدہ جغرافی خطہ کی تعمیر ہے۔ موجودہ زمانے میں اس اصول کی بہترین مثال سنگاپور کی صورت میں پائی جاتی ہے۔

۲۔ دونوں ملکوں کے درمیان اس طرح تعلقات کو نارمل بنانے میں سب سے بڑی رکاوٹ کشمیر کا مسئلہ ہے۔ حتیٰ کہ یہ کہا جانے لگا ہے کہ کشمیر تیزی سے جوہری جنگ چھڑنے کا میدان (nuclear flash point) بنتا جا رہا ہے۔ مجھے یقین نہیں کہ دونوں میں سے کوئی ملک اس دیوانگی تک پہنچ سکتا ہے کہ وہ ایٹمی جنگ چھیڑ دے جو بلاشبہہ دوطرفہ خودکشی کے ہم معنیٰ ہے۔ تاہم یہ یقینی ہے کہ

کشمیر کا مسئلہ اگر اسی طرح باقی رہتا ہے تو دونوں ملکوں کی ترقی رکی رہے گی۔

کچھ عرصہ پہلے میری ملاقات اقوام متحدہ کے ایک ذمہ دار سے ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ آپ کے نزدیک کشمیر کے مسئلہ کا حل کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس مسئلہ کا اس کے سوا کوئی اور حل نہیں کہ حالت موجودہ کو قبول کر لیا جائے:

There is no solution to this problem except to accept the status quo.

انڈیا اور پاکستان دونوں کی اصل ضرورت یہ ہے کہ دونوں ملک اپنی ساری طاقت تعلیم اور اقتصادیات کے میدان میں لگا دیں، یعنی دونوں ملکوں میں صد فی صد لوگ تعلیم یافتہ ہو جائیں۔ دونوں ملکوں میں بہترین انفراسٹرکچر موجود ہو۔ دونوں ملکوں میں اعلیٰ معیار کی اقتصادی سرگرمیاں جاری ہوں، دونوں ملک دنیا کو دینے کی پوزیشن میں ہو جائیں، جب کہ اس وقت دونوں ہی ملک لینے کے مقام (receiving end) پر پڑے ہوئے ہیں۔

انڈیا اور پاکستان میں اس قسم کی تعمیر بجائے خود اتنی زیادہ اہم ہے کہ اس کو حاصل کرنے کے لئے کسی بھی دوسری چیز کی قربانی اتنی مہنگی نہیں کہ اس کو اس راہ میں رکاوٹ بنا لیا جائے۔

۳۔ اس سلسلے میں ایک اور اہم چیز یہ ہے کہ دونوں ملک اس نظریاتی کٹرپن کو چھوڑ دیں جو پچاس سال سے زیادہ مدت سے دونوں ملکوں میں قائم ہے۔ میری مراد اس انتہا پسندانہ نظریئے سے ہے جس کو انڈیا میں کلچرل نیشنلزم اور پاکستان میں اسلامک نیشنلزم کہا جاتا ہے۔ انڈیا میں کچھ لوگ یہ اصرار کر رہے ہیں کہ قومیت (nationhood) کی بنیاد قدیم بھارتی کلچر ہے۔ دوسری طرف پاکستان کے کچھ پرجوش لوگ یہ اعلان کر رہے ہیں کہ پاکستان کی قومیت اسلام پر مبنی ہے۔

یہ دونوں نظریات یکساں طور پر کٹرپن کے نظریات ہیں۔ وہ نہ تو درست ہیں اور نہ وہ اس دنیا میں قابل عمل ہیں۔

قومیت کی قابل عمل اور عالمی طور پر تسلیم شدہ بنیاد صرف ایک ہے اور وہ ہے، مبنی بر وطن قومیت۔ قومیت کو عقیدہ اور مذہب سے جوڑنا ایک ایسا ڈاگمیٹزم (dogmatism) ہے جو اس دنیا میں سرے سے قابل عمل ہی نہیں۔

۴۔ دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات کو نارمل بنانے کے لئے ضروری ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان آمد ورفت کو پوری طرح کھول دیا جائے۔انڈیا اور پاکستان کے درمیان اگر آزادانہ اختلاط شروع ہو جائے تو اس سے دوررس نتائج حاصل ہونگے۔اس کے ذریعہ نہ صرف تعلیمی، ثقافتی اور اقتصادی فائدے حاصل ہوں گے بلکہ اسلام کی دعوت واشاعت کے بند دروازے بھی کھل جائیں گے۔

۱۹۴۷ سے پہلے مہاتما گاندھی جو تحریک چلا رہے تھے اس کا نشانہ یہ تھا کہ انڈیا کو انگریزوں کی سیاسی ماتحتی سے نکالا جائے اور یہاں ایک آزاد جمہوری نظام قائم کیا جائے۔اس تحریک میں اول دن سے ایک داخلی تضاد شامل تھا مگر اس تحریک کے لیڈروں نے غالباً نہ تو اس نزاکت کو سمجھا اور نہ اس کے لئے اپنے ساتھیوں کو تیار کیا۔

یہ نازک مسئلہ یہ تھا کہ ۱۹۴۷ سے پہلے تحریک کا واحد نشانہ یہ تھا کہ انگریزوں کے مقابلہ میں اس کو فتح حاصل ہو، اس تحریک میں شکست کے لئے کوئی خانہ نہ تھا۔مگر ۱۹۴۷ کے بعد جو قومی نظام ملک میں بننے والا تھا اس میں برعکس طور پر دونوں ہی کی اہمیت یکساں تھی۔اس نئے نظام میں جتنا فتح حاصل کرنا ضروری تھا اتنا ہی یہ بھی ضروری تھا کہ شکست کو تسلیم کیا جائے۔

۱۹۴۷ کے بعد ملک میں قومی نظام بننے والا تھا۔اس کا مدار تمام تر الیکشن پر تھا۔الیکشن میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک پارٹی کو فتح ملتی ہے اور دوسری پارٹی کو شکست۔اس لئے آزادی کے بعد بننے والے نظام کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لئے ضروری تھا کہ لوگوں کے اندر جیت پر خوشی منانے کے ساتھ اپنی ہار کو ماننے کا مزاج بھی اسی درجہ میں پایا جائے۔مگر ۱۹۴۷ سے پہلے کی تحریک نے لوگوں کے اندر یہ مزاج سرے سے بنایا ہی نہ تھا۔یہ لوگ عین اپنے مزاج کے مطابق، صرف اپنی فتح کی خوشی منانا جانتے تھے۔وہ اس سے واقف نہ تھے کہ ہار کو ماننا بھی کوئی اہم قومی کام ہے۔

غالباً لوگوں کا یہی مزاج وہ واحد سبب ہے جس کے نتیجہ میں ہندستان کی جمہوریت سیاسی کرپشن کا بدترین نمونہ بن گئی۔انتخابی سیاست میں ضروری ہوتا ہے کہ ہارنے والا اپنی ہار کو مانے، اس کے بغیر انتخابی سیاست کامیابی کے ساتھ نہیں چل سکتی۔مگر ہمارے سیاسی لیڈر اپنی سابقہ تربیت کے

اعتبار سے یہ جانتے ہی نہ تھے کہ جمہوری نظام میں اپنی ہار کو ماننا کتنا زیادہ اہم ہے۔

بدقسمتی سے یہ مزاج نہ ہندستان کے لوگوں میں بنایا گیا اور نہ پاکستان کے لوگوں میں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں ہی ملک یکساں طور پر بربادی کا شکار ہو کر رہ گئے۔ دونوں ہی ملکوں میں یہ ہوا کہ پہلے اگر ان کی لڑائی مفروضہ دشمن کے خلاف جاری تھی تو اب ان کی لڑائی خود آپس میں جاری ہوگئی۔ تاریخ بنتے بنتے رہ گئی۔

۱۹۴۷ کے بعد ہندستان اور پاکستان دونوں کے حصہ میں ایک عظیم امکان آیا تھا۔ مگر دونوں ہی ملکوں میں یہ ہوا کہ وہ غیر ضروری مسئلوں میں الجھ کر رہ گئے۔ دونوں کو جو اصلی اور ضروری کام کرنا تھا وہ دونوں ہی ملکوں میں نہ ہو سکا۔ اب آخری وقت آ گیا ہے کہ دونوں ملکوں میں نئے دور کا آغاز کیا جائے۔ اس نئے دور کے آغاز کے لئے صرف ایک چیز کی ضرورت ہے — گہری سمجھ کے ساتھ گہری منصوبہ بندی۔

زیرِ نظر کتاب برصغیر ہند کی تقریباً سو سالہ تاریخ کا ایک جائزہ ہے۔ اِس تاریخ کے بیش تر حصے کو مصنف نے براہِ راست طور پر دیکھا اور اس کے کچھ حصے کو اُس نے قریبی رابطوں کے ذریعے بالواسطہ طور پر جانا۔ برصغیر ہند کے یہ سو سال، جس میں پوری بیسویں صدی شامل ہے، اِس جغرافی خطے کے لیے غیر معمولی سرگرمیوں کے سال تھے۔ مگر بیسویں صدی کے خاتمے پر نتیجے کے اعتبار سے، اُس کا جائزہ لیا جائے تو تقریباً پوری صدی بے نتیجہ ہنگاموں کی صدی معلوم ہوتی ہے۔ اِن سرگرمیوں کے دوران بڑی بڑی شخصیتیں تو بنیں، مگر مثبت تعمیر کے اعتبار سے، ملت کا کوئی بڑا مستقبل وجود میں نہ آسکا۔

ISLAMIC STUDIES
GOODWORD
www.goodwordbooks.com
ISBN 978-81-7898-736-1
9 788178 987361
₹80